

حدیث کے اصلاحی مضامین

جلد ہشتم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خاں پوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث و صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

تفصیلات

کتاب کا نام:..... حدیث کے اصلاحی مضامین (جلد ہشتم)

افادات:..... حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بہ اہتمام:..... خدّام حضرت اقدس دامت برکاتہم

صفحات:..... ۴۵۶

ناشر:..... ادارۃ الصدیق ڈابھیل، گجرات

99133,19190 / 99048,86188

ملنے کے پتے

99988,31838 شعبہ فیض محمود، سورت

88666,21229 مفتی سلیمان شاہوی (دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر)

97562,02118 کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

99246,93470 مکتبہ انور (مفتی عبدالقیوم راجکوٹی) جامعہ ڈابھیل

99246,93470 حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ (دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر)

مدینہ ایجنسی جھانپابازار سورت

قاضی، نزد مرکز مسجد رانی تالاب سورت

اسلامی کتب خانہ چوک بازار سورت


رلابیل شوپ رانی تالاب سورت

اجمالی فہرست مضامین جلد ہشتم

۳۹	القناعة والعفاف والاقتصاد في المعيشة قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا، معیشت میں میانہ روی	۱
۸۱	جواز الاخذ من غير مسألة ولا تطع اليه بغیر سوال اور اشرافِ نفس کے کوئی چیز ملے؛ اس کو لینا	۲
۸۹	الحث على الأكل من عمل يده والتعفف به عن السؤال والتعرض للأعطاء کمانے کے لیے محنت کرنے اور سوال و سوالی جیسی صورت بنانے سے بچنے کی ترغیب	۳
۹۵	الكرم والجود والانفاق في وجوه الخير ثقة بالله تعالى سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا	۴
۱۳۹	التَّهْمَى عَنِ الْبُخْلِ وَالشَّحِّ بخل اور لالچ ملے ہوئے بخل کی مذمت	۵
۱۴۵	بَابُ الْإِيثَارِ وَالْمَوْاسَاةِ ایثار اور غم خواری	۶
۱۵۷	التَّوَأْسُ فِي أُمُورِ الْآخِرَةِ وَالِاسْتِكْثَارُ حَتَّى تَبْتَزَّكَ بِهِ آخرت کے کاموں میں سبقت لیجانے اور برکت والی چیز کو زیادہ حاصل کرنے کا اہتمام کرنا	۷
۱۶۳	فَضْلُ الْغَيْبِيِّ الشَّاكِرِ شکر گزار مالدار کی فضیلت	۸
۱۸۱	بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ الْأَمَلِ موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان	۹
۲۱۵	بَابُ اسْتِحْبَابِ زِيَارَةِ الْقُبُورِ لِلرِّجَالِ وَمَا يَقُولُهُ الزَّائِرُ مردوں کے لیے قبرستان جانے کا مستحب ہونا، اور وہاں کے اعمال	۱۰

۲۳۳	كَرَاهَةُ تَمَيُّبِ الْمَوْتِ بِسَبَبِ ضَرْبِ نَزْلِ بِهِ وَلَا بَأْسَ بِهِ لِحُوفِ الْفِتْنَةِ فی الدِّین مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا	۱۱
۲۴۷	بَابُ الْوَرَعِ وَتَرْكِ الشُّبُهَاتِ احتیاط سے کام لینا اور مشتبہ سے بچنا	۱۲
۲۷۳	اسْتِحْبَابُ الْعَزَلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ أَوْ الْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّينِ وَوُقُوعِ فِي حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَنَحْوَهَا خلوت گزینی کا مستحب ہونا	۱۳
۲۸۳	بَابُ فَضْلِ الْإِخْتِلَاطِ بِالنَّاسِ لوگوں سے اختلاط کی شرائط	۱۴
۲۹۱	التَّوَاضُّعُ وَخَفْضُ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِينَ تواضع اختیار کرنا	۱۵
۳۳۱	تحريم الكبر والاعجاب تکبر اور خود پسندی	۱۶
۳۵۳	بَابُ حُسْنِ الْخُلُقِ اچھے اخلاق	۱۷
۳۷۵	بَابُ الْحِلْمِ وَالْإِنَاءَةِ وَالرَّفْقِ حلم، وقار، نرمی	۱۸
۴۲۱	بَابُ الْعَفْوِ وَالْإِعْرَاضِ عَنِ الْجَاهِلِينَ نادانوں کو معاف کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا	۱۹
۴۳۵	بَابُ إِحْتِمَالِ الْأَذَى پہنچائی جانے والی تکلیف کو برداشت کرنا	۲۰
۴۳۹	الغضب إذا انتهكت حرمت الشرع والانتصار لدين الله تعالى شعائر دین کی بے حرمتی کے وقت غصہ کرنا	۲۱

تفصیلی فہرست مضامین جلد ہشتم

صفحہ	عناوین	نمبر شمار
۲۹	اداریہ	

القناعة والعفاف والاقتصاد فی المعیشتہ [۱]
قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا، معیشت میں میانہ روی

۴۱	ترجمۃ الباب کا خلاصہ	۱
۴۲	نہ اسراف کی اجازت، اور نہ بخل کی	۲
۴۳	پھر آدمی بے صبری سے کیوں کام لے؟	۳
۴۴	سوال کرنے کا ایک قدرتی اثر	۴
۴۵	مقصد زندگی	۵
۴۵	حقیقی مالداری؛ دل کی صفت	۶
۴۶	وہ آدمی کامیاب ہو گیا	۷
۴۶	بغیر سوال ملنے پر برکت کا وعدہ	۸
۴۹	عہد نبھانے کا سبق آموز نمونہ	۹
۵۰	چیتھڑوں والا غزوہ	۱۰
۵۲	صفت استغناء پر سند نبوی	۱۱

القناعة والعفاف والاقتصاد فی المعیشتہ [۲]
قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا اور معیشت میں میانہ روی

۵۷	جو آدمی سوال سے بچنا چاہتا ہے.....	۱۲
----	------------------------------------	----

۵۸	بے نیازی سے دینے کے دو مطلب	۱۳
۵۹	اوصافِ کمال حاصل کرنے کا طریقہ	۱۴
۶۱	سوال کرنے والوں کے لیے خاص ہدایت	۱۵
۶۲	سوال نہ کرنے پر نبی کریم ﷺ کی بیعت	۱۶
۶۴	مانگنے کی عادت پر سزا	۱۷
۶۴	اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ	۱۸
۶۵	وہ کیا جمع کر رہا ہے؟	۱۹
۶۵	نصاب کی تین قسمیں	۲۰
۶۶	دوسرا نصاب	۲۱
۶۶	لا یعنی کی ایک اور قسم	۲۲
۶۷	ضرورت کی چیز کیا ہے؟	۲۳
۶۸	چوتھا بستر شیطان کا	۲۴
۶۸	جس کے یہاں ٹی وی ہو: اس کو زکوٰۃ دینا	۲۵
۶۹	جس پر صدقہ فطر واجب: اس پر قربانی واجب	۲۶
۶۹	تیسرا نصاب	۲۷
۷۰	یہ پیسے نہیں، انگارے ہیں	۲۸
۷۰	سوال کرنا چہرہ پر خراش ہے	۲۹
۷۱	کن صورتوں میں سوال کی اجازت ہے؟	۳۰
۷۲	فاقہ کہاں پیش کرنا چاہیے؟	۳۱
۷۲	نہ مانگنے پر جنت کی ضمانت	۳۲

۷۳	سوال کرنا تین آدمیوں کے لیے جائز ہے	۳۳
۷۶	حقیقی مسکین کی پہچان	۳۴
۷۷	خرچ کرنے والوں کا فریضہ	۳۵
۷۸	ادھر بھی توجہ دیں	۳۶
۷۸	دعاء	۳۷

جواز الاخذ من غیر مسألة ولا تطع الیہ
بغیر سوال اور اشراف نفس کے کوئی چیز ملے؛ اس کو لینا

۸۳	باب کا عنوان	۳۸
۸۳	بغیر اشراف و سوال کے کچھ ملے تو؟	۳۹
۸۵	یہ اشراف نہیں ہے	۴۰
۸۶	ایک اہم سبق	۴۱
۸۶	سلیقہ مندر شاگرد کی ذکاوت..... واقعہ	۴۲

الحث علی الأکل من عمل یدہ والتعفف بہ عن السؤال والتعرض للأعطاء
کمانے کے لیے محنت کرنے اور سوال و سوالی جیسی صورت بنانے سے بچنے کی ترغیب

۹۱	روزی تلاش کرنے کی ترغیب	۴۲
۹۱	خود کام کرنا بہتر ہے	۴۳
۹۳	نبی اور بادشاہ بھی ہاتھ سے کماتے تھے	۴۴
۹۳	حضرت زکریا علیہ السلام کا پیشہ	۴۵

۹۴	ہاتھ کی کمائی	۴۶
----	---------------	----

الکرم والجود او الانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ [۱]
سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

۹۷	ترجمۃ الباب کا خلاصہ	۴۷
۹۸	حسد جائز نہیں ہے مگر.....	۴۸
۹۹	مؤمن کا حقیقی مال تو یہی ہے؟	۴۹
۱۰۱	اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی؟	۵۰
۱۰۱	ایک غلط سوچ اور اس کی اصلاح	۵۱
۱۰۲	کھجور کے ایک ٹکڑے کی تاثیر	۵۲
۱۰۳	آپ ﷺ نے کبھی ”نا“ نہیں کہا	۵۳
۱۰۳	حضور اکرم ﷺ کا چہرہ کھل گیا	۵۴
۱۰۴	باوجود سخت ضرورت کے چادر دے دی	۵۵
۱۰۵	سخاوت کی برکت اور بخل کی نحوست	۵۶
۱۰۶	پہلے خالی کرو، تو بھری جائے گی	۵۷

الکرم والجود او الانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ [۲]
سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

۱۰۹	اسلام کے اعمال میں بہترین عمل	۵۸
۱۰۹	یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے	۵۹
۱۱۰	مال خرچ کرنے کی تعلیم اور ترتیب	۶۰

۱۱۲	سخاوت سے اسلام محبوب بن جاتا	۶۱
۱۱۳	غیر حقدار کو دینے کی وجہ	۶۲
۱۱۴	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا نمونہ	۶۳
۱۱۵	غزوہ حنین	۶۴
۱۱۶	صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا	۶۵
۱۲۰	جو خرچ کیا وہ سب باقی ہے	۶۶
۱۲۰	تم روک کر مت رکھو؛ ورنہ.....	۶۷
۱۲۱	سخی اور بخیل؛ ایک مثال	۶۸

الکرم والجود او الانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ [۳]
سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

۱۲۵ تو بخل کیوں؟	۶۹
۱۲۵	بغیر خرچ کئے سخاوت کا ثواب	۷۰
۱۲۶	دعا میں بھی سخاوت سے کام لو	۷۱
۱۲۷	پچھتر ہزار مکاتب	۷۲
۱۲۷	غور و فکر کی بات	۷۳
۱۲۹	دل کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے	۷۴
۱۲۹	یہ شانِ کریمی کے خلاف ہے	۷۵
۱۳۰	حلال خرچ کرنے کی برکت	۷۶
۱۳۱	حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کا مقولہ	۷۷
۱۳۲	جب کھجور کا ایک دانہ پہاڑ بن جاتا ہے!	۷۸

۱۳۲	ایک تہائی خرچ کرنے کی برکت	۷۹
۱۳۴	ہمارے اسلاف کا عمل	۸۰
۱۳۵	نفس کا مکراور اس کی پکڑ	۸۱
۱۳۶	نیت کا اثر.....سبق آموز قصہ	۸۲

الَّتَمَّهِ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ بخل اور لالچ ملے ہوئے بخل کی مذمت

۱۴۱	بخل و شح کا معنی	۸۳
۱۴۱	جہنم کا راستہ	۸۴
۱۴۲	نعمتیں صحیح جگہ استعمال نہ کرنے کی نحوست	۸۵
۱۴۳	ظلم و شح سے بچو	۸۶

بَابُ الْاِيْثَارِ وَالْمَوْاسَاةِ ایثار اور غم خواری

۱۴۷	ایثار اور مواسات کا مطلب	۸۷
۱۴۸	ایثار کرنے پر اللہ تعالیٰ خوش ہو گئے	۸۸
۱۵۰	دو کا کھانا تین کو کافی ہے	۸۹
۱۵۱	ضرورت سے زائد کو خرچ کر دو	۹۰
۱۵۳	ایثار کا عملی سبق	۹۱
۱۵۵	ایثار کرنے والوں سے حضور ﷺ کا اظہارِ تعلق	۹۲

التَّنَافُسُ فِي أُمُورِ الْآخِرَةِ وَالْإِسْتِكْثَارِ هِيَ أَيُّ تَبَرُّكٍ بِهِ
 آخرت کے کاموں میں سبقت لے جانے اور برکت والی چیز کو زیادہ حاصل
 کرنے کا اہتمام کرنا

۱۵۹	باب کا عنوان	۹۳
۱۵۹	برکت حاصل کرنے کا اہتمام	۹۴
۱۶۱	برکت سے کوئی مستغنی نہیں	۹۵

فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ
 شکر گزار مالدار کی فضیلت

۱۶۵	شکر گزار مالدار	۹۶
۱۶۵	شکر کی حقیقت	۹۷
۱۶۶	شکر کا پہلا درجہ	۹۸
۱۶۷	نیکی یا گناہ کے مراحل پر بھی اجرو زجر	۹۹
۱۶۹	یہ طرز عمل؛ شرافت کا جنازہ	۱۰۰
۱۷۰	شکر کا دوسرا درجہ	۱۰۱
۱۷۲	خلاصہ کلام	۱۰۲
۱۷۳	خرچ کرنے میں یہ بھی بہتر اور وہ بھی!	۱۰۳
۱۷۴	نیکی کا اعلیٰ درجہ	۱۰۴
۱۷۵	دو قابل رشک شخصیتیں	۱۰۵
۱۷۶	پہلی شخصیت	۱۰۶
۱۷۶	دوسری شخصیت	۱۰۷

۱۰۸	ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا	۱۷۷
۱۰۹	دو باتیں	۱۷۸
۱۱۰	حفظ قرآن کا حق	۱۷۸
۱۱۱	فقراء مہاجرین کی کڑھن	۱۷۹

بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ الْأَمَلِ [۱]

موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

۱۱۲	گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ	۱۸۴
۱۱۳	ناقابل انکار حقیقت	۱۸۴
۱۱۴	مختصر سفر کی تیاری اور لمبے سفر سے غفلت!	۱۸۵
۱۱۵	آپ سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں	۱۸۶
۱۱۶	سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں	۱۸۷
۱۱۷	حقیقی کامیابی	۱۸۸
۱۱۸	اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں	۱۸۹
۱۱۹	نہ جلدی، نہ دیر	۱۹۰
۱۲۰	وہی گھائے میں ہیں	۱۹۰
۱۲۱	وہی پرانی روش	۱۹۱
۱۲۲	حساب کتاب کا منظر	۱۹۲
۱۲۳	کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا؟	۱۹۴
۱۲۴	بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں	۱۹۵

۱۹۶	وقت آنے سے پہلے تیاری کر لو	۱۲۵
۱۹۷	وصیت لکھنے کا حکم اور طریقہ	۱۲۶
۱۹۹	زندگی، موت اور امیدیں	۱۲۷

بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ الْأَمَلِ [۲]

موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

۲۰۳	سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو	۱۲۸
۲۰۳	امروز و فردا	۱۲۹
۲۰۴	نیکی کے داعیہ کی قدر کرو	۱۳۰
۲۰۵	بھلا دینے والا فقر	۱۳۱
۲۰۶	سرکش بنانے والی مالداری	۱۳۲
۲۰۶	مہلک بیماری	۱۳۳
۲۰۷	سٹھیا دینے والا بڑھاپا	۱۳۴
۲۰۷	اچانک کی موت	۱۳۵
۲۰۸	تم نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے	۱۳۶
۲۰۹	دجال	۱۳۷
۲۱۰	قیامت	۱۳۸
۲۱۰	ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے	۱۳۹
۲۱۲	موت کا مراقبہ	۱۴۰
۲۱۲	درویش شریف کا فائدہ	۱۴۱

بَابِ اسْتِحْبَابِ زِيَارَةِ الْقُبُورِ لِلرِّجَالِ وَمَا يَقُولُهُ الزَّائِرُ

مردوں کے لیے قبرستان جانے کا مستحب ہونا، اور وہاں کے اعمال

۲۱۷	قبرستان جانا اور اس کے فائدے	۱۴۲
۲۱۸	کیا عورتیں قبرستان جاسکتی ہیں؟	۱۴۳
۲۱۹	قبرستان جانے کی دعا اور آداب	۱۴۴
۲۲۰	قبرستان کس دن جائے؟ مقاصد زیارت	۱۴۵
۲۲۱	زیارت قبور کی تعلیم	۱۴۶
۲۲۲	زیارت کی دعائیں ان شاء اللہ کیوں؟	۱۴۷
۲۲۲	حسنِ خاتمہ اور سوءِ خاتمہ کے اسباب	۱۴۸
۲۲۳	قبرستان میں داخلہ کے وقت سلام	۱۴۹
۲۲۳	ایصالِ ثواب کا طریقہ	۱۵۰
۲۲۴	ثواب پورا پہنچتا ہے یا تقسیم ہو کر؟	۱۵۱
۲۲۵	زندوں کو بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟	۱۵۲
۲۲۶	قبر کے پاس کس طرح کھڑا رہے؟	۱۵۳
۲۲۷	ثواب پہنچنے کے بارے میں مذاہبِ ائمہ	۱۵۴
۲۲۷	دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب؟	۱۵۵
۲۲۸	دعائے مغفرت زیادہ مفید ہے	۱۵۶
۲۲۹	ایک مراقبہ	۱۵۷
۲۳۰	غفلت کا انتہائی درجہ، اس کا علاج	۱۵۸

۲۳۱	حاصلِ کلام	۱۵۹
-----	------------	-----

كَرَاهَةً تَمَيُّي الْمَوْتِ بِسَبَبِ ضُرِّ نَزَلَ بِهِ وَلَا بَأْسَ بِهِ لِيُخَوِّفَ الْفِئْتَةَ

فِي الدِّينِ

مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا

۲۳۵	مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا	۱۶۰
۲۳۵	اگر موت مانگنی ہی ہے تو؟	۱۶۱
۲۳۶	دینی آزمائش کی وجہ سے موت مانگنا	۱۶۲
۲۳۷	موت کی تمنا کرنے کی کوئی وجہ نہیں	۱۶۳
۲۳۸	موت کی قطعی دعا نہ کرے	۱۶۴
۲۳۹	مانگی تھی تلے کو بل گئی اوپر کو	۱۶۵
۲۴۰	عورتوں کی عادت	۱۶۶
۲۴۰	بددعا کا خاصہ	۱۶۷
۲۴۱	حضرت فقیہ الامت کی ایک مثال	۱۶۸
۲۴۲	احتیاط والی بات	۱۶۹
۲۴۲	اگر منع نہ ہوتا تو میں موت کی دعا کرتا	۱۷۰
۲۴۴	تعمیر میں خرچ ناپسندیدہ ہے	۱۷۱

بَابُ الْوَرَعِ وَتَرْكِ الشُّبُهَاتِ

احتیاط سے کام لینا اور مشتبہ سے بچنا

۲۴۹	ورع کا مطلب	۱۷۲
-----	-------------	-----

۲۵۰	شبہ والی چیز کو چھوڑنا	۱۷۳
۲۵۰	تم اس کو معمولی سمجھتے ہو	۱۷۴
۲۵۱	یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟	۱۷۵
۲۵۲	کہیں رفتار کو قابو میں لانا پڑتا ہے	۱۷۶
۲۵۳	مشتبہ سے بچا تو دین و عزت محفوظ	۱۷۷
۲۵۵	شاہی چراگاہ	۱۷۸
۲۵۶	اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آ گیا تو.....	۱۷۹
۲۵۷	نیت پر بنیاد کیوں؟	۱۸۰
۲۵۷	اس بات کا ڈر رہے گا	۱۸۱
۲۵۷	ایک نمونہ	۱۸۲
۲۵۸	امام صاحب کا ورع	۱۸۳
۲۵۹	ایک اور واقعہ	۱۸۴
۲۵۹	ناظم مطبخ کا ورع	۱۸۵
۲۶۰	مہتمم صاحب کا ورع	۱۸۶
۲۶۰	مُحَشِّیٰ بخاری کا ورع	۱۸۷
۲۶۰	طالب علمی کے زمانہ میں احتیاط	۱۸۸
۲۶۱ پھر ایک خط نہ لیتے	۱۸۹
۲۶۱	پرہیزگاری برتناہر ایک کا کام نہیں	۱۹۰
۲۶۳	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ورع	۱۹۱

۲۶۳	جس چیز پر دل کھٹکے.....	۱۹۲
۲۶۴	وہی ”دل“ کہلانے کے لائق ہے	۱۹۳
۲۶۵	احتیاطاً بیوی کو الگ کر دیا	۱۹۴
۲۶۶	ایک مسئلہ	۱۹۵
۲۶۷	شک والی چیز کو چھوڑ کر.....	۱۹۶
۲۶۷	حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قصہ	۱۹۷
۲۶۹ تو بھی نکال کر رہتا	۱۹۸
۲۶۹	بیٹے کو دوسروں سے کم دیا	۱۹۹
۲۷۰	نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے	۲۰۰
۲۷۱	کوئی متقیوں کی درجہ تک نہیں پہنچ سکتا.....	۲۰۱
۲۷۲	لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں	۲۰۲

اسْتَحْبَابِ الْعَزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ أَوِ الْخَوْفِ مِنْ
فِتْنَةٍ فِي الدِّينِ وَوُقُوعِ فِي حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَنَحْوَهَا
خلوت گزینی کا مستحب ہونا

۲۷۵	زندگی گزارنے کے دو طریقے	۲۰۳
۲۷۵	اسلام میں رہبانیت نہیں	۲۰۴
۲۷۶	فتنہ کی حالت	۲۰۵
۲۷۷	گوشہ نشینی مستحب ہونے کی تین شکلیں	۲۰۶

۲۰۷	اللہ کی طرف دوڑ لگاؤ	۲۷۸
۲۰۸	حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی گوشہ نشینی	۲۷۸
۲۰۹	اصحابِ کہف کا قصہ	۲۷۹
۲۱۰	سب سے بہتر کون؟	۲۸۰
۲۱۱	وہ زمانہ قریب ہے	۲۸۱
۲۱۲	ہرنبی نے بکریاں چرائی ہیں	۲۸۱
۲۱۳	بہترین زندگی	۲۸۲

بَابُ فَضْلِ الْإِحْتِلَاطِ بِالنَّاسِ

لوگوں سے اختلاط کی شرائط

۲۱۴	کیا وہ زمانہ آگیا؟	۲۸۶
۲۱۵	ماتحتوں کو نہ بخشے	۲۸۷
۲۱۶	احقاقِ حق یا تذلیل؟	۲۸۸
۲۱۷	عذابِ الہی کو دعوت نہ دیں	۲۸۹
۲۱۸	یہ آیت شبہ میں نہ ڈالے	۲۸۹

التَّوَاضُّعُ وَخَفْضُ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِينَ [۱]

تواضع اختیار کرنا

۲۱۹	ساری خوبیوں کی جڑ	۲۹۳
۲۲۰	حضرت آدم کا امتیازی وصف	۲۹۴
۲۲۱	ایک ”ع“ کی کمی	۲۹۵

۲۹۷	محبت جب پیوست ہو جاتی ہے	۲۲۲
۲۹۷	اُمُّ الامراض	۲۲۳
۲۹۸	تواضع کی حقیقت	۲۲۴
۲۹۹	نمائشی تواضع	۲۲۵
۲۹۹	حقیقی تواضع کی ایک علامت	۲۲۶
۳۰۰	حضورِ پاک ﷺ کی تواضع	۲۲۷
۳۰۰	مجبوری کی وجہ سے مسند بنوائی گئی	۲۲۸
۳۰۱	نعمتوں کو عطیہ خداوندی سمجھو	۲۲۹
۳۰۲	خليفة وقت کا سترہ پیوندی کرتہ	۲۳۰
۳۰۳	حضرت تھانویؒ کی تواضع	۲۳۱
۳۰۳	حضرت تھانویؒ کی مجلس کی کیفیت	۲۳۲
۳۰۴	متکبر کی نقد سزا	۲۳۳
۳۰۴	نقشوں کو تم نہ جانچو	۲۳۴
۳۰۵	حضرت گنگوہیؒ کی تواضع	۲۳۵
۳۰۵	دارالعلوم کے صدر مدرس کی تواضع	۲۳۶
۳۰۶	دَم نکلنے کے بعد ذائقہ آتا ہے	۲۳۷
۳۰۷	اللہ تعالیٰ کو تواضع ہی پسند ہے	۲۳۸
۳۰۷ ذرا بند قباد کیجھو	۲۳۹
۳۰۸	کوئی کسی پر فخر نہ کرے	۲۴۰

التَّوَّاضِعُ وَخَفِضَ الْجَنَاحَ لِلْمُؤْمِنِينَ [۲]

تواضع اختیار کرنا

۳۱۳	صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا	۲۴۱
۳۱۴	معافی عزت بڑھاتی ہے	۲۴۲
۳۱۴	الیوم یوم المرحمۃ	۲۴۳
۳۱۵	تواضع کی زبردست خاصیت	۲۴۴
۳۱۶	جب عظمت الہی جاگزیں ہوتی ہے	۲۴۵
۳۱۶	کتے اور سور سے بھی گیا گزرا	۲۴۶
۳۱۷	تواضع کا اعلیٰ نمونہ	۲۴۷
۳۱۸	ایک اور نمونہ	۲۴۸
۳۱۹	گھر کے نبوی اعمال	۲۴۹
۳۲۰	جس وقت، جو فرض	۲۵۰
۳۲۰	پر دیسی کے ساتھ متواضعانہ سلوک	۲۵۱
۳۲۱	انگلیاں چاٹنا؛ تواضع کی علامت	۲۵۲
۳۲۲	شیطان کو آرام نہ پہنچاؤ	۲۵۳
۳۲۳	شیطان لُچا ہے	۲۵۴
۳۲۴	ایک جزو بھی ضائع نہ جائے	۲۵۵
۳۲۴	قدرِ نعمت	۲۵۶
۳۲۵ تب قدر ہوتی ہے	۲۵۷

۳۲۶	وہ ادا بہت پسند آئی	۲۵۸
۳۲۷	حضرات انبیاء کی تربیت	۲۵۹
۳۲۸	ایک بات یاد رہے	۲۶۰
۳۲۸ تو بھی قبول کر لوں گا	۲۶۱
۳۲۹	کوئی چیز جب سر اٹھاتی ہے	۲۶۲

تَحْرِيمُ الْكِبْرِ وَالْاِعْجَابِ کبر و خود پسندی کی حرمت

۳۳۳	تکبر اور خود پسندی	۲۶۳
۳۳۳ جو بڑا بننا نہیں چاہتے	۲۶۴
۳۳۴	زمین میں اکڑ کر مت چلو	۲۶۵
۳۳۴	اترانے کا عبرتناک انجام	۲۶۶
۳۳۵	ذره برابر تکبر کی سزا	۲۶۷
۳۳۶	ٹھیک ٹھاک اور ٹیپ ٹاپ	۲۶۸
۳۳۷	یہ تکبر نہیں	۲۶۹
۳۳۸	یہ کبر ہے	۲۷۰
۳۳۸	خبثِ باطن	۲۷۱
۳۳۹	کوئی برا نہیں.....	۲۷۲
۳۴۰	عطاء اور بقاء کا مراقبہ	۲۷۳
۳۴۱	اتنی نہ بڑھا.....	۲۷۴

۳۴۲	کبر سے ارتداد تک	۲۷۵
۳۴۳	دوسرا واقعہ	۲۷۶
۳۴۵	دینی کام کرنے والوں سے	۲۷۷
۳۴۶ پھر کبھی ہاتھ نہ اٹھاسکا	۲۷۸
۳۴۷	پھر جنت کے قابل بنے گا	۲۷۹
۳۴۷	جنت و دوزخ کا مناظرہ	۲۸۰
۳۴۸	جو چھوٹوں کو بڑا بنا دے	۲۸۱
۳۴۹	جنت اور جہنم کا بھراوا	۲۸۲
۳۴۹	نظرِ رحمت سے محروم	۲۸۳
۳۵۰	تین مبغوض ترین	۲۸۴
۳۵۰	متکبر کو شدید دھمکی	۲۸۵
۳۵۱	خود پسندی کی نقد سزا	۲۸۶
۳۵۱ متکبر لکھ دیا جاتا ہے	۲۸۷

بابِ حُسْنِ الْخُلُقِ

اچھے اخلاق

۳۵۵	صرف یہ اخلاق نہیں	۲۸۸
۳۵۶	جسم کی قدر روح سے ہے	۲۸۹
۳۵۷	روح سے متعلق بھی احکام	۲۹۰
۳۵۷	جسمانی اعمال میں فرائض	۲۹۱

۳۵۸	روحانی اعمال میں فرائض و محرمات	۲۹۲
۳۵۹	لینے کے دینے	۲۹۳
۳۶۰	حاصل کلام	۲۹۴
۳۶۱	خُلُقِ عَظِيم	۲۹۵
۳۶۱	غصہ پینا، معاف کرنا	۲۹۶
۳۶۱	ازالہ نہیں، امالہ	۲۹۷
۳۶۳	نفس پر قابو پانے کا واقعہ	۲۹۸
۳۶۳	اچھے اخلاق کی تکمیل	۲۹۹
۳۶۴	حضور اکرم ﷺ کے اوصاف و اخلاق	۳۰۰
۳۶۵	مجسم خوشبو	۳۰۱
۳۶۵	خادم خاص کا تجربہ	۳۰۲
۳۶۷	اخلاق کی بلندی	۳۰۳
۳۶۸	نیکی اور گناہ کیا ہے؟	۳۰۴
۳۶۹	بہترین لوگ	۳۰۵
۳۶۹	اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں	۳۰۶
۳۷۰	دو جنتی عمل	۳۰۷
۳۷۱	کامل ایمان والے	۳۰۸
۳۷۲	اچھے اخلاق والوں کا مقام	۳۰۹
۳۷۲	تین آدمی، تین گارٹی	۳۱۰

۳۷۳	حضور ﷺ کی نگاہوں میں محبوب اور قریب جگہ پانے والے	۳۱۱
-----	---	-----

باب الحلم والائتاء والرفق [۱]

حلم، وقار اور نرمی

۳۷۷	حلم، وقار، نرمی	۳۱۲
۳۷۷	سب سے عمدہ گھونٹ	۳۱۳
۳۷۸	جا! تجھے آزاد کیا	۳۱۴
۳۷۹	کوئی بااعتدال، کوئی بدحال	۳۱۵
۳۸۱	سفارش بھی، تنبیہ بھی	۳۱۶
۳۸۲	اب معاملہ صاف کر لیجئے	۳۱۷
۳۸۳	ہمارا مزاج؟ خدا کی پناہ!	۳۱۸
۳۸۴ اور کوڑا رکھ دیا	۳۱۹
۳۸۶	اگر یہ طریقہ اپنائیں.....	۳۲۰
۳۸۷	لیک بعد از خرابی بسیار	۳۲۱
۳۸۷	وہ سکتے میں آ گیا	۳۲۲
۳۸۸	ہمت کا کام	۳۲۳
۳۸۹	دو پسندیدہ خوبیاں	۳۲۴
۳۹۰	غصہ مت کرو	۳۲۵
۳۹۱	قصور گاہک کا، سزا بیوی کو!	۳۲۶
۳۹۱	جب وہ غصہ میں ہوتا ہے	۳۲۷

۳۹۲	مناظرہ میں کامیابی کا گر	۳۲۸
۳۹۲	خوبیاں وہی یا کسی؟	۳۲۹
۳۹۲	دونوں راہیں بتلا دیں	۳۳۰

بَابُ الْحِلْمِ وَالْإِنَاءِ قَوْلَ الرَّفِيقِ [۲]

حلم، وقار اور نرمی

۳۹۷	نرمی کا جادو	۳۳۱
۳۹۷	اگر طویل المیعاد فائدہ حاصل کرنا ہے!	۳۳۲
۳۹۸	اس کام میں رونق آجاتی ہے	۳۳۳
۳۹۹	تم آسانی کرنے والا بنا کر بھیجے گئے ہو	۳۳۴
۴۰۰	الْقَائِلُ وَالسَّائِلُ وَالْبَائِلُ	۳۳۵
۴۰۱	روایت کا سبق	۳۳۶
۴۰۲	آسانی کو ترجیح دیجئے	۳۳۷
۴۰۳	متنفر مت کرو	۳۳۸
۴۰۴	جامع ترین نبوی اصول	۳۳۹
۴۰۵	جو نرمی سے محروم کر دیا گیا.....	۳۴۰
۴۰۵	نبی کریم ﷺ کی مختصر ترین نصیحت	۳۴۱
۴۰۶	ایک زریں نصیحت	۳۴۲
۴۰۷	یہ بھی حکمت ہے	۳۴۳
۴۰۸	تقریر رسول حجت ہے	۳۴۴

۴۰۹	گناہ کے دو محرکات	۳۴۵
۴۰۹	شہوت و غصہ میں ایک فرق	۳۴۶
۴۱۰	غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر	۳۴۷
۴۱۱	غصہ کے شاخصانے	۳۴۸
۴۱۳	بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے	۳۴۹
۴۱۴	ہر کام اچھائی کے ساتھ انجام دینا چاہیے	۳۵۰
۴۱۵	بندہ بن کر رہے	۳۵۱
۴۱۶	ہمارا مزاج برعکس ہو گیا	۳۵۲
۴۱۷	جب مذہب پر حملہ ہو	۳۵۳
۴۱۸	جنتیوں کی چند صفات	۳۵۴

باب العفو و الاعراض عن الجاہلین

نادانوں کو معاف کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا

۴۲۳	چشم پوشی سے کام لینا	۳۵۵
۴۲۴	حضور اکرم ﷺ کا عفو	۳۵۶
۴۲۷	حضور اکرم ﷺ نے کسی کو نہیں مارا	۳۵۷
۴۲۸	یہی مساوات ہے	۳۵۸
۴۲۹	قیامت تک کے لیے یہی اصول ہے	۳۵۹
۴۳۰	ایک دیہاتی کا طرز اور آپ ﷺ کا عمل	۳۶۰

۴۳۱	بردباری کا عجیب امتحان	۳۶۱
۴۳۳	تکلیف دینے پر دعائے کا ایک نمونہ	۳۶۲
۴۳۴	حقیقی پہلوان	۳۶۳

باب احتمال الأذى

پہنچائی جانے والی تکلیف کو برداشت کرنا

۴۳۷	گرم راکھ ڈال رہا ہے	۳۶۴
۴۳۸	فرشتہ گیا، شیطان آیا	۳۶۵
۴۳۸	بہادری یا بزدلی	۳۶۶

الغضب إذا انتهكت حرمت الشرع والانتصار لدين الله تعالى
شعائر دین کی بے حرمتی کے وقت غصہ کرنا اور اللہ کے دین کے لیے بدلہ لینا

۴۴۱	غصہ کب کر سکتے ہیں؟	۳۶۷
۴۴۲	شعائر اللہ کی عظمت رضاء الہی کا ذریعہ	۳۶۸
۴۴۲	لوگوں کو دین سے متنفر نہ کرے	۳۶۹
۴۴۳	نماز کی مسنون قراءت	۳۷۰
۴۴۴	احادیث کا غلط استعمال نہ کریں	۳۷۱
۴۴۵	جب مستحب چیز بدعت بنتی ہے	۳۷۲
۴۴۵	عملی بے اعتدالی بھی صحیح نہیں	۳۷۳
۴۴۷	قانون کو ہاتھ میں نہ لیں	۳۷۴

۴۴۷	اجتماعی کاموں کا ایک سنہرا اصول	۳۷۵
۴۴۹	حضور اکرم ﷺ کا غصہ	۳۷۶
۴۵۰	حدود اللہ میں رواداری نہیں	۳۷۷
۴۵۲	تو نے خرید کر مجھے انمول کر دیا	۳۷۸
۴۵۴	قبلہ کی طرف تھوکنے پر حضور ﷺ کی ناراضگی	۳۷۹

اداریہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایک بات جو پہلے بار بار لکھی جا چکی ہے، اس مجلد کے ابتدائی مضامین اس کا عمدہ نمونہ ہیں، وہ یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے، کسی فرد، قوم، قبیلہ یا ملک کی جاگیر نہیں ہے، تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس کی تعلیمات میں جو ہمہ گیری اور حبا معیت ہے، آج دنیا کا کوئی مذہب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

محترم قارئین! تنقید اور پروپیگنڈہ سب سے آسان کام ہے۔ آج اسلام پر کچھ اُچھالنے کے لیے میڈیا کا جس بے دردی سے اسراف کیا جا رہا ہے، یہ حقانیتِ اسلام کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمِّمٌ نُّوْرِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (الصّف: ۸) یہ لوگ اپنی پھونک سے نورِ الہی بجھانا چاہتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ٹھان رکھی ہے کہ اپنے نور کو تام کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو پسند نہ آئے: ۷

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت یہ خندہ زن	✽	پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
------------------------------------	---	--------------------------------------

مسلمانو! میڈیا کی ان شرارتوں اور ہتھکنڈوں سے کبھی بد دل نہ ہونا، نہ

احساسِ کمتری (Inferiority Complex) کا شکار بننا۔

اس مجموعہ کے ابتدائی مضامین مالیات سے متعلق ہیں۔ جب ہم دنیا میں اُن قوموں کو دیکھتے ہیں جو مالیات کے سلسلے کی اسلامی تعلیمات سے نا آشنا ہیں، انھیں کچھ پتہ نہیں مال کیسے کمایا جائے؟ کیوں کر خرچ کیا جائے؟ تب ہمیں اپنے مذہب کی قدر ہوتی ہے۔ اپنے مذہب کو جانو، پہچانو! اس کی گہرائی میں جاؤ؛ تاکہ پتہ چلے کہ اس دین میں مخلوق کے لیے کیا خیرات و برکات و دیعت ہیں۔

کیا آج اسلام کے علاوہ کوئی مذہب یہ بتانے کی پوزیشن میں ہے کہ مال کی کیا حقیقت ہے؟ اس کو حاصل کیسے کیا جائے؟ اس کو خرچ کیسے کیا جائے؟ بچت کی جائے یا نہیں؟ بچت کتنی کی جائے؟ خود پر کتنا خرچ ہو؟ اوروں پر کتنا خرچ ہو؟ خرچ کرنے میں (Priority) کس کو دی جائے؟ ثانوی درجہ کس کو دیا جائے؟ خدا کے لیے حسرت خرچ کرنے پر دارین میں کیا فوائد حاصل ہوں گے؟ خدا کے یہاں سخی کا کیا مقام ہے؟ خدا کے دربار میں بنجیل کی کیا حیثیت ہے؟ فضول خرچی کیا ہے؟ فضول خرچی کیا نہیں ہے؟ سخاوت و اسراف میں کیا فرق ہے؟ اگر آپ کے پاس ان سوالات کے جوابات نہیں، ولن تفعلوا؛ تو پھر آپ کو مذہب اسلام پر تنقید کا حق بھی نہیں۔

آج انسانوں کی اکثریت مال و منال بڑھانے کے چکر میں نہ معلوم کن سنگلاخ وادیوں میں ماری ماری پھر رہی ہے، رات دن ایک کر رکھا ہے، بے حسین و پریشان ہے، کانفرنسیں، نمائشیں (Exhibitions)، اسکیمیں اور نہ معلوم کیا کیا کر رہی ہیں؛ لیکن سب لا حاصل، مندی عالمی شکل اختیار کر چکی ہے، مہنگائی ہے کہ گھٹنے کا نام نہیں لیتی، شریعت اسلام نے ایک چھوٹا سا لفظ پانچ حروف کا انسانوں کو دیا ”ق، ن، ا، ع، ت“، قناعت؛ جو تمام جھمیلوں سے انسان کی چھٹی کر دیتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ، تم کو جتنا مل جائے اُس پر مطمئن بیٹھے رہو، کم ہو تو بھی، زیادہ ہو تب بھی، بہ سہولت بڑھے تو الحمد للہ، نہیں تو سبحان اللہ۔

اس جلد میں جو مواد چنا گیا ہے یقیناً نایاب و بے نظیر ہے، اس کا اندازہ تو پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔ حق یہ ہے کہ ایسی (Guidelines) کوئی ایک انسان تو کیا؛ سارے ممالک مل کر عظیم ترین کانفرنس کا انعقاد کر کے بھی مدون نہیں کر سکتے ﴿فتبارك الله أحسن الخالقين﴾ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ، ہم مال سے

کیا کما سکتے ہیں، اور کیا گنوا سکتے ہیں؟۔

پھر اللہ رب العزت نے ہمارے استاذ و مرشد، مربی و محسن، مشفق و محبوب حضرت اقدس دام مجد ہم کو اندازِ بیان کے جن لطائف سے نوازا ہے، اُس نے سامعین و قارئین کے لیے ان نورانی ہدایات و تعلیمات کا سمجھنا اور سیکھنا انتہائی آسان کر دیا ہے۔ اللہ جل جلالہ کی جانب سے یہ ملکہ حضرت اقدس کو عنایت فرمایا گیا ہے کہ، مضمون درس کو آسان ’Live‘ بنا کر پیش فرماتے ہیں، جس کی وجہ سے سامعین، پھر قارئین کے لیے اکتاہٹ اور الجھن کے بغیر مضمون ارشادِ نبوی کی گہرائی تک پہنچنا سہل ہو جاتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے علمائے حق کی طرف سے ’اصلاحی مضامین‘ کو سُنْدِ پسندیدگی و قبولیت الحمد للہ پیش کی جا چکی ہے، اس سے مراد وہ حضرات ہیں جو وقتاً فوقتاً حضرت اقدس زیدت معالیہم سے ملاقات کے موقعوں پر اظہارِ پسندیدگی فرما چکے ہیں۔

بہت سی مساجد و مجالس میں اس کتاب کا باقاعدہ اجتماعی مطالعہ ہو رہا ہے، کہیں ماہ مبارک: رمضان میں وعظ و ارشاد کے لیے اسی گلدستہ سے عطر بیزی کی جاتی ہے، تو بہت سے خطباء و واعظین کے لیے یہ مجموعہ تقریر کے لیے تیار مواد (Ready Made Material) فراہم کر رہا ہے، جیسا کہ متعدد احباب کے بتانے سے معلوم ہوا۔

حضرت اقدس کی مجالس کی ایک اور خوبی یہ رہی ہے (واللہ زادہ فیہ) کہ بغیر شدید ترین ضرورت کے موضوع سے نہیں ہٹتے، ہاں! جب کوئی اہم بات چھڑ جاتی ہے تو پھر اُسے پوری کیے بغیر چھوڑتے بھی نہیں۔

ایسا عموماً تب ہوتا ہے جب بات معاشرہ میں تعلیمات اسلامی کے متعلق پھیلی

ہوئی غلط فہمیوں کی شکل آتی ہے، جیسا کہ اس جلد میں بھی آپ مطالعہ فرمائیں گے۔ یا کسی ایسے منکر کا تذکرہ چھڑ جائے جو سماج میں رواج کی شکل اختیار کر جاتا ہے، تب موضوع پر سکتہ (،) کر کے پہلے اُس گناہ کی شاعت و قباحت کو قلوب سامعین میں خوب پیوست فرماتے ہیں، اور پھر موضوع پر آجاتے ہیں۔

ہماری یہ خوش نصیبی ہے کہ ہمیں عمومی درسِ حدیث ایک ایسی ہستی سے حاصل کرنے کا شرف مل رہا ہے جسے تدریس، تعلیم و تربیت، انتظام و انصرام اور راہِ سلوک و احسان کا طویل ترین تجربہ حاصل ہے۔ کہتے ہیں: ”سَلِّ الْمَجْرِبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَكِيمَ“ یعنی تجربہ کار اور حکیم کی رائے میں تعارض ہو، تو ترجیح تجربہ کار کی بات کو دی جائے گی۔

ہمارے حضرت اقدس دامِ مجد ہم کی فراغت دارالعلوم اشرفیہ راندر سے ہے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں دو سال گزارے، جس میں تکمیل فنون و افتاء وغیرہ کیا، اس ضمن میں حضرت اقدس فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ٹچ ”Touch“ میں آئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے باقاعدہ تلمذ کا شرف حاصل ہونے کے علاوہ حضرت قطب الاقطاب شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و استرشاد اور حضرت کے ایماء پر حضرت اقدس فقیہ الامت کی مخصوص تربیتی توجہ پھر شفقت و فیضان کے مورِ خاص بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

دیوبند سے فراغت کے بعد ڈابھیل میں تدریسی تقرر ہوا؛ لیکن حضرت اقدس فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ کے دم واپسی تک ضابطہ و رابطہ رہا، جس کی نظیر ہمارے دور میں کم ملتی ہے۔

اپنے معمولات و حالات کی باقاعدہ خطوط کے ذریعہ اطلاع، پھر حضرت کی ہدایات پر سختی سے عمل، نجی معاملات میں مشورہ لینا؛ ہمیشہ کا معمول رہا۔ حضرت اکشر سناتے ہیں کہ: ایک مرتبہ حضرت اقدس کو خط لکھا کہ معمولات چھوٹ رہے ہیں، جواب

آیا کہ: ”پھر وہ معمولات کہاں ہوئے، وہ تو متروکات ہو گئے“، فرمایا: بس! اس جواب نے اتنا اثر کیا کہ پھر کبھی معمولات ناغہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: میں نے اپنے اکابر میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہ کو شدید بیماری سے کچھ پہلے تک اور حضرت شیخ الاسلام اور اپنے چچا جان کو دیکھا کہ بہت اہتمام سے ذکر بالجہر کرتے رہے۔ (آپ بقی ۱۶۴۱ مطبوعہ اشاعت العلوم سہارن پور)

ہمارے مرشد و مربی حضرت دامت برکاتہم کو بھی اللہ جل جلالہ نے اس نعمت سے حظ وافر قابل رشک حد تک عطا فرمایا ہے۔ فللہ الحمد۔

راقم آشم کو یاد ہے کہ، کبھی کوئی معمولی بات ہوئی تو فوراً پوسٹ کارڈ لکھ کر حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کے نام روانہ فرماتے۔ ربیع الاول کے بیانات کی دعوت کا سلسلہ شروع ہوا، تو اپنے مرشد سے باضابطہ استفسار کر کے ہی آگے قدم بڑھایا۔ خلاصہ کلام میں کہ کسی کو اپنے شیخ سے رابطہ کا تعلق ہوتا ہے کسی کو ضابطہ کا، الحمد للہ ہمارے حضرت کو اپنے حضرت سے دونوں تعلقات کاملاً حاصل تھے۔

تعطیلات کے زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ جہاں ہوتے، ہمارے حضرت باقاعدہ اجازت حاصل کر کے وہ قیمتی زمانہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گزار کر مرحل سلوک طے فرماتے رہے۔ اُس زمانہ میں دو ہی بڑی تعطیلات تھی: ایک عید الاضحیٰ، دوسری سالانہ۔ حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول بقر عید باندہ میں کرنے کا تھا، ہمارے حضرت بھی اجازت حاصل کر کے اُس موقع سے فائدہ اٹھاتے۔

سالانہ جلسہ ہوتے ہی دیوبند پہنچ جاتے، اور عشرۂ اخیر میں بہ ارشاد حضرت ڈابھیل واپسی ہوتی۔ ڈابھیل میں ششماہی تعطیلات ایک ہفتہ کا سلسلہ شروع ہوا، تو یہ

گویا حضرت دام مجرہم کے لیے اپنے شیخ سے استفادہ کا ایک اور سنہری موقع ہو گیا، چنانچہ یہ تعطیلات بھی حضرت کے ساتھ گزرنے لگیں۔ یہ تو سفر نامہ سلوک کے چند اشارات ہیں، پورا سفر نامہ تو مسافر ہی لکھ سکتا ہے۔

جس شخصیت نے ایسی باضابطگی کے ساتھ اپنے مرشد سے تربیت حاصل کی ہو، وہ کن کن اوصاف کی حامل ہوگی! کون اندازہ لگا سکتا ہے!!۔

جہاں تک تدریسی تجربہ کا سوال ہے، تو الحمد للہ اس کی نصف صدی مکمل فرما کر اب درسِ نظامی کی سدرۃ المنتہیٰ صحیح بخاری جلد اول کی کامیاب تدریس کا دوسرا سال چل رہا ہے۔ اس طویل مدت میں کیا کیا نشیب و فراز سے گزریں ہوں گے؟ اس عرصہ دراز میں حضرت کا یہ امتیاز رہا کہ درس طلبہ کو گھول کر پلا دیتے ہیں، کوئی سبق بغیر تیاری کے نہیں پڑھاتے، حدیہ ہے کہ شبہ کے اس عمومی درس کی بھی باضابطہ تیاری فرما کر تشریف لاتے ہیں۔ اس درس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ ”عیال را چہ بیاں“۔

ناظرین بزرگوار! بندہ کو چاہوسی سے نفرت ہے؛ لیکن مجبوری یہ ہے کہ یہ قول حضرت اقدس تھانویؒ: ”ہندوستان کے خمیر میں مردہ پرستی ہے“۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بزرگوں کی حیات میں ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی جاتی، ان سے تربیت حاصل نہیں کی جاتی، پھر وفات کے بعد ان کے گن گائے جاتے ہیں، کیوں نہ ہم ان کی حیات ہی میں استفادہ کے ہر موقع کو غنیمت سمجھ لیں۔ حضرت اقدس کے مفصل حالات زندگی کے لیے ”مقدمہ محمود الفتاویٰ“ کے مطالعہ کا مشورہ ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا، گو تھوڑا طویل ہی سہی، اب ہم مضامین کتاب کی طرف لوٹتے ہیں، ہدایات بہ سلسلہ مالیات ہی کے بیان میں علامہ نوویؒ ”شکر گزار مالدار کی فضیلت“ کا عنوان قائم فرما کر شاید اس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ، مالدار ہونا

مطلقاً برا نہیں ہے، جیسا کہ بعضوں کو غلط فہمی ہوتی ہے، مالدار اگر شرا کر ہو تو اُس کے باقاعدہ فضائل وارد ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون جو اس سے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ”فضائل صدقات“ میں نقل فرمایا ہے، قابلِ مطالعہ ہے۔

حدیث میں ”غنی“ سے مطلقاً پناہ نہیں مانگی گئی ہے؛ بلکہ ایسے غنی سے پناہ مانگی گئی ہے جو سرکش بنانے والا ہو۔ ”وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ كُلِّ غِنًى يُّطْغِي نِي“ (الحزب الاعظم) معتدل غنی کا سوال کیا گیا ہے۔ ”وَأَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنَى، اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ غِنَايَ وَغِنَا مَوْلَايَ، اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ غِنَى الْأَهْلِ وَالْمَوْلَى“۔ اے اللہ! دنیا دے کر میرے دین پر مدد فرما: ”اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى دِينِي بِالْدُّنْيَا“ (الحزب الاعظم) وجہ اس کی یہ ہے کہ مالدار ہونا، یہ ایک غیر اختیاری امر ہے، جیسے: فقر؛ اور اسلام نے غیر اختیاری امور پر فی نفسہ کوئی فضیلت یا وعید بیان نہیں کی ہے۔

مالیاتی ہدایات کے معاً بعد حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ”موت کی یاد اور امیدوں کا اختصار“ عنوان قائم کر کے شاید ہیلپ لائن (Help Line) بتائی ہے کہ: جو شخص ہر وقت موت کو یاد رکھے گا، امیدوں کو مختصر کرے گا، اُس کے لیے سخاوت آسان، بخل مشکل، مانگنا مشکل، قناعت آسان، محنت مشقت کر کے حلال کمانا آسان، ایثار و مواسات سہل ہو جائے گا، اور دینی امور میں تنافس کا جذبہ قدرتی طور پر پیدا ہو جائے گا۔

حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی انگوٹھی پر لکھوایا تھا: ”نصیحت کرنے کے لیے موت کافی ہے“: کفی بالموت واعظاً۔

کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے	✽	ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
موت آکر ہی رہے گی یاد رکھ	✽	جان جا کر ہی رہے گی یاد رکھ

انسان کو مرنے کے بعد منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے، اس طرح قبرستان

وجود میں آتے ہیں، اب ان سے متعلق احکام کے جاننے کی ضرورت پڑے گی؛ اس لیے مصنفِ علامہ نے سرخی قائم کی: ”مردوں کے لیے زیارتِ قبور کا استحباب، زائر کیا پڑھے؟“ اس ضمن میں بیش قیمت مواد موجود ہے۔

موت کی یاد کے فوائد پڑھ کر شاید کسی کو خیال ہو کہ موت کی دعا ہی کیوں نہ کر لوں، تو فوراً امام رحمۃ اللہ علیہ نے بتا دیا کہ: ٹھہرو! ابھی موت کی تمننا مت کرو، اس سلسلے کی اسلامی ہدایات پڑھ لو، سمجھ لو؛ تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون سے اسباب و عوامل ہیں جن میں تمننائے موت کی اجازت ہے اور نہیں ہے؟ پھر ان کو اپنے ذاتی حالات پر منطبق کر دیکھو، خود فیصلہ کر لو کہ آپ کے لیے تمننائے موت کی اجازت ہے یا نہیں؟۔

موت کا استحضار ہونے کے بعد انسان کا قلب دنیا کی طرف سے قدرتی طور پر سرد ہو جاتا ہے، اور ورع و ترکِ شہوات کی طرف طبیعت چلنے لگتی ہے؛ اس لیے صاحبِ کتاب نے عنوان شروع کیا: ”ورع و ترکِ شہوات کا بیان“ اس سرخی کو حضرت اقدس نے کما حقہ تشریح فرما کر بے غبار فرمادیا ہے۔ ورع کا مطلب کیا ہے؟ اسلاف نے ورع کا کیا نمونہ دیا۔ واقعات کی شکل میں اسے بیان فرمایا ہے۔

اس کے بعد والے عنوان میں مصنفِ ریاض الصالحین نے یہ بتایا ہے کہ ۱۔ لوگوں اور زمانے کے بگاڑ کے وقت ۲۔ دین کے اندر فتنہ میں مبتلا ہونے کے اندیشہ کے وقت ۳۔ اور حرام یا مشتبہ امور میں مبتلا ہونے کے ڈر کے وقت آدمی کے لیے مستحب ہے، کہ گوشہ نشینی اختیار کر لے۔

لیکن کہیں اس کو مطلقاً افضل نہ سمجھ لیا جائے؛ اس لیے بعد والے عنوان میں بتا دیا کہ عام حالات میں لوگوں میں رہنا ہی پسندیدہ ہے۔

اب تواضع کا نمبر ہے۔ انسان جب شریعتِ مطہرہ کی اتنی زبردست پابندی

کرے گا تو ظاہر ہے کہ شیطان ہاتھ پر ہاتھ دیے تو نہیں بیٹھا رہے گا، اب وہ کبر کے دام میں پھنسا کر انسان کو بھی اپنی طرح راندہ درگاہ کروانے کے فراق میں رہے گا؛ اس لیے امام علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اضع پر مواد اکٹھا فرمایا؛ تاکہ آدمی آپے سے باہر نہ ہو جائے۔

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک صاحب نے لکھا کہ: حضرت! ایک طویل عرصہ سے تہجد کی پابندی ہو رہی تھی، ایک دن چھوٹ گئی، اس کا بہت رنج ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ہو سکتا ہے اس لیے چھڑوائی گئی ہو کہ آپ میں کبر نہ پیدا ہو جائے:

دلا گر تو اضع کنی اختیار	❁	شود خلق دنیا ترا دوست دار
--------------------------	---	---------------------------

اس عنوان کے تحت اصل کتاب کے علاوہ اس کی تشریحات میں بڑے نایاب مضامین ہیں۔ ”و بصدھا تتبدین الاشیاء“ تو اضع کو سمجھنا ہو تو تکبر سمجھ لیں، تو اضع خود بہ خود واضح ہو جائے گا؛ اسی لیے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اضع کے بیان سے فارغ ہو کر ”تکبر اور خود پسندی کی حرمت“ کا باب قائم فرمایا ہے، اور اس کے تحت آیات و روایات پیش فرما کر اس کی شاعت و قباحت بتانے کی کامیاب سعی فرمائی ہے۔ اس مضمون کی تشریح طیب حاذق کی زبان سے اگر سننے کو ملے تو کیا لطف آجائے!

اب عنوان ہے: ”اچھے اخلاق کا بیان“، اچھے اخلاق کا لفظ جس کثرت سے ہمارے معاشرہ میں مستعمل ہے، اتنی ہی اُس کی حقیقت سے ناواقفیت بھی ہے۔ حسنِ خلق اور اخلاق سے کیا مراد ہے؟ اس عنوان کے تحت ہمارے قارئین ان شاء اللہ ایسی تشریح پڑھ سکیں گے کہ، مضمون پوری طرح نکھر کر سامنے آجائے گا۔

حسنِ خلق ایک درخت ہے، جس کی مختلف شاخیں ہیں: بردباری، وقار، نرمی، عفو و درگزر وغیرہ؛ اس لیے امام ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے ان مختلف شاخوں کو مستقل عنوان دے کر متعلقہ آیات و روایات کو ان کے تحت جمع فرما دیا ہے۔

مواد کی فراہمی یعنی سی ڈی (CD) سے کاغذ پر مضامین لکھنا کسی بھی درسی تقریر کی طباعت میں اہم ترین مرحلہ شمار ہوتا ہے، الحمد للہ ہمارے حضرت اقدس کے مجبین، مسٹر شہین و تلامذہ کی تقریباً ایک پوری جماعت ہے جو اس گھائی سے ہمیں گزارتی ہے، چاہے لکھ کر یا اپنے تلامذہ و احباب سے لکھوا کر؛ ہم ان سب ہی احباب کے ممنون ہیں۔ اس جلد کے لیے مواد کی فراہمی میں بھی جناب مفتی رفیق صاحب کوکنی مد فیضہ اور ان کے رفقاء، حضرت مفتی عارف صاحب کنجروی زید فضلہ اور ان کے احباب کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اسی طرح آئندہ جلدوں کے مواد کی تیاری میں بھی دیگر بہت سے احباب بہ رضا و رغبت بڑی عرق ریزی و خوش اسلوبی سے لگے ہوئے ہیں، بہت سارا مواد تو الحمد للہ ہم تک پہنچ چکا ہے۔

اے اللہ! تو ان تمام احباب کو اپنی شایان شان جزائے خیر عطا فرما کر ان کے علوم و اعمال، قرب الہی میں بے پناہ ترقی عطا فرما، دنیا و آخرت کی بھلائیاں نصیب فرما، حاجات کا تکفل فرما، آئندہ مزید درمزید کی توفیق عطا فرما۔ آمین

ابوزاہر

۱۳۳۳/۱۱/۲۱

۲۰۱۲/۱۰/۷

القناعة والعفاف
والاقتصاد فی البعیثة
قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا
اور معیشت میں میانہ روی
﴿ مجلس ۱ ﴾

کیم ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۳ جون ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَتُوْمِنُ بِهِ وَتَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ. وَنَعُوْذُ
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا اَمِنْ یٰہیْدیْہَا اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ
 یُّضِلُّہٗ فَلَا ہَادِیْ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا
 وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ تَسْلِیْمًا
 کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ:

ترجمہ الباب کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہے: قناعت اختیار کرنا
 اور سوال سے بچنا، زندگی گزارنے اور خرچ کرنے کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنا
 اور بلا ضرورت سوال کرنے کی برائی۔

پہلی بات ”قناعت“ ہے۔ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے
 آدمی کو جو کچھ ملے اُس پر راضی اور خوش رہے، جس کو گجراتی میں (aitmi si^tiil:Si)
 کہتے ہیں، گجراتی کی کہات ہے: ”si^tiil:Si& nir siDi si#Ki&“ جو آدمی قناعت والا
 ہوتا ہے وہ ہمیشہ خوش اور عیش و آرام میں رہتا ہے۔

دوسری بات ”عفاف“ ہے۔ اس کا مطلب ہے: اپنے آپ کو سوال سے
 بچانا، کسی کے سامنے سوال نہ کرنا۔ ویسے عفت روکنے کے معنی میں بھی آتا ہے، کہ نفس کو
 ہر ایسی چیز سے روکنا جو اُس کے لیے تکلیف کا ذریعہ ہو، اس کے لیے لفظ عفاف
 استعمال ہوتا ہے۔ اور عام طور پر یہ لفظ دو چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے: ایک تو سوال
 سے بچنے کے لیے، اور دوسرا اپنی شرمگاہ کو زنا وغیرہ گناہ سے بچانے کے لیے بھی اس کا
 استعمال ہوتا ہے، جس کو ”عفت و پاک دامنی“ کہتے ہیں؛ لیکن عربی زبان میں

’عفاف‘ ایک الگ ہی مفہوم رکھتا ہے۔ اگرچہ یہاں یہی مراد لیا گیا ہے کہ، آدمی اپنے آپ کو لوگوں سے سوال کرنے سے بچائے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ، زندگی گزارنے اور خرچ کرنے کے معاملہ میں آدمی میانہ روی اختیار کرے، نہ تو بہت زیادہ خرچ کرے اور نہ بحسل سے کام لے؛ بلکہ درمیانی راہ اختیار کرے۔

نہ اسراف کی اجازت، اور نہ بخل کی

اسلام نے ہر معاملہ میں میانہ روی کو پسند کیا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے۔ ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندے اور عباد الرحمن کی جو علامتیں اور نشانیاں بتلائی گئی ہیں، ان میں ایک نشانی یہ بھی ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی بھی نہیں کرتے، کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہوں، اور اُس میں کمی اور بخل سے بھی کام نہیں لیتے؛ بلکہ ضرورت کے بقدر خرچ کرتے ہیں، اور درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔

’اسراف‘ کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے، جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے وہاں خرچ کرنا، اور دوسرے جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں بھی جتنا خرچ کرنا چاہیے اُس سے زیادہ خرچ کرنا؛ ان دونوں کے لیے ’اسراف‘ بولا جاتا ہے۔ بعضوں نے اسراف اور بسط میں فرق کیا ہے، قرآن پاک میں ایک اور جگہ بھی باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ اپنا ہاتھ بندھا ہوا بھی مت رکھو، اور بالکل کھلا بھی نہ چھوڑو۔ خرچ کرنے کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، یعنی ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی خرچ ہی نہ کرے، مٹھی بند رکھے۔ اور یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک

دَم کھول دے؛ بلکہ میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے؛ ورنہ ایسا ہوگا کہ اگر زیادہ خرچ کرو گے تو جیب خالی ہو جائے گا، اور بالکل غمگین ہو کر سر جھکا کر بیٹھ جاؤ گے۔

پھر آدمی بے صبری سے کیوں کام لے؟

اسی سلسلہ میں قرآن پاک کی ایک آیت ذکر کی ہے: ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾
 روئے زمین پر جتنے بھی جاندار ہیں، اللہ تعالیٰ کے اوپر ان کی روزی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کی روزی کا ذمہ لے رکھا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے روزی کا ذمہ لے رکھا ہے تو پھر آدمی کیوں بے صبری سے کام لے؟ بس! اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر روزی دے گا، ہماری روزی وقت پر ضرورت کے بہ قدر مل ہی جائے گی، وہ کہیں جانے والی نہیں ہے ﴿وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا﴾ آدمی کا جو مستقل جائے قیام اور ٹھکانہ (permenant Address) ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے آدمی کہیں جاتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ دنیا کا دستور تو یہ ہے اگر کسی کا کہیں وظیفہ مقرر ہو تو وہ اُس کی مقررہ جگہ (permenant Address) پر پہنچتا ہے۔ اگر اُس کو کہیں سفر درپیش ہو تو اُس کو پہلے سے درخواست دینی پڑتی ہے، اور محکمہ میں اطلاع کرنی پڑتی ہے کہ اتنے دنوں کے واسطے میں فلاں جگہ جا رہا ہوں، میرا وظیفہ مجھے وہاں پر بھیج دیا جائے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں دہلی جانے والا ہوں، میری روزی وہاں بھیج دی جائے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں، آپ مستقل طور پر جہاں قیام فرما ہیں وہ بھی، اور جہاں تھوڑی دیر کے لیے جانے والے ہیں اُس سے بھی اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے۔

سوال کرنے کا ایک قدرتی اثر

﴿لِّلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصُوا، وَافِي سَبِيلِ اللَّهِ لَئِيَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ (البقرة: ۲۷۰-۲۷۱) ﴿صدقات کن لوگوں کو دینے چاہئیں؟ اس سلسلے میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: یہ ان فقیروں کا حصہ ہے جو اللہ کے راستہ میں روک دیے گئے۔ گویا جو لوگ اللہ تعالیٰ ہی کے کاموں کے لیے اپنی ذات کو روکے ہوئے ہیں، ان کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے، جہاد کی مصروفیت کی وجہ سے، اور دوسرے دینی امور کی مصروفیت کی وجہ سے روزی حاصل کرنے کے لیے زمین میں سفر نہیں کر پاتے، اور جو آدمی ان کی حالت سے ناواقف ہے وہ بھی ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ان کو مال دار سمجھتا ہے، کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے۔ اور چاہے اپنی زبان سے سوال نہیں کرتے اور جزع فزع اور بے صبری کے ذریعہ اپنی حالت کا لوگوں کے سامنے اظہار بھی نہیں کرتے؛ لیکن ان کے چہرے کی علامتوں سے آپ ان کو پہچان لیں گے۔ ﴿لَآ يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ ﴿یہ ایسے لوگ ہیں جو لوگوں سے اصرار کر کے مانگتے نہیں ہیں۔ اس آیت کا یہی جملہ ﴿لَآ يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ خاص طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خاص شان یہ بتلائی کہ باوجود ضرورت مند ہونے کے وہ سوال نہیں کرتے۔

آگے روایتیں آئیں گی کہ اپنی ضرورت ہو تب بھی آدمی کو اپنے آپ کو سوال سے بچانا چاہیے۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ سوال ہی ہماری ضرورتوں کا حل ہے، حالاں کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ: سوال کے نتیجے میں آپ کی ضرورت ختم نہیں ہوگی؛ بلکہ اور بڑھ جائے گی۔ سوال کرنے کا یہ قدرتی اثر ہے۔

مقصدِ زندگی

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا﴾ میں نے جنات اور انسانوں کو اپنی عبادت اور فرماں برداری کے لیے پیدا کیا ہے؛ اس لیے آپ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اپنا کام کیجیے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: میں ان سے روزی نہیں مانگتا، میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھلائیں؛ بلکہ ان کو روزی تو میں دیتا ہوں۔ دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ آقا لوگ غلاموں کو کام کاج میں لگا کر ان کی آمدنی سے اپنی روزی کے طور پر کچھ حاصل کرتے ہیں، باری تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کہ بندوں کو روزی کموانے کے لیے پیدا کیا ہو۔

حقیقی مالداری؛ دل کی صفت

۵۲۲: - عن أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَيْسَ الْغَنِيُّ عَنِ

كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغَنِيَّ غِنَى النَّفْسِ - (متفق علیہ)

(الْعَرَضُ) بفتح العين والراء: هُوَ الْمَالُ -

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مالداری مال و سامان کی کثرت اور زیادتی کا نام نہیں ہے؛ بلکہ حقیقی مالداری دل کی بے نیازی ہے۔

افادات:- غنی اور مالداری سامان کی زیادتی کا نام نہیں؛ بلکہ دل کی

بے نیازی ہے، آدمی کے دل میں ایک قسم کا سکون و اطمینان ہو، بے نیازی کی کیفیت

ہو، اور لوگوں سے سوال نہ کرے۔ باقی بہت سے لوگوں کے پاس بہت سا روپیہ ہوتا

ہے، اس کے باوجود ان کے دل میں حرص و طمع بھری ہوئی ہوتی ہے، اتنا ساز و سامان

اور روپیہ ہونے کے باوجود ان کو صبر اور قرار نہیں ہوتا۔

وہ آدمی کامیاب ہو گیا

۵۲۳:- وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَرَزِقَ كَفَافًا، وَقَنَّعَهُ اللَّهُ بِمَا آتَاهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کامیاب ہو گیا وہ آدمی جو اسلام لایا (اس لیے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے) اور اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہ قدرِ ضرورت روزی دی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو جو دیا پھر اُس پر قناعت بھی عطا فرمائی۔

انصادات:- یعنی اُس کے دل میں کوئی حرص اور لالچ نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ملاء اُسی پر وہ راضی اور خوش ہے، اور اُسی سے وہ اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، زیادہ کی طلب میں لگا ہوا نہیں ہے۔

بغیر سوال ملنے پر برکت کا وعدہ

۵۲۴:- عن حكيم بن حزام رضي الله عنه قال: سألت رسول الله ﷺ فَأَعْطَانِي ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَأَعْطَانِي، ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَأَعْطَانِي، ثُمَّ قَالَ: يَا حَكِيمُ، إِنَّ هَذَا الْمَالَ خَصِيْرٌ، حُلُوٌّ فَمَنْ أَخَذَهُ بِسَخَاوَةٍ نَفْسٍ بُورِكَ لَهُ فِيهِ، وَمَنْ أَخَذَهُ بِأَشْرَافِ نَفْسٍ لَمْ يُبَارَكْ لَهُ فِيهِ، وَكَانَ كَالَّذِي يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ، وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى. قَالَ حَكِيمٌ: فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أُرْزَأُ أَحَدًا بَعْدَكَ شَيْئًا حَتَّى أَفَارِقَ الدُّنْيَا، فَكَانَ أَبُو بَكْرٍ رضي الله عنه يَدْعُو حَكِيمًا لِيُعْطِيَهُ الْعَطَاءَ، فَيَأْتِي أَنْ يَقْبَلَ مِنْهُ شَيْئًا، ثُمَّ إِنَّ مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ رضي الله عنه دَعَا لِيُعْطِيَهُ فَأْتِي أَنْ يَقْبَلَهُ. فَقَالَ: يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! أَشْهَدُكُمْ عَلَى حَكِيمٍ أَنِّي أَعْرِضُ عَلَيْهِ حَقَّهُ الَّذِي قَسَمَهُ اللَّهُ لَهُ فِي هَذَا الْغِيءِ فَيَأْتِي أَنْ يَأْخُذَهُ، فَلَمْ يَزْرَأْ حَكِيمٌ

أَحَدًا مِّنَ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِيِّ ﷺ حَتَّىٰ نُوفِيَ. (متفق علیہ).

(يُرْزَأُ) (پرائے تمہارا ہی تمہارے ہمراہ): لَمْ يَأْخُذْ مِنْ أَحَدٍ شَيْئًا، وَأَصْلُ الرُّزْءِ التَّقْصَانُ، أَيْ: لَمْ يَنْقُصْ أَحَدًا شَيْئًا بِالْأَخْذِ مِنْهُ. وَ (إِشْرَافُ النَّفْسِ): تَطْلُعُهَا وَطَمَعُهَا بِالشَّيْءِ. وَ (سَخَاوَةُ النَّفْسِ): هِيَ عَدَمُ الْإِشْرَافِ إِلَى الشَّيْءِ، وَالطَّمَعُ فِيهِ، وَالْمَبَالَاةُ بِهِ وَالشَّرَّه.

ترجمہ:- حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم ﷺ

سے مال کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے مجھے عطا فرمایا۔ میں نے پھر مانگا تو آپ ﷺ نے پھر عطا کیا، میں نے پھر سوال کیا تو آپ ﷺ نے پھر عطا فرمایا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اے حکیم! یہ مال بڑا سبز و شیرین اور میٹھا ہے (دیکھنے میں بھی آدمی کو بہت اچھا لگتا ہے، اور برتنے اور خرچ کرنے میں بھی۔ یعنی اس کو جب استعمال کیا جاتا ہے تب بھی بہت اچھا معلوم ہوتا ہے) جو آدمی اس کو سخاوتِ نفس (یعنی نفس کے استغناء) کے ساتھ حاصل کرے گا، اُس کے لیے اس میں برکت دی جائے گی۔ اور جو آدمی اس کو اشرفِ نفس (یعنی نفس کی حرص و طمع) کے ساتھ لے گا تو اُس کے لیے اس میں برکت نہیں ہے، اور اس کا حال ایسا ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھا تا رہتا ہے اور پیٹ نہیں بھرتا، اور اوپر والا ہاتھ، نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ حضرت حکیم بن حزام فرماتے ہیں کہ (نبی کریم ﷺ نے مال کے سلسلے میں میری درخواست پوری کرنے کے بعد جب مجھے یہ نصیحت فرمائی، تو اس نصیحت کو سن کر) میں نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے، میں آج کے بعد کسی کے مال میں کمی نہیں کروں گا (کسی سے مال کا مطالبہ کر کے اُس کو زحمت میں نہیں ڈالوں گا) یہاں تک کہ دنیا سے جدا ہو جاؤں (یعنی مجھے موت آجائے)۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے دورِ خلافت میں حضرت حکیم بن حزام کو بلوا بھیجے؛ تاکہ اُن کو اُن کا حصہ دیں؛ لیکن وہ اُس میں سے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور

خلافت میں حضرت حکیم بن حزامؓ کو مقررہ وظیفہ لینے کے لیے بلایا؛ لیکن انہوں نے انکار کیا، تو حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: اے مسلمانوں کی جماعت! میں تم کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے حکیم بن حزام کو ان کا بیت المال میں مقررہ حصہ پیش کیا؛ لیکن انہوں نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کو بھی تکلیف نہیں دی، کسی سے بھی مال کا مطالبہ نہیں کیا اور کوئی چیز نہیں لی، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوا۔

افادات:- سخاوت کا مطلب ہے کہ دل میں لالچ اور حرص نہ ہو، اور ”اشراف“ عربی زبان میں کہتے ہیں کہ اونچائی پر سے کسی چیز کو دیکھنا اور جھانکنا، گویا نفس کسی چیز کے متعلق اپنے اندر طلب رکھتا ہو، اُسی کو نفس کی تاک جھانک کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی آدمی یوں سوچے کہ مجھے فلاں آدمی یہ چیز دے دے، مجھے ہدیہ دے، مجھے فلاں کی طرف سے یہ چیز مل جائے۔ آدمی کے دل میں ایسی طلب ہو، چاہے اس کو سامنے والا کچھ نہ دے۔ ایک تو ہوتا ہے زبان سے مانگنا اور سوال کرنا، اور ایک ہے دل سے کسی کی چیز کے متعلق لالچ اور خواہش رکھنا کہ فلاں آدمی مجھے فلاں چیز دے؛ اس کو ”اشراف“ کہتے ہیں۔ جس طرح زبان سے سوال کرنا حرام ہے، اسی طرح اشراف بھی حرام ہے۔ دونوں ہی ممنوع ہیں۔

اسی لیے اشرافِ نفس کے ساتھ کوئی چیز ملی ہو مثلاً دل میں ایسی لالچ پیدا ہوگئی کہ فلاں آدمی مجھے ہدیہ دے، اس کے بعد واقعہً اس نے ہدیہ دیا تو اس میں برکت نہیں ہوگی، اور اس کا لینا پسندیدہ نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو آدمی دل کی لالچ اور طلب کے ساتھ کوئی چیز لیتا ہے، تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اور اس کا حال ایسے جانور یا آدمی جیسا ہوتا ہے جس کو جوع البقر کی بیماری ہوگئی ہو کہ وہ کھانا کھاتا رہتا

ہے اور اس کا پیٹ نہیں بھرتا، ایسا ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ کتنا ہی مال اس کے پاس آئے، لیکن اس کی طمع اور طلب میں کمی نہیں آئے گی۔

”اوپر والا ہاتھ“ یعنی دینے والا ہاتھ، یا نہ مانگنے والا اور سوال نہ کرنے والا ہاتھ؛ ”نیچے والے ہاتھ“ یعنی سوال کرنے والے ہاتھ، یا نہ دینے والے ہاتھ؛ یا لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

مال کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کے نصیحت فرمانے پر حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے وعدہ کر لیا کہ آئندہ موت تک میں کبھی کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ خصوصیت تھی کہ جب کسی بات پر نبی کریم ﷺ کی طرف سے ان کو ٹوکا جائے، نصیحت و تنبیہ کی جائے، تو بس! پھر مضبوطی سے اس کو ایسا پلے باندھ لیتے تھے کہ دوبارہ اس سلسلہ میں ان کو اصلاح کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ وہ ہمارے جیسے نہیں تھے کہ بار بار ٹوکا جائے، تنبیہ کی جاتی رہے؛ تب بھی دو دن کے بعد، دو مہینے یا دو سال کے بعد بھول جاتے ہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ایک مرتبہ کسی بات پر نبی کریم ﷺ نے تنبیہ فرمادی، تو زندگی بھر کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔

عہد نبھانے کا سبق آموز نمونہ

دیکھو! ان کے اس سوال پر نبی کریم ﷺ نے بطور نصیحت کے یہ چیزیں ارشاد فرمائی تھیں جس میں بتلادیا کہ سوال نہ کرنے کی یہ فضیلت ہے، اور بغیر سوال کے جو چیز ملتی ہے اس میں برکت ہے۔ سوال دو طریقوں سے ہوتا ہے، ایک تو زبان سے اور دوسرا دل سے؛ دونوں کے اندر برکت نہ ہونے کو بتلایا ہے۔

تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے ہی عہد کر لیا کہ آئندہ کسی سے سوال

نہیں کروں گا اور کسی کو زحمت نہیں دوں گا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے دورِ خلافت میں حضرت حکیم بن حزام کو بلوا بھیجتے کہ مالِ غنیمت آیا ہوا ہے، اس میں تمہارا جو حصہ ہے، یا بیت المال میں جو وظائف مقرر کئے جاتے تھے، اس میں تمہارا جو وظیفہ مقرر ہے، وہ آکر لے جاؤ یعنی ان کو باقاعدہ بلواتے تھے، لیکن وہ انکار کر دیتے تھے اور کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے بھی حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقررہ وظیفہ لینے کے لیے بلایا لیکن انہوں نے انکار کیا۔ چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آخرت کا بڑا فکر رہتا تھا کہ ابھی نہیں لیتے، اگر کل کو قیامت میں میرے خلاف اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعویٰ کر دیا کہ عمر نے میرا حق نہیں دیا تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں موجود مسلمانوں کو گواہ بنا کر یہ کہا کہ تم گواہ رہو کہ میں نے ان کا حصہ ان کو پیش کیا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور آیا۔ اس لیے کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا۔ ان کی زندگی کے ساٹھ (۶۰) سال کفر کی حالت میں، اور ساٹھ (۶۰) سال اسلام کے اندر گزرے؛ کسی بھی دور میں انہوں نے کچھ بھی نہیں لیا۔ میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ وعدہ جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کیا تھا اس کو طویل زمانہ تک نبھایا۔ یہ ان حضرات کی عزیمت اور چٹنگی کی بات ہے۔ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کو بھی تکلیف نہیں دی، کسی سے بھی مال کا مطالبہ نہیں کیا اور کوئی چیز نہیں لی یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوا۔

چیتھڑوں والا غزوہ

۵۲۵:- وعن أبي بردة عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه قال: خَرَجْنَا مَعَ

رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي غَزَاةٍ وَنَحْنُ سِتَّةُ نَفَرٍ. بَيَدِنَا بَعِيرٌ نَعْتَقِبُهُ. فَتَقَبَّتْ أَقْدَامُنَا وَتَقَبَّتْ قَدَمِي، وَسَقَطَتْ أَظْفَارِي. فَكُنْتُ أَنْلُفُ عَلَى أَرْجُلِنَا الْحَرَقَ، فَسُهِبَتْ غَزْوَةٌ ذَاتِ الرَّقَاعِ لِمَا كُنَّا نَعْصِبُ عَلَى أَرْجُلِنَا مِنَ الْحَرَقِ. قَالَ أَبُو بُرْدَةَ: فَخَدَّتْ أَبُو مُوسَى بِهَذَا الْحَدِيثِ، ثُمَّ كَرِهَ ذَلِكَ، وَقَالَ: كَأَذَى كَرِهَ أَنْ يَكُونَ شَيْئًا مِنْ عَمَلِهِ أَفْشَاةً. (متفق عليه)

ترجمہ: - حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک روز فرمایا کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ کے لیے نکلے۔ ہم چھ آدمیوں کی ایک جماعت بنائی گئی تھی اور ہمارے درمیان سواری کے واسطے ایک ہی اونٹ تھا، ہم باری باری اس پر سوار ہوتے تھے (جب چھ آدمی باری باری سوار ہوں گے تو ایک مرتبہ جو آدمی سوار ہو چکا اس کی باری اتنی دیر بعد آئے گی کہ درمیان میں پانچ آدمی سوار ہوں گے۔ اور پیر میں جوتے بھی نہیں تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیدل چلنے کی وجہ سے) ہمارے پاؤں میں شکاف پڑ گئے، میرے پاؤں میں بھی شکاف پڑ گئے اور میرے ناخن تک گر گئے (ان شکافوں کی وجہ سے جو تکلیف ہوتی تھی اس سے بچنے اور چلنے میں آسانی ہو اس کے لیے) ہم اپنے پاؤں کے اوپر کپڑے کے چھیتڑے لپیٹتے تھے، اسی لیے اس غزوہ کا نام ”غزوہ ذات الرقاع“ ”چھیتڑوں والا غزوہ“ ہے (”رقاع“ عربی زبان میں چھیتڑوں کو کہتے ہیں) حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ یہ واقعہ بیان کرنے کو تو کر گئے (ہو سکتا ہے کسی خاص جذبہ اور کیفیت میں بیان کر دیا ہو) لیکن پھر ان کی طبیعت میں ناگواری پیدا ہوئی اور خیال ہوا کہ مجھے یہ بیان نہیں کرنا چاہیے تھا (کہ ہم نے دین کے لیے ایسی مشقتیں اٹھائیں ہیں) راوی کہتے ہیں گویا کہ انہوں نے اپنے کسی عمل کے ظاہر کرنے کو پسند نہیں فرمایا۔

افادات:- اس روایت کو لا کر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے ایسی سخت تکلیفوں پر بھی صبر کیا لیکن کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ ”عفاف“ یعنی اپنے آپ کو اتنی سخت حاجت کے باوجود سوال سے بچایا۔

دیکھو! ایک تو یہ ہے کہ عمل کرتے وقت آدمی کے دل میں ایسا خیال پیدا ہو، یہاں ایسی بات نہیں تھی، اس لیے کہ عمل تو ہو چکا تھا، اور عمل ہو چکنے کے بعد اس کو بیان کرنے سے اگر مقصود آدمی کی ریا و شہرت ہو؛ تو وہ بھی برا ہے۔ اور ظاہر ہے ان کا مقصود ریا اور شہرت نہیں تھی، لیکن وہ حضرات اپنے نفس کے کید اور نفس کی طرف سے پیش آنے والی برائیوں سے بے خوف نہیں رہتے تھے، بلکہ ڈرتے رہتے تھے۔

صفتِ استغناء پر سندِ نبوی

۵۲۶:- وعن عمرو بن تغلب . يَفْتَحُ الْمَثَنَاءَ فَوْقَ وَإِسْكَانِ الْغَيْنِ الْمَعْجِبَةِ وَكَسْرِ - اللام: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَتَى مَالًا أَوْ سَبِي فَقَسَمَهُ، فَأَعْطَى رِجَالًا، وَتَرَكَ رِجَالًا، فَبَلَغَهُ أَنَّ الَّذِينَ تَرَكَ عَتَبُوا، فَحَمِدَ اللَّهُ، ثُمَّ أَتَتْهُ عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: أَمَا بَعْدُ! فَوَاللَّهِ إِنْ لِي لَأَعْطِيَ الرَّجُلَ وَأَدْعُ الرَّجُلَ، وَالَّذِي أَدْعُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الَّذِي أُعْطِيَ، وَلَكِنِّي إِذَا أُعْطِيَ أَقْوَمًا لِمَا أَرَى فِي قُلُوبِهِمْ مِنَ الْحَزَنِ وَالْهَلَجِ، وَأَكُلُ أَقْوَمًا إِلَى مَا جَعَلَ اللَّهُ فِي قُلُوبِهِمْ مِنَ الْغِنَى وَالْحَيْرِ، مِنْهُمْ عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ . قَالَ عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ: فَوَاللَّهِ مَا أَحَبُّ إِلَيَّ بِكَلِمَةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حَمْرَ النَّعَمِ .

(رواہ البخاری) (الْهَلَجُ): هُوَ أَشَدُّ الْحَزَنِ ، وَقِيلَ: الصَّبْرُ .

ترجمہ مع شرح:- حضرت عمرو بن تغلب رضی اللہ عنہ (ایک صحابی ہیں وہ)

فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کچھ مال یا قیدی آئے۔ آپ ﷺ نے وہ مال لوگوں کے درمیان تقسیم کیا (لیکن وہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سب کو دیا جاسکتا اس لیے) آپ ﷺ

نے کچھ لوگوں کو دیا اور کچھ لوگوں کو نہیں دیا۔ پھر نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو نہیں دیا ان کو کچھ ناراضگی اور ناگواری ہوئی ہے (جب آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو حضور نے ایک تقریر فرمائی، اس میں) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنے کے بعد فرمایا: اللہ کی قسم! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں ایک آدمی کو دیتا ہوں اور دوسرے کو نہیں دیتا (اس کی وجہ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو دیا جا رہا ہے اس کے ساتھ محبت کا تعلق زیادہ ہے، اسی لیے تو اس کو دیا اور جس کو چھوڑا گیا شاید اس کے ساتھ وہ تعلق اور محبت کا رشتہ نہیں ہے، اسی لیے اس کو چھوڑ دیا گیا۔ لیکن یاد رکھو! صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ) جس کو میں نے نہیں دیا، وہ میرے نزدیک۔ اس کے مقابلہ میں جس کو میں نے دیا ہے۔ زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کو دیا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ) بعض لوگوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بے صبری اور بے چینی کی کیفیت ہوتی ہے (اگر ان کو نہ ملے تو وہ چپ نہیں رہ سکتے، ان کی بے صبری ان کو مانگنے پر آمادہ کر دے گی، اس لیے وہ مانگنے کے لیے آئیں اس سے پہلے ہی میں ان کو دے دیتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن سے تعلق زیادہ ہوتا ہے ان کو چھوڑ کیوں دیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں استغناء، اور بے پرواہی کی صفت رکھی ہے (ان کو کسی طرح کی بے صبری اور بے چینی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ”عفت“، یعنی سوال سے اپنے آپ کو بچانے اور ”قناعت“ کا وصف رکھا ہے، اس کی وجہ سے میں ان کو نہیں دیتا) انہی میں۔ اس روایت کے نقل کرنے والے۔ عمرو بن تغلب بھی ہیں (حضور اکرم ﷺ نے صراحت کے ساتھ ان کا نام لیا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد) حضرت عمرو بن تغلب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے بدلہ میں مجھے سرخ اونٹ ملیں (نبی کریم ﷺ کی طرف سے ایسی اونچی سند دی گئی ہے کہ ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی وہ نہیں مل سکتی ہے۔)

افسادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پرائیوں کو دے کر اپنے والوں کو نہیں دیتے اس لیے کہ پرانے بخشش کے نہیں، لہذا ان کو دیدو، اپنے لوگوں کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا، ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نہیں دیتا وہ دراصل ان کی خوبیوں یعنی صفت استغناء اور صفت قناعت کی وجہ سے نہیں دیتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اخلاق سے متصف تھے، اور اہل ایمان کو بھی تاکید کی گئی ہے: ”تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ“ اور اللہ تعالیٰ بھی جب کسی کو دیتے ہیں اور کسی کو نہیں دیتے؛ وہاں پر بھی یہی معاملہ ہوتا ہے کہ جن کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر ان کو نہ دیا جائے تو پتہ نہیں وہ کیا کر ڈالیں، ہو سکتا ہے کہ نہ ملنے پر بے صبری میں ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں، اس لیے ان کے ایمان کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے ہیں۔ اور بعض ایسے مضبوط ایمان والے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جانے والی آزمائش کو برداشت کر لیتے ہیں، یا ان کے دینی حالات ایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو نہیں دیا جاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس طرح بھی سوچا کرے۔

القناعة والعفاف
والاقتصاد فی البعیثة
قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا
اور معیشت میں میانہ روی
﴿ مجلس ۲ ﴾

۸ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۰ جون ۲۰۰۰ء
باب چل رہا ہے کہ آدمی قناعت اختیار کرے اور اپنے آپ کو سوال کرنے
سے بچائے اور اپنی معیشت یعنی زندگی گزارنے میں میانہ روی اختیار کرے۔

جو آدمی سوال سے بچنا چاہتا ہے.....

۵۲۷:- وعن حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ الدَّيْبِيَّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: الْيَدُ
الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ
غِنَى، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يَعْفُهُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَتِعْ يُعْنِهِ اللَّهُ. (متفق عليه) هَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ
وَلَفْظُ مُسْلِمٍ اِخْصَرَ.

ترجمہ:- حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد
فرمایا: اوپر والا ہاتھ (یعنی خرچ کرنے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ (یعنی مانگنے والے ہاتھ) کے
مقابلہ میں بہتر ہے (اس سے مانگنے کی بُرائی معلوم ہوئی) اور اگر آپ کوئی چیز خرچ کرنا چاہتے
ہیں تو جن کا نفعہ اور ذمہ داری آپ پر ہے ان سے شروع کیجئے۔ اور بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی
بے پرواہی اور دل کے اطمینان کے ساتھ دیا کرتا ہے۔ اور جو آدمی اپنے آپ کو سوال سے بچانا
چاہتا ہے، عفت اختیار کرتا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرماتے ہیں۔ اور جو آدمی
مستغنی بننا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کو دوسروں سے مستغنی بنا دیتے ہیں۔

افادات:- ایک آدمی کا ارادہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے
لیے اللہ کے راستہ میں مال خرچ کروں، تو پہلے ان لوگوں پر خرچ کرے جن کی ذمہ
داری اس پر عائد ہوتی ہے اور جن کا نفعہ برداشت کرتا ہے: مثلاً بیوی، بچے، ماں باپ
اور دوسرے قریب و دور کے اعضاء واقارب جن کی ذمہ داری درجہ بدرجہ اس کے اوپر
آتی ہے، انہی سے شروعات اور ابتداء کرنی چاہیے۔ جب ان کی ضرورتیں پوری ہو

جائیں اس کے بعد دوسروں کے اوپر خرچ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ویسے بھی جب ان کا نفقہ آدمی کے اوپر واجب ہے تو اس حیثیت سے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ کسی بھی نیک کام میں خرچ کرنے کے معاملہ میں نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہی اصول بتلایا ہے کہ ابتداء ان لوگوں سے ہونی چاہیے جن کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔

کوئی آدمی باہر تو بہت کچھ خرچ کرتا ہے، اور جو لوگ اس سے قریبی تعلق رکھنے والے ہیں: مثلاً اس کے رشتہ دار، بھائی، بہنیں، اس کے بھتیجے، بھانجے، وغیرہ: ان کو نہیں دیتا، وہ بیچارے اپنی ضرورتوں کی وجہ سے دوسروں کے محتاج ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہو گیا جیسا کہ گجراتی میں کہاوت ہے: (Gir nil! Cil!kri! Gi^T& cii!T! upiiDyiyi ni!) (aiTi!) ”یعنی گھر کے بچے چکی پر لگا آٹا چاٹ رہے ہیں، اور اجنبی پر آٹے کی سخاوت ہو رہی ہے“ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ ابتداء انہی سے کرے۔

بے نیازی سے دینے کے دو مطلب

”عَنْ ظَهْرٍ غَنِيٍّ“ کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ دینے کے بعد اپنی ضرورتوں کے پیش نظر دل میں خیال نہ آئے کہ میں نے خرچ نہ کیا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اُس کے پاس اتنا مال ہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے بعد بھی اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے واسطے مال بچ جاتا ہے جس سے اپنی اور اپنے ماتحتوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی؛ تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ گویا اس کو مستغنی کرنے والی چیز موجود ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مال خرچ کرنے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا، جیب خالی ہو جاتی ہے، لیکن اس کا دل اتنا قوی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اتنا زیادہ

اعتماد و بھروسہ ہے کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی جب وہ خرچ کرے گا تو بعد میں بھولے سے بھی یہ خیال آنے والا نہیں ہے کہ میں نے خرچ نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا؛ تو اس صورت میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

تو جو صدقہ استغناء کے ساتھ دیا گیا ہو یعنی جو چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کی گئی ہے، بعد میں اس کی طرف حرص باقی نہ رہے؛ وہ بہترین صدقہ ہے۔

”وَمَنْ يَسْتَعْنِ يُعْنِهِ اللَّهُ“ جو آدمی مستغنی بننا چاہتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو دوسروں سے مستغنی بنا دیتے ہیں۔ جب احادیث میں سوال کرنے کی ممانعت آئی ہے تو اب اپنے آپ کو سوال سے بچانے کے لیے کون سی تدبیر اختیار کرے اور استغناء والی صفت کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اسی کو بتایا گیا: ”مَنْ يَسْتَعْفِفْ“ یعنی جو اپنے آپ کو بے تکلف سوال سے بچائے گا۔ دوسری روایت میں ”مَنْ يَتَعَفَّفُ“ بھی آیا ہے یعنی ہمت و ارادہ کر کے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچائے گا۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ حالات کے پیش نظر ایسی نوبت آجائے کہ اس کا نفس یہ کہے کہ لوگوں سے مانگ لو، ایسے حالات میں بھی وہ اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہوئے ہمت سے کام لے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، گویا حالات اور نفس کے تقاضہ کے باوجود بے تکلف سوال کرنے سے اپنے آپ کو روکتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو صفتِ عفت و استغناء عطا فرمادیتے ہیں۔

اوصافِ کمال حاصل کرنے کا طریقہ

دنیا میں کمال کے جتنے بھی اوصاف ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو محنت اور مجاہدہ سے کام لینا پڑتا ہے، ریاضت کرنی پڑتی ہے، کچھ مشقت اٹھانی پڑتی ہے؛ تب ہی وہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرنا

چاہتا ہے، تو اس صفت کو پیدا کرنے کے لیے کچھ مشقت اٹھانی پڑے گی، انسان کی طبیعت تو اس کو بے صبری پر آمادہ کرے گی، نفس اُبھارے گا، حالات بھی ایسے ہو سکتے ہیں کہ وہ بے صبری کا اظہار کرے، لیکن اس کو چاہیے کہ ہمت سے کام لے کر، بہ تکلف اپنی ذات پر جبر کر کے، نفس پر دباؤ ڈال کر صبر سے کام لے؛ جب ایسا کرتا رہے گا تو دھیرے دھیرے یہ صفت اس کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح عفت کی صفت کا حال بھی ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اسی کو کہا گیا کہ جو آدمی لوگوں سے اپنے آپ کو مستغنی اور بے پرواہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو صفتِ غنی عطا فرما دیتے ہیں۔ یعنی حالات اور حوادث تو اس کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی محتاجی کا اظہار کرے، لیکن اگر وہ ہمت سے کام لے کر اور ذرا مجاہدہ و مشقت برداشت کر کے اپنے آپ کو اس سے بچائے گا، تو دھیرے دھیرے صفتِ غنی یعنی اس کے دل کے اندر بے نیازی کی صفت اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیں گے۔ کسی بھی صفت کو حاصل کرنے کے لیے آدمی ارادہ کر لے کہ مجھے اپنے اندر اس صفت کو پیدا کرنا ہے، اس کے بعد ہمت سے کام لے۔ بس! یہ دو کام کرے گا تو پھر ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ وہ اس صفت کو پورے طور پر حاصل کر لے گا۔

دنیوی اعتبار سے بھی جو کمالات ہوا کرتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کوئی بھی آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے کمالات لے کر پیدا نہیں ہوتا، البتہ قدرتی صلاحیتیں اس کے اندر ہوتی ہیں، انہی صلاحیتوں کے اوپر محنت کر کے اگر ان کو اُجاگر کرتا ہے، تو وہ ان صفات اور کمالات کو حاصل کر لیتا ہے، چاہے وہ دنیوی ہوں یا اخروی ہوں۔

یہاں پر بھی عفت اور غنی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا کہ شروع میں آدمی کو

ارادہ و ہمت سے کام لے کر اپنی ذات پر کچھ جبر کرنا پڑے گا، بوجھ ڈالنا پڑے گا، ہمت سے کام لینا پڑے گا؛ جب بار بار ایسا کرتا رہے گا تو پھر ایک وقت آئے گا کہ یہ چیز اس کی طبیعت بن جائے گی۔

جیسے بھوک ہم برداشت تو نہیں کر سکتے، لیکن اگر ہم دھیرے دھیرے عادت ڈالیں کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا، دوسرے وقت نہیں کھایا، تیسرے وقت نہیں کھایا؛ تو بھوک برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے گی، اور ایک وقت آئے گا کہ پھر چار پانچ وقت کے بعد بھی آدمی کو بھوک کی تکلیف نہیں ہوتی۔ شروع میں بہت بے چینی ہوتی تھی لیکن جب عادت پڑ گئی تو طبیعت پر کوئی بے چینی نہیں ہے۔ ہر چیز کا یہی حال ہے۔

سوال کرنے والوں کے لیے خاص ہدایت

۵۲۸:- وَعَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: (لَا تَلْجِفُوا فِي الْمَسْأَلَةِ، فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَسْأَلُنِي أَحَدٌ مِنْكُمْ شَيْئًا، فَتُخْرِجَ لَهُ مَسْأَلَتَهُ مِنْي شَيْئًا، وَأَنَالَهُ كَارَةً، فَيُبَارِكُ لَهُ فِيمَا أُعْطِيَتْهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سوال کرنے میں اصرار سے کام نہ لو۔ اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی آدمی مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے اور مجھ سے کوئی چیز نکلوالے، حالانکہ میں دینا نہیں چاہتا تھا، تو پھر جو میں دیتا ہوں اس میں اس کو برکت عطا نہیں ہوتی۔

افسادات:- نبی کریم ﷺ کے پاس لوگ اپنی اپنی حاجتیں لے کر آتے تھے، جیسے: بڑوں کے پاس جاتے ہیں، یا جو لوگ دوسروں کی حاجتیں پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں ان کے پاس بھی لوگ پہنچتے ہیں؛ ایسے لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے

ہدایت فرمائی کہ اپنی ان حاجتوں کو پورا کروانے کے لیے مانگنے میں اصرار نہ کیا کرو، کسی سے لپٹ کر نہ مانگو۔ جیسے بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ جس کے سامنے وہ اپنی حاجت پیش کرتے ہیں، تو گویا اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں، جب تک وہ ان کی حاجت کو پورا نہ کرے وہاں تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے، اس کو تنگ کر کے رکھ دیتے ہیں، بہت سی مرتبہ تو وہ آدمی عاجز آ کر اور مجبور ہو کر اس کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ شریف آدمی کے ساتھ جب اصرار کا معاملہ کیا جاتا ہے تو باوجود جی نہ چاہنے کے بھی وہ دے دیتا ہے۔

بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی حاجت مند کی حاجت اور حالت کا جائزہ لے کر خود ہی برضا و رغبت اس کی مانگ کو پورا کرتا ہے؛ تب تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اور وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ اپنی حاجت کی جتنی مقدار بتا رہا ہے، اس کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے، اور وہ امداد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، لیکن یہ اس کے پیچھے پڑ کر زبردستی اس کے پاس سے نکلواتا ہے؛ تو پھر اس میں اس کو برکت عطا نہیں ہوتی۔ گویا جو مال جبراً نکلوا یا جاتا ہے وہ مال بغیر کسی فائدہ کے ضائع ہو جاتا ہے، اور وہ آدمی دوبارہ لوگوں سے سوال کرنے لگتا ہے، اس طرح سوال کر کے درحقیقت وہ آدمی اپنے مسئلہ کو بجائے حل کرنے کے اور زیادہ الجھا رہا ہے، ضرورت تو اس بات کی تھی کہ وہ صبر سے کام لیتا اور عفت اختیار کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی راستہ کھول دیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی حاجت مند ہو؛ تب بھی اپنی حاجت کا سوال کرنے میں اصرار سے کام نہیں لینا چاہیے۔

سوال نہ کرنے پر نبی کریم ﷺ کی بیعت

۵۲۹:- وعن أبي عبد الرحمن عوف بن مالك الأشجعي رضي الله عنه قال:

كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ تِسْعَةً أَوْ ثَمَانِيَةً أَوْ سَبْعَةً. فَقَالَ: أَلَا تَبَايَعُونَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ. وَكُنَّا حُدَيْبِيَّ عَهْدٍ بِبَيْعَةٍ. فَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ. ثُمَّ قَالَ: أَلَا تَبَايَعُونَ رَسُولَ اللَّهِ. فَبَسَّطْنَا أَيْدِيَنَا. وَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ فَعَلَامَ نُبَايِعُكَ؟ قَالَ: عَلَى أَنْ تَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً، وَالصَّلَاةِ الْخَمْسِ، وَتُطِيعُوا اللَّهَ (وَأَسْرَ كَلِمَةً خَفِيْفَةً) وَلَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئاً. فَلَقَدَرَأَيْتُ بَعْضَ أَوْلِيَاكَ النَّفْرِ يَسْقُطُ سَوْطَ أَحَدِهِمْ، فَمَا يَسْأَلُ أَحَدًا أَيَّنَا وَلَهُ إِثْمًا. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح: - حضرت ابو عبد الرحمن عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

فرماتے ہیں کہ ہم نویا آٹھ یا سات آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضور اکرم ﷺ نے از خود ارشاد فرمایا: تم لوگ اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتے؟ (عوف بن مالک کہتے ہیں کہ) ہم نے ابھی تازہ تازہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی (یعنی ہمیں بیعت ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا اور پھر حضور ﷺ یہ فرما رہے تھے کہ تم اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتے؟ تو) ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو چکے ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم لوگ اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتے؟ (جب حضور ﷺ نے دوسری مرتبہ فرمایا) تو ہم نے بیعت ہونے کے لیے اپنے ہاتھ آگے بڑھادیئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوتے ہیں (ارشاد فرمائیے) آپ کس چیز پر ہم سے بیعت لینا چاہتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تم کو بیعت کر رہا ہوں اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، پانچوں نمازیں اپنے وقت پر ادا کرو گے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرو گے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ایک بات بہت آہستہ ارشاد فرمائی: کسی سے کچھ نہیں مانگو گے۔ حضرت عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو حضرات نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے ان میں سے

بعضوں کو دیکھا کہ وہ حضرات اس عہد و پیمان کا اتنا زیادہ لحاظ کرتے تھے، اس پر عمل کا اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا، اس کا کوڑا نیچے گر جاتا تو وہ کسی سے مانگتا نہیں تھا (کہ میرا کوڑا دے دو) بلکہ خود اتر کر لیتا تھا (اس لیے کہ یہ بھی کسی سے مانگنا اور سوال کرنا ہوا اور انہوں نے سوال نہ کرنے کا نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر عہد و پیمان کیا تھا۔)

افادات:- بیعت؛ ایک طرح کا عہد و پیمان ہوتا ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کرتا ہے اور جس کے ہاتھ پر بیعت ہو رہا ہے اس کو اپنے اس عہد و پیمان پر گواہ بناتا ہے کہ میں یہ کام کروں گا اور یہ کام نہیں کروں گا۔ سوال کی ممانعت کو بتلانے کے لیے اس روایت کو یہاں لائے ہیں۔

مانگنے کی عادت پر سزا

۵۳۰:- عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أن النبی ﷺ قال: لا تَزَالُ الْمَسْأَلَةُ بِأَحَدٍ كُمْ حَتَّى يَلْقَى اللَّهَ تَعَالَى وَلَيْسَ فِي وَجْهِهِ مُرْعَةٌ لِحِمٍّ. (متفق علیہ)
 ((المُرْعَةُ)) بضم الميم وإسكان الزاي وبالعين المهملة: القِطْعَةُ.
ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جس شخص کو مانگنے کی عادت ہو جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت نہ ہوگا۔

اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ

۵۳۱:- وعنه أن رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ، وَذَكَرَ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ، الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ

الْمُنْفِقَةُ، وَالسُّفْلَى هِيَ السَّائِلَةُ. (متفق علیہ)

ترجمہ: - حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے منبر پر تشریف فرما ہونے کی حالت میں اپنی تقریر میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا تذکرہ کیا، اور سوال سے بچنے کا بھی تذکرہ کیا (کہ کسی سے سوال مت کرو۔ اس میں یہ بھی فرمایا) اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے والا ہاتھ ہے، اور نیچے والا ہاتھ وہ لوگوں سے سوال کرنے والا ہاتھ ہے۔

اس روایت میں اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ کس کو کہتے ہیں وہ خود نبی کریم ﷺ نے بتلادیا ہے۔

وہ کیا جمع کر رہا ہے؟

۵۳۲: - وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: مَنْ سَأَلَ النَّاسَ تَكَثُّراً فَإِنَّهُ يَسْتَلُّ بَحْرًا، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثُرْ. (رواه مسلم)

ترجمہ: - حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے مال میں اضافہ کرنے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے، تو گویا وہ اپنے لیے انگارے جمع کر رہا ہے۔ اب اس کی مرضی کی بات ہے، چاہے کم مانگے، چاہے زیادہ مانگے۔

افادات: - بعض لوگوں کی سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے، گویا انہوں نے سوال کرنے اور مانگنے ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا ہے، جیسے آج کل ایک طبقہ ہے جو اسی لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے کہ مانگ کر مال اکٹھا کرے، حالاں کہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ان کے پاس بہت کچھ موجود ہوتا ہے۔

نصاب کی تین قسمیں

دیکھو! کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ نصاب تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک

نصاب تو وہ ہے جس میں آدمی کے اوپر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ قربانی و صدقہ فطر واجب ہوتا ہے؛ ایسا آدمی زکوٰۃ کا مال اور واجب صدقات نہیں لے سکتا۔ اس کا نصاب یہ ہے کہ کسی آدمی کے پاس ۸۷ گرام اور ۳۵۰ ملی گرام سونا، یا ۶۱۲ گرام اور ۳۵۰ ملی گرام چاندی ہو، یا اسی کے بقدر پیسے ہوں، یا تجارت کا اتنا سامان ہو، اور اس پر کچھ قرض بھی نہ ہو؛ تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ بھی فرض ہے، صدقہ الفطر بھی واجب ہے، اور قربانی بھی واجب ہے۔ ایسا آدمی کسی سے زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ یہ تو پہلے نمبر کا نصاب ہوا۔

دوسرا نصاب

دوسرے نمبر کا نصاب یہ ہے کہ جس میں آدمی کے اوپر قربانی اور صدقہ الفطر واجب ہوتا ہے، اور وہ آدمی زکوٰۃ بھی نہیں لے سکتا، لیکن اس کے اوپر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی مثلاً کسی کے پاس سونا چاندی تو نہیں ہے، روپے بھی نہیں ہیں، تجارت کا سامان بھی نہیں ہے، لیکن گھر میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ سامان موجود ہے، جیسا کہ آج کل عام طور پر کچھ زائد چیزیں بطور شو کے گھروں میں رکھنے کا مزاج بنا ہوا ہے؛ اسی کو لایعنی کہتے ہیں۔

لا یعنی کی ایک اور قسم

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مِنْ حَسَنِ السَّلَامِ الْمَرْءُ تَرَكُهُ مَسَا لَا يَحْنِيهِ" آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چھوڑ دے۔ عام طور پر شراح حدیث لایعنی کا مطلب بے کار کام اور بے کار بات بتاتے ہیں۔ یعنی جس میں نہ دنیاوی اعتبار سے کوئی فائدہ ہو، نہ آخرت کے اعتبار سے کوئی فائدہ ہو، ایسی بات اور

ایسے کام کو لایعنی کہتے ہیں، لیکن آج کل لایعنی کی ایک اور قسم ”لا یعنی اشیاء“ نکلی ہے، مثلاً گھر کے کونہ میں بہت بڑا پوٹ رکھا ہوا ہے۔ پہلے زمانہ میں اس میں پانی بھر کر رکھا جاتا تھا، لیکن آج کل وہ صرف شو کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اور بھی بے شمار چیزیں ایسی ہونے لگی ہیں جو کسی کام کی نہیں ہوا کرتیں، اور ہزاروں روپیہ اس پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر یہی روپیہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا گیا ہوتا، کسی نیکی کے کام میں لگایا گیا ہوتا، صدقہ جاریہ میں استعمال کیا گیا ہوتا؛ تو کتنا اجر و ثواب ملتا۔ اس وقت ہمارے معاشرہ اور سوسائٹی میں محض دکھلاوے کے لیے ہم نے اس طرح کی کچھ چیزیں اپنے ذہن سے گھڑ لی ہیں کہ ہمارے گھر میں شو کا سامان ہوگا تب ہی یوں سمجھا جائے گا کہ نشاط سوسائٹی (اُس جگہ کا نام جہاں حضرت کی مجلس ہوا کرتی ہے) میں مکان بنا کر رہنے کے قابل ہے، ورنہ یہاں رہنے کے قابل نہیں۔ تو بھائیو! ہم نے ایسا جو مزاج بنایا ہے شریعت اس کو پسند نہیں کرتی۔ ہم اس کو حرام تو نہیں کہیں گے لیکن اس کو پسندیدہ بھی قرار نہیں دیا گیا ہے، یہ بے کار چیزیں ہیں، جن سے کوئی حاصل نہیں ہے۔

ضرورت کی چیز کیا ہے؟

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی کے پاس ضرورت سے زائد چیز ہو۔ اور ضرورت کی چیز کیا ہے؟ دو چار پتیلیاں جو کھانا پکانے کے کام آتی ہیں اور چند پلیٹ اور پیالے جو کھانا کھانے کے کام آتے ہیں۔ یہ چیزیں بھی ہمارے حساب سے ہیں، ورنہ آپ کو یاد ہوگا، میں نے پہلے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ بیان کیا تھا کہ ان کے پاس مٹی کا صرف ایک پیالہ تھا، وہی کھانا کھانے کے لیے اور وہی پانی پینے کے لیے تھا۔ تو استعمال کی کچھ چیزیں، پہننے کے کچھ لباس، اور کچھ ضروری چیزیں بستر وغیرہ ہوں۔ یہ

ضرورت کی چیزیں ہیں۔

چوتھا بستر شیطان کا

حدیثِ پاک میں تو یہاں تک آتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس تین بستری ہونے چاہئیں، ایک اپنا، دوسرا بیوی کا، تیسرا مہمان کا۔ اگر چوتھا بستر ہے تو وہ شیطان کا ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب اللباس) اس سے نبی کریم ﷺ ہمیں یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جو چیزیں بھی زائد ہیں وہ سب شیطان کے نام پر ہیں، شیطان اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایسی زائد چیزوں کے لیے عام طور پر حدیثِ پاک میں شیطان ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ شیطان کے لیے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اس کے حق میں اجر و ثواب کی نہیں ہے، بلکہ اس کا مال بے کار ضائع ہو رہا ہے۔ بہر حال! ضرورت سے زائد تمام چیزیں اس میں داخل ہیں۔

جس کے یہاں ٹی وی ہو؛ اس کو زکوٰۃ دینا

تو اگر ضرورت سے زائد چیزوں کی قیمت ۶۱۲ گرام اور ۳۵۰ ملی گرام چاندی کے برابر ہو جاتی ہے، تو اس کے اوپر قربانی واجب ہے، اور صدقۃ الفطر بھی واجب ہے، ایسا آدمی زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اب مثلاً کسی کے گھر میں ٹی وی (TV) ہے تو سب جانتے ہیں کہ ٹی وی (TV) ضروریاتِ زندگی میں سے نہیں ہے۔ اگر اس ٹی وی (TV) کی قیمت چاندی کے نصابِ جتنی ہے؛ تو ایسے آدمی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، سیدھی سادی بات ہے۔ اگر ایسے آدمی کو زکوٰۃ دو گے تو ادا نہیں ہوگی۔ اس طرح کی اور بھی زائد چیزوں کا یہی حکم ہے۔

اس لیے زکوٰۃ دینے والے کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ پہلے دیکھ لے کہ جس کو

زکوٰۃ دے رہا ہے وہ حقدار بھی ہے یا نہیں؟ البتہ اگر وہ مقروض ہے اور اس پر اتنا زیادہ قرضہ ہے کہ اس کو ادا کرنے بعد اس کے پاس جو سامان رہتا ہے اس کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی، مثلاً دس لاکھ کا مقروض ہے، تو اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

جس پر صدقہ فطر واجب؛ اس پر قربانی واجب

دیکھو! ہمارے معاشرہ میں لوگوں نے بہت سے مسئلے اپنے ذہن سے بنا رکھے ہیں۔ بہت سوں کے پاس اس نوع کا نصاب ہوتا ہے اور ان پر قربانی واجب ہوتی ہے، وہی لوگ رمضان کے مہینہ میں صدقہ الفطر دیتے ہیں، لیکن قربانی کے زمانہ میں قربانی نہیں کرتے۔ ان سے پوچھو تو کہیں گے کہ صدقہ الفطر واجب ہے، پھر اگر انہی سے کہیں کہ قربانی بھی واجب ہے، تو کہیں گے کہ قربانی واجب نہیں ہے۔ یہ اپنے طور پر ہی فتویٰ دے رہے ہیں، حالانکہ کتابوں میں صدقہ الفطر اور قربانی میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے، جس پر صدقہ الفطر واجب ہے، اس پر قربانی بھی واجب ہے، اور جس پر صدقہ الفطر واجب نہیں، اس پر قربانی بھی واجب نہیں، لیکن لوگوں نے دونوں کو الگ کہاں سے کیا، یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر! یہ دوسرا نصاب ہے۔

تیسرا نصاب

تیسرا نصاب کتابوں میں لکھا ہے، اور دراصل میں اسی کو بتلانا چاہتا تھا کہ کسی کو آج اپنی اور اپنے ماتحتوں؛ بیوی، بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کھانے پینے کا سامان میسر ہے؛ تو یہ آدمی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا، کسی سے سوال نہیں کر سکتا، ایسے آدمی کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔ اس کو حرامت سوال (سوال کے حرام ہونے) کا نصاب کہتے ہیں۔ علماء نے کتب فقہ میں باقاعدہ تیسری قسم کا یہ نصاب لکھا ہے۔

یہ پیسے نہیں، انگارے ہیں

اب اگر کوئی کہے کہ اس کے پاس آئندہ کل کے لیے کچھ نہیں ہے؛ تب بھی نہیں مانگ سکتا؟ تو اس سے کہیں گے کہ بھائی! جب کل آئے اور اس وقت اگر کچھ نہ ہو تو مانگے، لیکن آج سے کیوں مانگتا ہے؟ جیسے بھیک مانگنے والے کرتے ہیں۔ آج کل کے جو بھیک منگتے ہیں وہ سب کیا بھوکے مر رہے ہیں؟ نہیں۔ بلکہ آپ تو اخباروں میں پڑھتے ہی ہوں گے کہ بھیک منگوں کی موت آتی ہے تو وہ ہزاروں لاکھوں روپے اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے جو لوگ سوال کرتے ہیں وہ صرف اپنے مال کو بڑھانے کے لیے سوال کرتے ہیں، ان کا سوال فقط مال کے اضافہ کے لیے ہوتا ہے۔ اور بعض مانگنے والے ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر سڑکوں کے اوپر کھڑے رہ کر بھیک نہیں مانگتے، لیکن انھوں نے بھی اپنی عادت بنالی ہوتی ہے، ان کی ضرورت کا ان کے پاس موجود ہوتا ہے، پھر بھی لوگوں سے مانگتے رہتے ہیں؛ وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی لوگوں سے سوال کرے تاکہ اس کے مال میں اضافہ ہو، ایسا آدمی گویا اپنے لیے انگارے جمع کر رہا ہے، اب اس کی مرضی کی بات ہے، چاہے کم مانگے، چاہے زیادہ مانگے۔ اس طرح سوال کر کے اور مانگ کر جتنے بھی پیسے آئیں گے، درحقیقت وہ پیسے نہیں ہیں، بلکہ جہنم کے انگارے ہیں۔ اس لیے سوال سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے کہ سوال کرنا حرام ہے۔

سوال کرنا چہرہ پر خراش ہے

۵۳۳:- وَعَنْ سَمِعَةَ بِنْتِ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّ

الْمَسْأَلَةَ كَذَّيْبُهَا الرَّجُلُ وَجَهَهُ إِلَّا أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَانًا أَوْ فِي أَمْرٍ لَا بُدَّ

مِنْهُ. (رواہ الترمذی، وَقَالَ: حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ) (الْكُدُّ: الْحَدُّشُ وَتَحْوُهُ)

ترجمہ:- حضرت سمیرہ بن جناب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سوال کرنا آدمی کے چہرہ پر خراش ہے جس کے ذریعہ سے آدمی اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے، مگر یہ کہ آدمی کسی حاکم سے سوال کرے، یا کسی ایسی چیز کے لیے سوال کرتا ہے کہ جس کے بغیر چارہ کار نہیں۔

افادات:- ناخن جب چہرے پر مارے جاتے ہیں تو اس کی وجہ سے چہرے پر خراش اور زخم پڑ جاتے ہیں، ایسے آدمی کا چہرہ بھدّا اور بد صورت معلوم ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ لوگوں سے سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے چہرے کو زخمی کرنا۔ اور ایسا آدمی قیامت کے روز ایسی حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔

کن صورتوں میں سوال کی اجازت ہے؟

اور چوں کہ حاکموں کے ساتھ لوگوں کی حاجتیں متعلق کر دی گئی ہیں اس لیے حاکم کے سامنے اگر کوئی آدمی سوال کرتا ہے تو اس کے لیے یہ وعید نہیں ہے۔

یا کسی ایسی چیز کے لیے سوال کرتا ہے کہ جس کے بغیر چارہ کار نہیں، مثلاً کوئی آدمی مقروض ہو گیا، قرض کا دباؤ اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ اس کی ادائیگی کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے، اور قرض خواہوں کی طرف سے شدید تقاضا ہے، ایسی حالت میں اگر وہ اس کی ادائیگی کے لیے کسی سے مدد مانگے اور سوال کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یا روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے تو پیسے موجود ہیں، لیکن کوئی ایمر جنسی صورت پیش آگئی جیسے: اچانک ایکسیڈنٹ ہو گیا اور بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اب باپ کے پاس

اس کا علاج کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں، تو مجبوراً کسی کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔

فاقہ کہاں پیش کرنا چاہیے؟

۵۳۴:- وعن ابن مسعود رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: مَنْ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ فَأَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تُسَدَّ فَاقَتَهُ. وَمَنْ أَنْزَلَهَا بِاللَّهِ، فَيُوشِكُ اللَّهُ لَهُ بِرِزْقٍ عَاجِلٍ أَوْ آجِلٍ. (رواه ابوداود والترمذی وقال: حديث حسن)

(یوشیک) بکسر الشین: اُجی یُسرعُ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کو فاقہ پیش آیا (یعنی مال نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، اور اس کو ایک دو وقت بھوکا رہنا پڑا) پھر اس نے اپنے اس فاقہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا (یعنی لوگوں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا کہ میں تو بھوکے مر رہا ہوں، مجھے کچھ دو۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ) اس کا فاقہ بند ہونے والا نہیں ہے (مانگ کر وقتی طور پر تو ضرورت پوری ہو جائے گی، لیکن وہی ضرورت پھر دوبارہ پیدا ہوگی اور وہ ضرورت مند ہی رہے گا) اور جس نے اس فاقہ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ جلدی ہی اس کے فاقہ کو دور کریں گے، یا تو فوری روزی کے ذریعہ، یا بعد میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی اسباب مہیا کر دے گے (اور اس کی حاجت پوری ہو جائے گی۔)

نہ مانگنے پر جنت کی ضمانت

۵۳۵:- عن ثوبان رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: مَنْ تَكْفَّلَ لِيْ أَنْ لَا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئاً، وَأَتَكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ؟ فَقُلْتُ أَنَا. فَكَانَ لَا يَسْأَلُ أَحَدًا

شَیْئًا.

(رواہ أبو داود بإسناد صحیح)

ترجمہ:- حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مجھے اس بات کی گارنٹی دے کہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا، تو میں اس کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو اس بات کی گارنٹی اور ضمانت دیتا ہوں کہ میں کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی سے کوئی چیز مانگتے نہیں تھے (یہاں تک کہ کوڑا بھی زمین پر گر جاتا تو مانگتے نہیں تھے، بلکہ خود اتر کر لے لیا کرتے تھے۔)

سوال کرنا تین آدمیوں کے لیے جائز ہے

۵۳۶:- وَعَنْ أَبِي بَشِيرٍ قَبِيصَةَ بْنِ الْمُخَارِقِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: تَحَلَّلْتُ حِمَالَةَ، فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَسْأَلُهُ فِيهَا، فَقَالَ: أَعْمَ حَتَّى تَأْتِيَنَا الصَّدَقَةُ فَنَأْمُرَ لَكَ بِهَا. ثُمَّ قَالَ: يَا قَبِيصَةُ! إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ إِلَّا أَحَدًا ثَلَاثَةً: رَجُلٌ تَحْمَلُ حِمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَانِحَةٌ اجْتَا حَتَّ مَالَهُ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قَوْمًا مِنْ عَيْشٍ - أَوْ قَالَ: سَدَادًا مِنْ عَيْشٍ - وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُولَ ثَلَاثَةً مِنْ ذَوِي الْحِجْبِ مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ. فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قَوْمًا مِنْ عَيْشٍ - أَوْ قَالَ: سَدَادًا مِنْ عَيْشٍ - فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَا قَبِيصَةُ سَحَتْ، يَا كُلُّهَا صَاحِبُهَا سَحَتْ. (رواہ مسلمہ)

ترجمہ:- حضرت قبیسہ بن مخارق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بوجھ اپنے سر لیا تھا، اس سلسلہ میں کچھ مدد حاصل کرنے کے لیے میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ انتظار کرو، ہمارے پاس کہیں سے کوئی مال آئے گا تو ہم تمہیں دیں گے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: سوال کرنا (چندہ کرنا) جائز نہیں ہے، مگر تین آدمیوں کے لیے۔

ایک تو وہ جس نے کوئی بوجھ اپنے سر لیا ہو، اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ جنت ابو جہ اپنے سر لیا ہے وہ پورا کر لے، پھر سوال سے رک جائے۔ دوسرا وہ آدمی جس کو چانک کوئی مصیبت پیش آئی جس نے اس کا سارا مال ہلاک کر دیا، ایسے آدمی کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ اور تیسرا وہ آدمی جس کو فاقہ لاحق ہو اور اس کی قوم کے تین سمجھدار آدمیوں کے سامنے اس کے حالات ہوں جو اس کے متعلق گواہی دیں کہ واقعاً اس کو فاقہ ہے، تو اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے، لیکن اتنا ہی جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ یہ ارشاد فرمانے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: اے قبیلہ! اس کے علاوہ جو سوال کرتا ہے وہ سب حرام ہے، اور ایسا آدمی اپنے پیٹ میں حرام ڈال رہا ہے۔

افادات:- ”حَمَالَةٌ“ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی ایسی صورت پیش آتی ہے کہ دو گروہوں یا دو آدمیوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہو، ان کا جھگڑا ختم کرانے کے لیے کوئی آدمی صلح صفائی کی کوشش کرتا ہے، اس کوشش کے دوران ضرورت پیش آئی کہ وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لے، مثلاً ایک آدمی کے دوسرے کے اوپر دو لاکھ نکلتے ہیں، وہ مانگنے گیا تو اس نے کہا کہ میں نہیں دوں گا، اور دونوں میں لڑائی ہوئی، اس کے بھی رشتہ دار آئے، اُس کے بھی رشتہ دار آئے، اور لڑائی برابر چھڑ گئی، مقدمہ بازی ہوئی، کوئی بھی اپنا مقدمہ ہٹانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دو چار آدمی دونوں پارٹیوں کے پاس گئے کہ بھائیو! آپ کا جھگڑا کس چیز کا ہے؟ بتایا گیا: ایسی بات ہے کہ یہ ہمارے پیسے نہیں دیتے۔ دوسرے فریق سے پوچھا: تمہارے ذمہ ہیں یا نہیں؟ انہوں نے اقرار کیا کہ: ہاں! ہمارے ذمہ ہیں لیکن اس وقت دینے کے لیے ہمارے پاس نہیں ہیں اور ان لوگوں نے ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا، اس لیے ہم نہیں دیں گے۔ اب بیچ بچاؤ کرنے والا یوں کہہ دے کہ: اچھا بھائی! ایسا کرو کہ تم کچھ چھوڑ دو، میں پچاس ہزار اپنی

طرف سے تم کو دے دوں گا، لیکن یہ لڑائی ختم کرو۔ کبھی ایسی نوبت آتی ہے کہ جھگڑوں کو ختم کرانے، اور صلح صفائی کے واسطے آدمی کوئی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے: اس قسم کی ذمہ داری کو حدیث میں ”تَحْمَلَةُ“ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بھی نیکی کا کام ہے بشرطیکہ آدمی نباہ سکے۔ اور جو آدمی نبھانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو ایسی چیزوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ نیکی کا ہر کام استطاعت پر موقوف ہے جیسے: رات بھر جاگنے کی عادت اور طاقت نہیں، پھر بھی رات بھر جاگو گے تو دوسرے دن بیمار ہو جاؤ گے، ایسے آدمی سے یہی کہیں گے کہ رات بھر جاگنا تمہارا کام نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کا بوجھ اپنے سر لینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ جو کر سکتا ہو اسی کے لیے نیکی ہے۔

اور جو لوگ اس قسم کا بوجھ اپنے سر لیتے ہیں وہ احباب کے حلقے میں بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ ایسا جھگڑا ہوا تھا، میں نے پچاس ہزار کی ذمہ داری لے لی ہے، اب اس میں کون میری مدد کرے گا؟ اپنے دوسرے ساتھیوں سے ایسا مطالبہ کیا جاتا ہے، اس قسم کے سوال کے لیے عام ہاتھ نہیں پھیلا یا جاتا، بلکہ کچھ خصوصی لوگوں کے سامنے بات پیش کی جاتی ہے؛ تو ایسی اپیل کرنے کی بھی اجازت ہے۔

اسی طرح مدرسہ والے اور مہتمم صاحب بچوں کو مدرسہ میں داخلہ دیتے ہیں، اور بچوں کا بوجھ اپنے سر پر لے لیتے ہیں کہ ان کا کھانا پینا رہائش کا سارا انتظام ہم کریں گے، اور اسی بوجھ کو پورا کرنے کے لیے وہ چندہ کے لیے نکلتے ہیں؛ وہ بھی ”تَحْمَلُ“ میں داخل ہے۔ یا رہا عام کے کام کرنے والے ذمہ دار حضرات درخواست کرتے ہیں، مثلاً: کسی ہسپتال، یا کسی ادارے کے ذمہ دار لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے چندہ کی اپیل کرتے ہیں؛ وہ بھی ”تَحْمَلُ“ میں داخل ہیں۔

دوسرا وہ آدمی جس کو اچانک کوئی ایسی مصیبت پیش آئی جس نے اس کا سارا

مال ہلاک کر دیا؛ ایسے آدمی کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ مثلاً: قومی فساد ہوا، بڑا مالدار آدمی تھا، تاجر بھتا، لیکن فساد یوں نے سب کچھ لوٹ لیا، کاروبار کو آگ لگا دی، اور وہ بچپارہ فٹ پاتھ پر آ گیا، اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔

یا سیلاب آیا اور اس میں اس کا سب کچھ بہہ گیا۔ یا آگ لگ گئی، اس میں سب جل کر راکھ ہو گیا اور کچھ بھی نہیں بچا؛ تو ایسا آدمی بھی اتنا سوال کر سکتا ہے کہ جس سے وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اور جس سے معیشت اور گزران ٹھیک ہو جائے۔ اور تیسرا وہ آدمی جس کو فاقہ لاحق ہو، اور اس کی قوم کے تین سمجھدار آدمیوں کے سامنے اس کے حالات ہوں اور وہ اس کے متعلق گواہی دیتے ہوں کہ واقعتاً اس کو فاقے ہیں؛ تو اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز ہے۔ لیکن اتنا ہی جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ ویسے فاقہ کا دعویٰ تو ہر آدمی کر سکتا ہے کہ میرے فاقے چل رہے ہیں، جو بھکاری ہوتے ہیں وہ بھی اپنے فاقے ہی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

حقیقی مسکین کی پہچان

۵۳۷:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: لَيْسَ الْمَسْكِينُ الَّذِي يَطْوِفُ عَلَى النَّاسِ تَرْدُهُ اللَّقْمَةَ وَاللُّقْمَتَانِ، وَالثَّمْرَةَ وَالثَّمْرَتَانِ، وَلَكِنَّ الْمَسْكِينِ الَّذِي لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيهِ، وَلَا يُفْطِنُ لَهُ فَيَتَّصِدُقَ عَلَيْهِ، وَلَا يَقُومُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے پاس سوال کے لیے چکر لگاتا رہے اور ایک دو لقمے یا ایک دو

کھجوریں اس کو لوگوں کے دروازوں سے آگے بڑھادیں، بلکہ حقیقت میں ضرورت مند اور مسکین وہ آدمی ہے جس کے پاس اتنا نہیں ہے جس سے وہ اپنی ضرورت پوری کر سکے، اور (ساتھ ہی) اس نے اپنی حالت بھی ایسی نہیں بنائی ہے کہ کسی کو پتہ چلے کہ وہ اس کی ضرورت پوری کر دے، اور کہیں کھڑے رہ کر لوگوں سے سوال بھی نہیں کرتا۔

افادات:- بھیک مانگنے والے کو آپ دو پیسے دیدیں تو وہ آگے چل دیتا ہے، روٹی کا ایک ٹکرا دے دو تو آپ کا پیچھا چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا، ایسا آدمی مسکین اور ضرورت مند نہیں ہے، وہ تو مانگ کر اپنی ضرورتیں پوری کر رہی رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ حقیقی معنی میں مسکین (جس کے اوپر صدقہ کرنے کی قرآن پاک میں تاکید آئی ہے) کہلانے کا حقدار وہی آدمی ہے جس کی ظاہری حالت سے بالکل پتہ نہ چلے کہ وہ مستحق بھی ہے۔ اس لیے مال خرچ کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ جس شخص کو نبی کریم ﷺ نے حقیقی معنوں میں مسکین کہا ہے اس کا پتہ چلا کر اس تک مال کو پہنچائیں۔

خرچ کرنے والوں کا فریضہ

اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب وہ مانگتا نہیں ہے، اور اس نے ظاہری طور پر اپنی حالت بھی ایسی نہیں بنائی ہے جس سے اندازہ ہو؛ تو ایسے آدمی کا پتہ چلانا کیسے ممکن ہے؟ اگر وہ سوال کرے تب تو پتہ بھی چلے کہ وہ حق دار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے وسائل اور ذرائع سے ایسے لوگوں کے حالات کی تحقیق کریں اور معلوم کریں، اور اپنے مال کو صحیح ٹھکانے پر پہنچانے کے لیے ان تک صدقہ پہنچانے کی کوشش کریں، یہ مال خرچ کرنے والوں کا فرض اور ذمہ داری ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو زیادہ ثواب کے حقدار ہوں گے۔ اسلاف کے حالات جب ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ

اس کا نہایت اہتمام کیا کرتے تھے۔

ادھر بھی توجہ دیں

آج کل تو صدقہ کہاں کرنا چاہیے اور اس کا زیادہ حقدار اور صحیح مصرف کون ہے اس کو معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ رمضان المبارک میں بہت سے لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں تو ان کے دروازہ پر بھیک مانگنے والے جمع ہو جاتے ہیں، وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ مال موجود ہے پھر بھی وہ لوگ انہیں کو زکوٰۃ کا مال دیدیتے ہیں، حالاں کہ اپنے ہی محلے، بستی اور علاقے میں بہت سارے ضرورت مند لوگ فاقوں میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں، وہ محتاج اور مقروض ہیں، لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ صدقہ کرنے والوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اپنے وسائل استعمال کر کے حقیقی ضرورت مندوں کے بارے میں آگاہی حاصل کریں اور ان پر خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا اہتمام کریں۔

اللہ تعالیٰ سب کو توفیق واہتمام نصیب فرمائے۔

دعا

اے اللہ! قناعت اور سوال سے بچنے کی صفت ہمیں نصیب فرما، اے اللہ! تیرے دئے ہوئے پر راضی رہنے کا وصف ہمیں عطا فرما۔ اے اللہ! بے صبری، جزع فزع اور طمع و حرص سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ دنیا اور مال و جاہ کی محبت سے ہمارے دلوں کو پاک اور صاف فرما۔ ہماری ضروریات کی خزانہ غیب سے کفالت فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ نے جن اوصاف و کمالات کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے حصول

کی ترغیب دی ہے، وہ تمام اوصاف و کمالات محض اپنے فضل سے بلا استحقاق ہمیں نصیب فرما۔ اور وہ تمام برائیاں جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، اے اللہ! محض اپنے فضل سے ان سے بچنے کا اہتمام نصیب فرما، اور محض اپنے فضل سے ان سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہو جا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری حفاظت فرما۔ ہمارے بیماروں کو صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ مقررہ قرضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ قید و بند میں مجوسین کو رہائی نصیب فرما، مقدمات میں ماخوذوں کو بری فرما۔ اے اللہ! جو جس مصیبت میں گرفتار ہے اس کو اس سے نجات عطا فرما۔ اے اللہ! پورے عالم میں جہاں کہیں بھی مسلمان آزمائش، پریشانیوں اور مصائب کا شکار ہیں ان کو عافیت نصیب فرما۔ اے اللہ! اسباب لعنت و غضب سے اُن کی پوری پوری حفاظت فرما کر اسباب رحمت و مغفرت اختیار کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔ حبیب پاک ﷺ نے جتنی بھی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی، وہ ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما، اور جن شرور و برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے حفاظت فرما۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت
التواب الرحيم۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ
أجمعین، برحمتك یا ارحم الراحمین۔

جواز الاخذ من غیر مسألة
 ولا تطلع الیہ
 بغیر سوال اور اشرفِ نفس کے کوئی
 چیز ملے، اس کو لینا

۱۵/ ربیع الاول ۱۲۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۷/ جون ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ. وَنَعُوْذُ
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ
 یُّضِلُّهُ فَلَا هَادِیَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَیِّدَنَا
 وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ نَسْلَبُ
 كَثِیْرًا كَثِیْرًا. أما بعد:

باب کا عنوان

پہلے ایک عنوان قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ملے اس پر آدمی قناعت
 اختیار کرے اور اپنے آپ کو بلاوجہ سوال سے بچانے کا اہتمام کرے۔ سوال کی جو
 مذمت اور برائی احادیث میں آئی ہے، وہ بیان ہو چکی۔ اب اسی مناسبت سے ایک اور
 باب قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی
 چیز بغیر سوال کے، یا بغیر کسی تدبیر کے آجائے۔ نہ تو اس نے کوئی مطالبہ کیا، نہ اس کی
 طرف کوئی لالچ رکھی، اس کے دل میں اس کا کوئی خیال بھی پیدا نہیں ہوا، اور اللہ تعالیٰ
 نے کوئی چیز بھیج دی؛ تو پھر اس کو لینا چاہیے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں روایت لائے ہیں۔

بغیر اشرف و سوال کے کچھ ملے تو؟

۵۳۸:- عن سالم بن عبد اللہ بن عمر، عن أبيه عبد اللہ بن عمر، عن
 عمر رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِينِي الْعَطَاءَ، فَأَقُولُ: أَعْطَاهُ مَنْ هُوَ أَفْقَرُ
 إِلَيْهِ مِنِّي. فَقَالَ: خُذْهُ، إِذَا جَاءَكَ مِنْ هَذَا الْمَالِ شَيْءٌ وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْتَرِفٍ وَ
 لَا سَائِلٍ، فَخُذْهُ فَتَمَبَّوْهُ. فَإِنْ شِئْتَ كُلَّهُ، وَإِنْ شِئْتَ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَالًا، فَلَا تُتْبِعْهُ

نَفْسِكَ. قَالَ سَالِمٌ: فَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ لَا يَسْأَلُ أَحَدًا شَيْعًا، وَلَا يُؤَدُّ شَيْعًا أُعْطِيَهُ.

ترجمہ:- حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر اپنے والد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں اور وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مجھے کوئی بخشش یا عطیہ عنایت فرماتے، تو میں عرض کرتا: اے اللہ کے رسول! آپ کی اس بخشش اور عطیہ کا جو آدمی مجھ سے زیادہ حاجت مند ہے آپ اس کو عنایت فرمائیے۔ اس پر نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے: میں جو دے رہا ہوں وہ لے لو (پھر نبی کریم ﷺ نے ایک ہدایت فرمائی کہ دیکھو!) مال کے قبیل سے کوئی چیز اگر تمہارے پاس آئے، اور اس چیز کے متعلق تم نے اپنے دل میں کوئی تمنا بھی نہیں کی تھی، اور نہ ہی زبان سے سوال کیا تھا؛ تو اس کو لے لو اور مالک بن جاؤ، پھر چاہو تو صدقہ کر دو۔ اور اگر زبانی یا دلی طلب کے بغیر کوئی چیز نہ ملے تو پھر اپنے آپ کو اس کے پیچھے مت تھکاؤ۔ حضرت سالم فرماتے ہیں (چوں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر بہت زیادہ متبع سنت تھے، اس لیے) ان کا معمول یہ تھا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کرتے تھے اگر کوئی چیز کسی کی طرف سے بغیر سوال کے دی جاتی تو (اسی حدیث پر عمل کرنے کی غرض سے) اس کو رد بھی نہیں فرماتے تھے۔

افادات:- چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے قناعت کی فضیلت سن رکھی تھی، اور یہ بات بھی ان کے علم میں تھی کہ آدمی کو مال کی حرص نہیں کرنی چاہیے، اس لیے حضور اکرم ﷺ کے عطا فرمانے پر وہ یہ سمجھ کر کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ میری ضرورت کے لیے کافی ہے، آپ جو مجھے عطا فرما رہے ہیں اس کے حقدار میرے مقابلہ میں دوسرے ہیں؛ لہذا وہ عرض کرتے کہ یہ چیز آپ دوسروں کو عنایت فرمائیے۔ یہ عرض کر کے گویا وہ نبی کریم ﷺ کی اس بخشش اور عطیہ کو قبول کرنے سے معذرت کرتے، تو نبی کریم ﷺ ارشاد فرمایا کہ جو میں دے رہا ہوں وہ لے لو۔

بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی کو دیکھ کر اپنے دل میں سوچتا ہے کہ وہ مجھے فلاں چیز دیدے تو اچھا ہے۔ یعنی زبان سے تو اظہار نہیں کیا لیکن دل میں یہ جذبہ موجود ہے کہ فلاں آدمی مجھے بخشش اور ہدیہ کے طور پر کچھ دے؛ اسی کو اشرف کہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ نے نہ تو زبان سے سوال کیا، اور نہ دل میں ایسا کوئی خیال گزرا، اور وہ چیز تمہیں مل رہی ہے، تو اب تم اس چیز کو لے لو، اس کے مالک بن جاؤ۔ اس کے بعد اگر تمہیں ضرورت ہے تو اپنے استعمال میں لاؤ، اور اگر تمہیں ضرورت نہیں ہے تو کسی دوسرے کو دیدو، لیکن اس چیز کو واپس مت کرو۔ لیکن اس کے لیے دو شرطیں لگائی ہیں، ایک یہ کہ زبان سے سوال نہ کیا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ دل میں بھی خواہش اور طلب پیدا نہ ہوئی ہو۔ دلی اور زبانی طلب کے بغیر اگر کوئی چیز میسر آ جائے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے۔

یہ اشرف نہیں ہے

اب دلی طلب کے سلسلہ میں ایک تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی دل میں یہ سوچتا ہے کہ فلاں آدمی مجھے ہدیہ کرے، اور اس کی طرف سے نہ ملنے پر دل میں رنج و ملال بھی ہوتا ہے، اگر ایسی صورت ہے اور پھر کوئی آدمی کچھ دے رہا ہے، تو لینا جائز نہیں ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی عادت ہی ہے کہ آپ اس کے یہاں جاتے ہیں، یا آپ کا جب اس سے ملنا ہوتا ہے، تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ میں پیش کرتا ہے، اس کی اسی عادت کی وجہ سے آپ کے دل میں خیال آیا کہ یہ مجھے کوئی چیز دے گا، تو اس کے قبول کرنے کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ نقل فرماتے تھے کہ وہ پنجاب کے کسی شہر میں تشریف لے جایا کرتے تھے، وہاں کے نواب صاحب کے وزیر بھی عالم

تھے، اور وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دیا کرتے تھے اور یہ حضرات تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں جاتے وقت حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا: اچھا! ایک بات بتلاؤ، ہم وزیر صاحب کے یہاں جاتے ہیں اور ان کا معمول ہے کہ جب ہم جاتے ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ میں پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دل میں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ کچھ دیں گے؛ تو یہ اشرف تو نہیں ہے؟ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اچھا! آپ یہ بتاؤ کہ اگر وہ نہ دیں تو دل میں کوئی رنج و ملال پیدا ہوتا ہے؟ فرمایا: نہیں! بس ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عادت ہے تو وہ دیں گے، باقی اگر کچھ نہ دیں تو دل میں ذرہ برابر بھی ناراضگی اور ملال نہیں ہوتا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر تو یہ اشرف میں داخل نہیں ہے۔

ایک اہم سبق

دیکھو! حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ کے درجہ میں ہیں لیکن یہ حضرات اپنے نفس کے معاملہ میں اپنی ذات پر اعتماد نہیں کرتے تھے، جہاں اپنی ذات کا معاملہ ہوتا وہاں دوسروں سے پوچھا کرتے تھے، اس لیے کہ نفس اپنے لیے تو اچھی شکل ہی گھڑ لیا کرتا ہے، اپنے فعل کو تو اچھے محمل پر ہی محمول کیا کرتا ہے، اس لیے اپنے ذاتی معاملہ میں دوسروں سے پوچھا جائے۔

سلیقہ مند شاگرد کی ذکاوت..... واقعہ

اور اشرف ہی کے سلسلہ میں ایک واقعہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت“ میں نقل کیا ہے۔ ایک بڑے عالم تھے جو درس دے رہے تھے، ان کے اوپر فاقہ کی حالت گزر رہی تھی، ان کے چہرہ اور آواز سے

ظاہر ہو رہا تھا کہ کئی وقت سے فاقہ ہے۔ اگر کم مدت کا فاقہ ہو تو اس پر قابو بھی پایا جاسکتا ہے۔ خیر! ان کے پاس پڑھنے والوں میں ایک رئیس بھی تھے، انہوں نے جب استاذ کی یہ کیفیت دیکھی تو کسی بہانہ سے اجازت لے کر گھر گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد ایک خوان لے کر آئے جس میں کھانے پینے کی مختلف اشیاء تھیں اور استاذ کی خدمت میں پیش کیا۔ اب کئی وقت کا فاقہ تھا لیکن جب یہ لائے تو استاذ صاحب نے کہا: دیکھو! اس کا لینا میرے لیے جائز نہیں ہے اس لیے میں قبول نہیں کر سکتا، کیوں کہ جب تم مجھ سے اجازت لے کر یہاں سے اُٹھے، اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ میرے واسطے کچھ لینے جا رہے ہو۔ چوں کہ میرے دل میں اس کی طرف رغبت پیدا ہوئی تھی اور آپ لے کر آئے ہیں؛ تو یہ اشرف ہے؛ اس لیے میرے لیے اس کا قبول کرنا جائز نہیں۔ وہ شاگرد بھی سمجھدار تھے، جب استاذ نے منع کیا تو پورا خوان لے کر فوراً چلے گئے، استاذ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد پھر لے کر حاضر ہوئے اور کہا: حضرت! اب تو دل میں خیال نہیں رہا تھا؟ استاذ نے کہا: ٹھیک ہے اب نہیں رہا تھا تو عرض کیا: اب تو قبول فرما لیجئے۔ دیکھئے! ”محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی“ اسی کو کہتے ہیں۔

الحث علی الأكل من عمل یدہ

والتعفف بہ عن السؤال

والتعرض للأعطاء

کمانے کے لیے محنت کرنے

اور

سوال و سوالی جیسی صورت بنانے

سے بچنے کی ترغیب

۱۵ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۷ جون ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَكَسَبَتْ عَلْمَهُ وَكَسَبَتْ غُفْرَانَهُ وَتَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ وَنُصِرْتُ بِالْعَزْمِ
 مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ
 لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
 وَرَسُوْلُهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلَى اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد:-

روزی تلاش کرنے کی ترغیب

ایک اور عنوان قائم کیا ہے: اپنی روزی کے لیے اپنے ہاتھ سے محنت کرنے،
 دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچانے، اور سوالی کی سی حالت بنانے
 سے بچنے کی ترغیب۔

سوال کی دو شکلیں ہیں: ایک تو یہ کہ آدمی زبان سے کوئی چیز مانگے کہ مجھے دو۔ اور
 دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ زبان سے تو اظہار نہیں کرتا لیکن اپنی حالت ایسی ظاہر کرتا ہے
 جس سے دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کو کچھ دینا چاہیے، تو ان دونوں کی ممانعت ہے۔
 ایک آیت لائے ہیں: ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوا
 مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ جب نماز جمعہ پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی
 روزی تلاش کرو۔ چوں کہ اس آیت میں باری تعالیٰ نے روزی تلاش کرنے کی ترغیب
 دی ہے، اور ظاہر ہے کہ ہر ایک کو یہ بات کہی جا رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کی اپنے
 ہاتھ کی محنت کی کمائی زیادہ پسندیدہ ہے۔

خود کام کرنا بہتر ہے

۵۳۹:- وعن أبي عبد الله الزبير بن العوام رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ أَحْبَلَهُ ثُمَّ يَأْتِيَ الْجَبَلَ، فَيَأْتِي بِحُزْمَةٍ مِنْ حَطَبٍ عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبْدِعُهَا، فَيَكْفُ اللَّهُ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ، أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اپنی رسیاں اٹھائے (تا کہ لکڑیاں چن کر جمع کرے تو ان کو باندھنے کے کام آئے) اور پہاڑ پر جا کر لکڑیوں کا گٹھرا اپنی پیٹھ پر لاد کر لے آئے پھر بازار میں فروخت کرے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو دوسروں کے سامنے سوال کی بے عزتی سے بچائے؛ یہ اس بات سے بہتر ہے کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرے، پھر وہ چاہے تو دے، چاہے تو منع کر دے۔

۵۴۰:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: (لَأَنْ يَجْتَطِبَ

أَحَدُكُمْ حُزْمَةً عَلَى ظَهْرِهِ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ أَحَدًا، فَيُعْطِيَهُ أَوْ يَمْنَعَهُ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر لے کر آئے وہ اس کے لیے زیادہ مناسب ہے اس بات سے کہ کسی سے سوال کرے، پھر وہ چاہے تو دے، چاہے تو نہ دے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چن کر لا کر بازار میں

فروخت کرنا اور اس طرح دوسروں کے سامنے سوال کی بے عزتی سے بچنا زیادہ بہتر ہے

جیسا کہ پہلے بھی روایت آچکی ہے کہ سوال کے نتیجے میں قیامت کے روز چہرے پر

خراش نمایاں ہوگی۔ اور یہ آدمی محنت مزدوری کر کے اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے تو گویا

اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے اس کے چہرے کو بدنما ہونے سے بچا رہا ہے۔ اس لیے کہ

کوئی آدمی کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے تو اس بات کی کوئی گارنٹی تو ہے نہیں

کہ اس کا سوال پورا ہی کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نہ

دے۔ جب اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے رسوا کر کے بھی ضرورت پوری ہونے کی

گارنٹی نہیں ہے تو اس کے مقابلہ میں محنت مزدوری سے جو بھی حاصل ہو وہ زیادہ اچھا

ہے، اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے عزت تو رکھ لی۔

نبی اور بادشاہ بھی ہاتھ سے کماتے تھے

۵۴۱:- وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: كَانَ دَاوُدُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ عَمَلِهِ

(رواہ البخاری)

یٰۤاۤءِیۤہ۔

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: حضرت داود علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتے تھے۔

انسانیات:- حالاں کہ ان کے پاس بڑی بادشاہت تھی، ان کے ہاتھوں میں ملک کے خزانوں کی چابیاں تھیں، وہ مالک و مختار تھے، اس کے باوجود شاہی خزانہ سے نہیں کھاتے تھے، بلکہ اپنے ہاتھ سے مزدوری کرتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لوہے کو موم کی طرح نرم بنا دیا تھا، وہ اس سے زرہ یعنی لوہے کی شیروانی بناتے تھے اور اسی کو بیچ کر جو مزدوری آتی تھی اس سے اپنا گزاران کرتے تھے، حالاں کہ اتنی بڑی حکومت کے مالک تھے، لیکن حکومت کی رقم کو اپنی ضرورتوں میں استعمال نہیں کرتے تھے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا پیشہ

۵۴۲:- وَعَنْهُ عَنِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: كَانَ زَكَرِيَّا عَلَيْهِ السَّلَامُ نَجَّارًا.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے

ارشاد فرمایا: حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی تھے (جس کو ہم سہتار "sihvir" کہتے ہیں۔ اور اس کی جو اجرت آتی تھی اس سے اپنا گزار بسر کرتے تھے۔)

انسانیات:- ویسے بھی جو چیزیں انسانی ضرورت کی ہیں ان پیشوں کا علم اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہی لوگوں تک پہنچایا ہے۔ جیسے کپڑے

بننے اور سینے کا کام، بڑھتی، ستھاری، لوہاری کا کام، زراعت اور طب وغیرہ؛ چوں کہ یہ سب انسانی ضرورتوں کی چیزیں ہیں، اس لیے یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر وحی کے ذریعہ سے القاء فرمائیں، پھر انہی کے واسطے سے لوگوں کو سکھائی گئی ہیں۔

ہاتھ کی کمائی

۵۴۳:- وعن المقدام بن معديكرب رضي الله عنه عن النبي ﷺ قَالَ: مَا

أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ، وَإِنَّ نَبِيَّ اللَّهِ دَاوُدَ ﷺ

كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت مقدام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کسی نے کوئی کھانا اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں کھایا۔ اور بے شک اللہ کے نبی داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔

افادات:- اپنے ہاتھ سے جو محنت مزدوری کر کے حاصل کرے گا، اور

اس سے کھانے کی چیز خرید کر کھائے گا، وہ اس کے حق میں سب سے بہتر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو خود کمانے کے واسطے کوشش کرنی چاہیے، چاہے وہ مزدوری کی شکل میں ہو، زراعت اور کھیتی باڑی کی شکل میں ہو، یا محنت کی جو بھی مختلف شکلیں ہیں ان میں سے کوئی بھی جائز شکل اختیار کرے؛ تو وہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے۔ باقی آدمی اگر بیٹھا رہے اور دوسروں کے اوپر نگاہیں ڈالے رہے، تو یہ شکل شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہے۔ البتہ وہ حضرات جن کو توکل کا اونچا مقام حاصل ہے، وہ محنت مزدوری نہ کرنے کے باوجود کسی کے اوپر نگاہ ڈالے ہوئے نہیں ہوتے؛ ان کے لیے کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

الکرم والجود او الانفاق فی وجوه الخیر ثقة بالله تعالیٰ

سخاوت اختیار کرنا
اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے
نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

﴿ مجلس ۱ ﴾

۱۵ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۷ جون ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَبِیْثَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِیْهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضِلِّ لَهٗ
 فَلَا هَادِیَّ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا
 مُحَمَّدًا عَبْدًا وَرَسُوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا
 كَثِیْرًا ۱۔ اَمَّا بَعْدُ:-

ترجمہ الباب کا خلاصہ

پچھلے باب میں کمانے کی فضیلت آئی تو ظاہر ہے جب آدمی محنت مزدوری کرے گا تو اس کے نتیجے میں ہاتھ میں پیسہ آئے گا تو اس کو کہاں استعمال کرنا چاہیے؟ اسی کو اس باب میں بتلایا جا رہا ہے۔ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے سخاوت سے کام لینا۔ یعنی آدمی کے پاس مال ہوتا ہے تو نفس و شیطان اس کو ترغیب دیتے ہیں کہ مال کو خرچ مت کرو، کچھ اپنے پاس بھی رہنے دو، آڑے وقت کام آئے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ آڑے وقت اگر ضرورت بھی پڑے گی تو کتنے کی پڑے گی؟ ہزار، دو ہزار، پانچ ہزار کی پڑے گی، لیکن جو دس لاکھ پڑے ہیں اس کو آڑے وقت کے نام سے خرچ کرنے سے نفس روکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ آدمی کو ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے خرچ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ابھی دیا ہے تو اس وقت بھی وہی دے گا اور ضرورت پوری کرے گا۔ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے ہاتھ کو روکنا پسندیدہ نہیں ہے۔

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾ (سورہ سبأ: ۳۹) جو کچھ بھی تم خرچ

کرو گے، اللہ تعالیٰ اس کا معاوضہ اور بدلہ دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔

﴿وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نُنْفِسْكُمْ وَمَا تَنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ. وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ الْيَتِيمَ وَالْيَتِيمَ وَأَنْتُمْ لَا تَنْظُرُونَ﴾ (البقرہ ۲۷۱) جو کچھ بھی مال تم خرچ کرو گے وہ اپنے واسطے ہی کرو گے، یعنی اس کا فائدہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تم کو ہی پہنچنے والا ہے، وہ کہیں ضائع جانے والی چیز نہیں ہے۔ اور مال میں سے جو کچھ تم اللہ کو راضی کرنے کے لیے خرچ کرو گے، اللہ تعالیٰ تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دے گا، اور تمہارے خرچ کئے ہوئے کے اجر و ثواب میں دنیا کے بدلہ میں ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔

حسد جائز نہیں ہے مگر.....

۵۴۴:- وعن ابن مسعود بنى الله تعالى عن النبي ﷺ قال: لا حسد إلا في اثنتين: رجل آتاه الله مالا، فسلطه علىهلكته في الحق. ورجل آتاه الله حكمة، فهو يفتضى بها ويعلّمها. (متفق عليه)

ومعناه: يذنبغي أن لا يغبط أحد إلا على إحدى هاتين الحصلتين.
ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حسد جائز نہیں ہے، مگر دو آدمیوں کے معاملہ میں۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا، اس کے بعد اس کو حق میں (نیکی کے کاموں میں) اس مال کے ختم کرنے پر مسلط کر دیا۔ اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، اس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو بھی علم سکھاتا ہے۔

افادات:- ویسے حسد کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا کی ہے، صاحب نعمت کی اس نعمت کو دیکھ کر کوئی آدمی یوں سوچے کہ اللہ تعالیٰ یہ نعمت اس کے پاس سے چھین کر مجھے دیدے؛ اس کو حسد کہتے ہیں اور یہ حرام ہے۔ اور اگر یہ

خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت اس کو عطا فرمائی ہے، اس کے پاس بھی باقی رہے اور ایسی نعمت اللہ تعالیٰ مجھے بھی دے؛ تو اس کو عربی میں ”غبطہ“ کہتے ہیں، اور اردو میں اسی کو ”ریشک“ کہتے ہیں۔ اس روایت میں فرمایا گیا کہ دو آدمیوں کے اوپر حسد کر سکتے ہیں۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ یہاں حسد بول کر ریشک اور غبطہ مراد ہے کہ دو آدمی ایسے ہیں کہ ان کی نعمت کو دیکھ کر تم اپنے دل میں یہ تمنا کر سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایسی نعمت اس کے ہاتھ سے چھینے بغیر ہمیں بھی عطا فرمائے۔

”فی الحقیقۃ“ یعنی نیکی کے کاموں میں جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے پاس مال ہوتا ہے تو وہ نیکی کے کاموں میں خوب خرچ کرتے ہیں اور اس کثرت سے خرچ کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کو مال سے عداوت اور دشمنی ہے، اس کو اپنے پاس رکھنا ہی نہیں چاہتے؛ ایسے آدمی کو دیکھ کر کوئی ریشک کرے اور دل میں یہ تمنا کرے کہ: کاش! اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی مال دیا ہوتا تو میں بھی مال کو نیکی کے کاموں میں اسی طرح خرچ کرتا جس طرح یہ آدمی خرچ کرتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، اس کے ذریعے سے وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اور لوگوں کو علم سکھاتا ہے؛ یہ آدمی بھی اس قابل ہے کہ اس پر ریشک کیا جائے۔ ہم یوں سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسا علم دیتا تو ہم بھی اسی طرح حق کے مطابق فیصلہ کرتے اور لوگوں کو یہ علم سکھاتے۔ یہ دو آدمی ہیں جن پر ریشک کیا جاسکتا ہے اور اس کی ترغیب آئی ہے۔

مؤمن کا حقیقی مال تو یہی ہے؟

۵۴۵:- وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَيْكُمْ مَالٌ وَارِثَةٌ أَحَبُّ إِلَيْهِ

مَنْ مَالِهِ؛ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا مِمَّا أَحَدٌ إِلَّا مَالُهُ أَحَبُّ إِلَيْهِ. قَالَ: فَإِنَّ مَالَهُ مَا قَدَّمَ وَمَالٌ وَارِثُهُ مَا أَخَّرَ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا: تم میں سے کون ہے جس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر ایک کو اپنا ہی مال زیادہ محبوب ہے (وارث کا مال کس کو محبوب ہوگا؟) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: (اگر اپنا ہی مال محبوب ہے تو) اپنا مال تو وہ ہے جو آگے بھیج دیا جائے، جو مال چھوڑ کر گئے، وہ وارث کا مال ہے (تو اب دیکھ لو کہ تم کون سے مال سے محبت کرتے ہو)

افادات:- عام طور پر آدمی کا جو فطری تقاضہ اور طبیعت و مزاج ہے کہ ہر

ایک کو اپنا ہی مال دوسرے کے مال کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ دوسرے کا مال ہلاک بھی ہو جائے تو کچھ پرواہ نہیں ہوا کرتی۔

بہت سی مرتبہ آدمی زندگی بھر لاکھوں روپے جمع کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ

میرا مال ہے، لیکن جب موت آتی ہے تو اس مال کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے، نہ تو

اس مال کو اپنی ضروریات (کھانے پینے، پہننے اور ہننے میں) استعمال کیا، نہ اللہ کے

راستہ میں خرچ کیا؛ بس! ایسے ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ اب پتہ چلا کہ وہ جس کو زندگی بھر اپنا

مال سمجھتا رہا، وہ اس کا نہیں تھا بلکہ وارثوں کا تھا جن کے ہاتھ میں اب پہنچا ہے۔ تو اس

لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنا تو وہی ہے جو خرچ کر کے آگے بھیج دو۔ اس روایت

میں اس بات کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے زائد

ہو اس کو خرچ کر کے آگے بھیج دے، ورنہ تو دوسروں کے لیے پیچھے چھوڑ کر جانا ہوگا۔

اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی؟

اور پھر جو بھی کام اپنے لیے کر لے گا وہ اس کے لیے آخرت میں کام آنے والا ہے، دوسروں پر بھروسہ کرنا اور دوسروں سے امید توقع رکھنا فضول ہے۔ پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ خود کمایا، اپنے پاس اپنی تحویل میں، اپنے کنٹرول میں اور اپنے اختیار میں رہا، پھر بھی اپنے لیے خرچ نہیں کیا، اور جب مر تو دوسروں کے لیے چھوڑ کر گیا پھر یہ امید رکھتا ہے کہ اب دوسرے میرے لیے کچھ خرچ کریں گے، اس سے زیادہ نادانی اور بے وقوفی اور کیا ہوگی! جب تمہارے ہاتھ میں تھا، تم نے کمایا تھا، تم مالک تھے پھر بھی خود خرچ نہیں کیا کہ آخرت میں کام آئے، اور اب یہ امید رکھتے ہو کہ میرے بعد میری اولاد اس مال میں سے میرے لیے کچھ خرچ کرے گی۔ جب خود خرچ نہیں کیا، تو وہ کیا خرچ کرے گی؟ یہ امید تو فضول ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنے مال میں سے اپنے ہاتھوں سے خود ہی خرچ کر لے۔

ایک غلط سوچ اور اس کی اصلاح

آدمی یوں سوچتا ہے کہ اگر میں اولاد کے لیے نہیں چھوڑوں گا تو میرے بعد میری اولاد کیا کرے گی؟ اللہ اکبر! ارے بھائی! تمہاری اولاد کو جس خدا نے پیدا کیا ہے وہی اس کا انتظام کرے گا۔ گویا ہم تو (نعوذ باللہ) خدا بنے بیٹھے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو پال رہے ہیں، ان کی ضرورتیں ہم پوری کر رہے ہیں۔ حالاں کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں تھا؛ اس وقت اس کی ضرورتیں کون پوری کر رہا تھا؟ ہر ایک کی ضرورت اللہ تعالیٰ ہی پوری کرتا ہے۔ آدمی یوں سوچتا ہے کہ بچوں کے لیے مسیں کچھ کر کے جاؤں۔ تو بھائیو! ان کے لیے اگر کچھ کرنا ہی ہے تو وہ کرو جس کی شریعت نے آپ کو

تاکید کی ہے یعنی ان کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرو، ان کو علم سکھاؤ، اچھے اعمال کا پابند بناؤ، ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دو۔ اصل کام تو یہ ہیں جو ہر آدمی کو اپنی اولاد کے لیے کرنے چاہئیں، اور شریعت میں انہی کی تاکید کی گئی ہے۔

اگر کسی روایت میں یہ آیا ہو تو ہمیں بتاؤ کہ اپنی اولاد کے لیے مکان چھوڑ کر جاؤ، زمین چھوڑ کر جاؤ، روپے پیسے چھوڑ کر جاؤ۔ ہاں! یہ حکم تو آیا ہے کہ جب تک وہ چھوٹے ہیں، حاجت مند ہیں، آپ کی تحویل میں ہیں تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کرو، لیکن یہ بھی سوچو کہ وہ چھوٹے ہیں تب بھی اگر آپ کو موت آگئی تو آپ کے بعد ان کا کیا حال ہوگا؟ ان کی ضرورتیں پوری ہوں گی یا نہیں؟ ضرور پوری ہوں گی۔ آدمی ایک طرف یوں سمجھ رہا ہے کہ جب بڑے ہوں گے اس کے بعد یہ مجھے کما کر کھلائیں گے، اور دوسری طرف یوں سوچتا ہے کہ میں ان کے لیے کچھ چھوڑ کر جاؤں۔ یعنی ہماری زندگی تضادات کا شکار ہے، آدمی دونوں طرف کی باتیں کرتا ہے، اولاد سے امید بھی رکھتا ہے، اور اولاد کے لیے کچھ چھوڑنا بھی چاہتا ہے۔

کھجور کے ایک ٹکڑے کی تاثیر

۵۴۶:- وَعَنْ عَبْدِ بْنِ حَاتِمٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اتَّقُوا

النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ. (متفقٌ عَلَيَّهِ)

ترجمہ:- حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، چاہے کھجور کے آدھے ٹکڑے کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- اگر آپ کھجور کا ایک ٹکڑا اللہ کے راستہ میں صدقہ کریں گے تو

گویا اس کے ذریعہ سے آپ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا رہے ہیں۔ جب کھجور

کے ایک ٹکڑے میں یہ تاثیر ہے تو زیادہ خرچ کرنے میں کیا کچھ تاثیر نہیں ہوگی۔

آپ ﷺ نے کبھی ”نا“ نہیں کہا

۷۴:۵ - عن جابر بن عبد الله قال: ما سئل رسول الله ﷺ شيئا قط.

فقال: لا. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبی کریم ﷺ

سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ نے ”نا“ کہا ہو۔

افادات:- جب بھی کوئی چیز مانگی گئی تو آپ ﷺ نے فوراً دے دی، ایسا

کبھی نہیں ہوا کہ آپ سے سوال کیا گیا ہو اور آپ نے انکار فرمایا ہو، بلکہ اگر آپ کے پاس نہیں ہوتا تو وعدہ فرما لیتے تھے، دوسرے وقت بلا لیتے تھے۔ بعض لوگوں کو یوں کہہ دیا کرتے تھے کہ کسی سے لے لو، میں تمہارا قرضہ ادا کر دوں گا۔

حضورِ اکرم ﷺ کا چہرہ کھل گیا

ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ایک آدمی آیا، اس نے اپنی حاجت پیش کی، نبی کریم ﷺ

کے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا بھائی! تم کہیں سے

اُدھار لے لو، بعد میں میں ادا کر دوں گا۔ اس پر حضرت عمر بنی اللہ نے عرض کیا: اے

اللہ کے رسول! جو چیز آپ کے پاس نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا آپ کو مکلف نہیں

بنایا ہے، پھر آپ بلا وجہ بوجھ کیوں اپنے سر لے رہے ہیں؟ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت

عمر بنی اللہ نے اس بات سے حضورِ اکرم ﷺ کو بہت زیادہ ناگواری ہوئی۔ ایک انصاری

نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ خوب خرچ کیجئے اور عرش والے کی طرف سے

ذرہ برابر بھی کمی کی پرواہ نہ کیجئے، یعنی اللہ تعالیٰ محروم نہیں کرے گا۔ یہ سن کر حضورِ

اکرم ﷺ کا چہرہ کھل گیا اور فرمایا: مجھے اسی کا حکم ہے۔ (مسند بزار: ۲۷۳/۲ تہذیب الآثار للطبری: ۱۱۸)

بہر حال! حضور ﷺ نے کبھی کسی مانگنے والے کو انکار نہیں فرمایا، بلکہ جو چیز مانگی گئی وہ عطا فرمادی، حتیٰ کہ آپ ﷺ کی ضرورت کی ہوتی تھی وہ بھی دے دیا کرتے تھے۔

باوجود سخت ضرورت کے چادر دے دی

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک چادر لے کر آئی جو لنگی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ اس نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے اپنے ہاتھ سے سوت کات کر یہ چادر بنائی ہے، تاکہ آپ اس کو لنگی یا ازار کے طور پر استعمال کریں۔ راوی کہتے ہیں: عین ایسے موقعہ پر آ کر اس عورت نے وہ چادر پیش کی تھی کہ آپ ﷺ کو خود اس کی سخت ضرورت تھی، اس وقت آپ کے پاس لنگی نہیں تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو قبول فرمایا، پھر آپ مکان میں تشریف لے گئے، اس کو پہن کر تشریف لائے۔ جب آپ ﷺ اپنی مجلس میں بیٹھے تو ایک صحابی آپ ﷺ کے قریب ہوئے اور اس کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! یہ مجھے دے دیجئے۔ حضور ﷺ نے کہا: ٹھیک ہے۔ آپ ﷺ دوبارہ گھر میں تشریف لے گئے اور وہ چادر تہ کر کے بھجوائی۔ جب آپ ﷺ گھر میں تشریف لے گئے تو دوسرے صحابہؓ نے ان صحابی کو آڑے ہاتھوں لیا کہ تمہیں سمجھ نہیں پڑتی، تمہیں معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے پاس اس وقت کوئی کپڑا نہیں ہے، آپ کو بڑی شدید ضرورت تھی ایسی حالت میں یہ چادر آپ کے پاس ہدیہ میں آئی، آپ نے اس کو زیب تن کیا اور تم نے اس کو مانگ لی؟ انہوں نے کہا: میں نے اس لیے مانگی ہے کہ یہ میرا کفن بنے۔ چنانچہ روایتوں میں ہے اس چادر کو ان صحابی نے محفوظ رکھا یہاں تک کہ انتقال کے بعد ان کے کفن میں استعمال ہوئی۔

(بخاری شریف، باب من استعمل الکفن فی زمن النبی ﷺ فلن ینکح علیہ، حدیث نم: ۱۲۷۷)

یہاں تو بتانا ہے کہ اپنی ضرورت کی چیز بھی پھر بھی نبی کریم ﷺ نے عطا فرمادی۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے متعلق فرزدق شاعر کا ایک قصیدہ ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

مَا قَالَا قَطُّ إِلَّا فِي تَشَهُّدِهِ * لَوْلَا التَّشَهُُّدُ لَكَانَتْ لَاءٌ لَا نَعْمَ

انہوں نے کلمہ شہادت کے علاوہ کبھی اپنی زبان سے ”لا“ کہا ہی نہیں۔ اگر کلمہ شہادت نہ ہوتا تو ان کی زبان پر ”لا“ آتا ہی نہیں۔

سخاوت کی برکت اور بخل کی نحوست

۵۴۸:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلْفًا، وَيَقُولُ الْآخَرُ: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلْفًا. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر دن جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے اترتے ہیں (بعض روایتوں میں ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی دونوں طرف دو فرشتے ہوتے ہیں) ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! جو تیرے راستے میں خرچ کرنے والا ہو اس کو اس مال کا جو اس نے خرچ کیا ہے بدلہ عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! جو خرچ کرنے کی جگہ میں خرچ نہیں کرتا، روکے رکھتا ہے، اس کے مال کو ہلاک کر دے۔

افادات:- ظاہر ہے کہ فرشتوں کی دعا تو ضرور قبول ہوگی۔ بعض شراح نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ”مُمْسِكًا تَلْفًا“ میں مطلق تلف فرمایا گیا ہے۔ گویا جو آدمی اللہ کے راستے میں خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے، اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں خرچ نہیں کرتا ہے، تو صرف مال ہی نہیں، بلکہ اس کی دوسری صلاحیتیں بھی ضائع ہوتی ہیں، اللہ کی راہ میں استعمال میں نہیں آتیں۔ بخل کی یہ نحوست ہے۔

پہلے خالی کرو، تو بھری جائے گی

۵۴۹:- وعنه أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: أَنْفِقْ يَا ابْنَ آدَمَ

يُنْفِقْ عَلَيْكَ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (یہ حدیث قدسی ہے) اے انسان! خرچ کر، تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔

افادات:- باری تعالیٰ فرماتے ہیں: تم خرچ کرو تو تم کو ملے گا۔ اگر خرچ

نہیں کرو گے تو نہیں ملے گا۔ ہر چیز کے اندر قدرت کا یہی قانون ہے جیسے: آپ یہاں کی

کھڑکیاں بند کر دیں، ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہ رکھیں: تو تازہ ہوا نہیں آئے گی۔ اگر

آپ کھڑکی کھول دیں گے، ہوا کے جانے کا راستہ نکال دیں گے: تو نئی ہوا آئے گی۔ اسی

طرح آپ کی جیب بھری کی بھری ہے، تو دوسرا کہاں سے آئے گا، پہلے اس کو خالی کرو تو

دوبارہ بھری جائے گی۔ جیب بھری کے بھری ہی رہنے دیتے ہیں، خالی تو کرتے نہیں،

پھر دوسرے کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ برتن بھرا ہوا ہے تو نئی چیز اس میں

کیسے آئے گی؟ نئی چیز لینا چاہتے ہو تو اس برتن کو پہلے خالی کرو، پھر اس میں نئی چیز آئے

گی۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خرچ کیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں میں خرچ کرنے کی تاکید فرمائی اور ترغیب دی ہے،

اس میں خرچ کرنے کے معاملہ میں آدمی کو بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

الکرم والجود او الانفاق فی وجوه الخیر ثقة بالله تعالیٰ

سخاوت اختیار کرنا
اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے
نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

﴿ مجلس ۲ ﴾

۲۲ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۲۴ جون ۲۰۰۰ء
 بیان چل رہا تھا کہ اللہ کے اعتماد پر نیکی کے کاموں میں مال حسر چ کرنا اور
 سخاوت و فراخ دلی سے کام لینا۔ اسی سلسلہ میں آگے مزید روایتیں پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے اعمال میں بہترین عمل

۵۵۰:- وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ
 رَسُولَ اللَّهِ ﷺ: أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ: تُطْعَمُ الطَّعَامَ وَتُقَرَّءُ السَّلَامَ
 عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے
 سوال کیا: اسلام کے اعمال میں سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد
 فرمایا: کھانا کھلانا اور جس کو پہچانتے ہو اور جس کو نہیں پہچانتے؛ سب کو سلام کرنا۔

افادات:- سلام؛ مسلمان ہونے کے ناطے سے اسلامی ایک حق ہے، اس
 میں پہچان والا ہونا ضروری نہیں ہے، بس! جس کا مسلمان ہونا معلوم ہو جائے اس کو سلام
 کیا جائے؛ چاہے اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو، بلکہ صرف پہچان والے کو سلام کرنا
 تو آخری زمانہ کی نشانی بتلائی گئی ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اسلام کے سب سے اچھے
 عمل میں نمبر اول پر کھانا کھلانا بتلایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیکی کا ایسا کام ہے جو مال خرچ
 کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس روایت میں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ آدمی اس کام میں اپنا
 مال خرچ کرے۔

یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے

۵۵۱:- وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَرْبَعُونَ خَصْلَةً: أَعْلَاهَا

مَنِحَةُ الْعَنْوِ، مَا مِنْ عَامِلٍ يَعْمَلُ بِمُضَلَّةٍ مِنْهَا؛ رَجَاءُ ثَوَابِهَا وَتَصْدِيقُ مَوْعُودِهَا
إِلَّا أَذْخَلَهُ اللَّهُ تَعَالَى فِيهَا الْجَنَّةَ. (رواہ البخاری، وقد سبق بیان هذا الحديث في باب بيان كثرة طرق الخیر)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: چالیس کام ایسے ہیں کہ کوئی بھی اللہ کا بندہ اگر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اور اس کام پر دنیا اور آخرت میں جو ثواب اور بدلہ ملنے والا ہے اس وعدہ کو سچا سمجھتے ہوئے کسی بھی ایک کام کو کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے۔ ان چالیس کاموں میں سے ایک کام دودھ دینے والی بکری کسی کو عاریت کے طور پر دینا ہے۔

انفادات:- بہت سی جگہوں پر دیہاتوں میں آج بھی یہ رواج ہے کہ کسی آدمی کے پاس بہت سارے دودھ دینے والے جانور ہیں، مثلاً: کئی بکریاں دودھ دیتی ہیں، خود مالک کی دودھ کی ضرورت تو ایک دو سے پوری ہو جاتی ہے، تو ان میں سے ایک دو بکری اپنے کسی رشتہ دار، یا کسی غریب کو دیدیتے ہیں کہ جب تک یہ جانور دودھ دیتا رہے، تم اس کو اپنے پاس رکھو، اور اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاؤ، جب یہ جانور دودھ دینا بند کر دے تو واپس کر دینا۔ دودھ دینے والی بکری، اونٹنی، گائے یا بھینس؛ جب تک کہ وہ دودھ دے کسی کو استعمال کرنے کے لیے دینا، تاکہ وہ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھائے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جن چالیس کاموں میں سے کسی بھی ایک کام کے کرنے پر اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرماتے ہیں ان میں۔ یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ گویا خرچ کرنے کی ایک چیز یہ بھی ہے، اس لیے اس کو یہاں ذکر کیا ہے۔

مال خرچ کرنے کی تعلیم اور ترتیب

۵۵۲:- وعن أبي أمامة صدیق بن عجلان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ

عَلَى كَفَافٍ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ. وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: اے انسان! تو اپنا زائد مال خرچ کر دے، یہ تیرے لیے بہتر ہے۔ اور اس کو اپنے پاس رہنے دے، یہ تیرے لیے برا ہے۔ البتہ آئندہ جتنی مقدار کی ضرورت پڑنے والی ہے اس کو اگر تو اپنے پاس روک رکھے، اس پر کوئی ملامت نہیں (خرچ کی بات بھی نہیں ہے) اور جب خرچ کرنا شروع کرے تو جن لوگوں کا خرچہ تیرے ذمہ ہے، ان سے خرچ کرنے میں شروعات کر۔ اور اوپر والا ہاتھ (یعنی خرچ کرنے والا) نیچے والے (یعنی مانگنے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

افادات:- زائد مال کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ضرورتیں پوری ہو جانے

کے بعد جو بچ جائے۔ اس مال کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا بہتر ہے، اس لیے کہ اگر خرچ نہیں کرو گے تو ایک وقت آئے گا جب تم دنیا سے جا رہے ہو گے، تو سب مال یہیں چھوڑ کر جاؤ گے، اس وقت وہ تمہارے کسی کام آنے والا نہیں ہے۔ تمہارے بعد جو لوگ آنے والے ہیں ان کے ہاتھ میں پہنچے گا۔ اگر تم نے اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ کر دیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ذخیرہ ہو جاتا، وہاں کے بینک میں جمع ہو جاتا اور تمہارے لیے کارآمد ہوتا۔

اور جب خرچ کرنا شروع کرو تو جن کے خرچ کی ذمہ داری تم برداشت کرتے

ہو پہلے ان کو دو، شروعات اپنے گھر ہی سے کرنی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آپ نیکی کے طور پر خرچ کرنا شروع کریں تو دوسروں کو تو دیں اور جن کے خرچ کی ذمہ داری تمہارے سر ہے، وہ بیچارے محروم رہیں، دوسروں کو آپ کی سخاوت سے فائدہ ہو رہا ہے، اور یہ بیچارے بھوکے مر رہے ہیں۔

سخاوت سے اسلام محبوب بن جاتا

۵۵۳:- وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ مَا سئِلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى الْإِسْلَامِ شَيْعًا إِلَّا أَعْطَاهُ. وَلَقَدْ جَاءَهُ رَجُلٌ، فَأَعْطَاهُ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ، فَرَجَعَ إِلَى قَوْمِهِ، فَقَالَ: يَا قَوْمِ! أَسْلِمُوا؛ فَإِنَّ مُحَمَّدًا يُعْطِي عَطَاءَ مَنْ لَا يَحْتَسِبُ - الْفَقْرَ، وَإِنْ كَانَ الرَّجُلُ لَيْسَ لَهُ مَا يَرِيدُ إِلَّا الدُّنْيَا، فَمَا يَلْبَسُ إِلَّا الْيَسِيرَ حَتَّى يَكُونَ الْإِسْلَامَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ مع شرح:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی طرف سے

اسلام قبول کرنے کے اوپر بطور شرط کے نبی کریم ﷺ سے کسی چیز کا سوال ہوتا تو آپ ضرور دیدیتے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی آیا، اس نے مسلمان ہونے پر شرط رکھی تو آپ ﷺ نے اس کو دو پہاڑوں کے درمیان (جو وادی ہوتی ہے، وہ پورا) میدان بکریوں سے بھرا ہوا دے دیا۔ جب اس نے حضور ﷺ کی سخاوت دیکھی تو اپنی قوم میں واپس گیا اور کہا: اے میری قوم! مسلمان ہو جاؤ؛ وہ تو اتنا دیدیتے ہیں کہ ان کو فقر کا ڈر ہی نہیں ہے (حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) کبھی کوئی آدمی فقط دنیا کے واسطے اسلام قبول کرتا لیکن تھوڑا سا زمانہ نہیں گزرتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں اور اس کی نگاہ میں مذہب اسلام؛ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے ان سب سے زیادہ محبوب ہو جاتا تھا۔

انصادات:- اگر کوئی آدمی آ کر یوں کہتا: اے اللہ کے رسول! مجھے یہ چیز دیجئے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا، یا اگر آپ مجھے اتنا مال دیں تو میں اسلام قبول کرتا ہوں؛ تو حضور ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ وہ جو بھی چیز اسلام قبول کرنے کے لیے شرط کے طور پر مانگتا، آپ ﷺ عنایت فرمادیتے تھے۔ اور عام طور پر آدمی جب خرچ کرتا ہے تو سوچتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں رہے گا تو میں کیا کروں گا، لیکن حضور ﷺ تو ایسا

سوچتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں ہے کہ اس کے ترغیب دینے پر اس کی پوری قوم مسلمان ہوگئی۔ آپ ﷺ کی سخاوت اس کے اوپر اتنا اثر کرگئی کہ وہ خود تو اسلام لایا ہی، اپنی پوری قوم کو بھی اسلام لانے پر آمادہ کیا۔

حضور ﷺ کے پاس کوئی مطالبہ لے کر آتا کہ مجھے فلاں چیز چاہیے، اگر آپ دیں تو میں اسلام لاتا ہوں، حالاں کہ کھلم کھلا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا کی فلاں چیز کے واسطے ہی اسلام لارہا ہے، لیکن پھر بھی حضور ﷺ دیدیتے اور اس کو اسلام کے لیے آمادہ کرتے۔ اولاً تو اسلام لانے کی شکل یہی ہوتی تھی کہ اپنی غرض کی خاطر وہ اسلام لاتا تھا، لیکن پھر تھوڑا سا زمانہ نہیں گزرتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں اور اس کی نگاہ میں مذہب اسلام؛ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ان سب سے زیادہ محبوب ہو جاتا تھا۔ یعنی اس کے اسلام کی ابتداء تو یہ ہوتی تھی لیکن بعد میں پھر اس کی نگاہ میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی تھی اور وہ پکا سچا مسلمان ہو جاتا تھا۔

غیر حقدار کو دینے کی وجہ

۵۵۴:- وعن عمر بنی اللہ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَسَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَسْبًا، فَقُلْتُ:

يَا رَسُولَ اللَّهِ! لَعَيْتُ هَؤُلَاءِ كَانُوا أَحَقَّ بِهٖ مِنْهُمْ؛ فَقَالَ: إِنَّهُمْ خَيْرٌ وِنِي أَنْ يَسْأَلُونِي بِالْفُحْشِ، أَوْ يُبْخَلُونِي، وَكَسَتْ بِسَاحِلٍ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمر بنی اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے ایک مرتبہ کچھ مال تقسیم

فرمایا، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں اس مال کے زیادہ حقدار تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انہوں نے مجھے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا، یا تو وہ فحش گوئی کر کے مجھ سے مانگیں (اگر میں دے دوں تو ٹھیک ہے) ورنہ وہ مجھے بخیل کہیں،

اور میں بخیل نہیں ہوں (اس لیے باوجود اس کے کہ دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں زیادہ
 حقدار ہوتے ہیں، میں ان کو دیتا ہوں، دوسروں کو نہیں دیتا)

حضور ﷺ کی سخاوت کا نمونہ

۵۵۵:- وعن جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہما قال: بَيْتًا هُوَ يَسِيرٌ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ
 مَمْقُفَلَةٌ مِنْ حُنَيْنٍ، فَعَلِقَهُ الْأَعْرَابُ يَسْأَلُونَهُ، حَتَّى اصْطَرَّوهُ إِلَى سَمْرَةَ، فَحَطَفَتْ
 رِداءَهُ، فَوَقَفَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: أَعْطُونِي رِداءِي، فَلَوْ كَانَ لِي عَدُوٌّ هَذِهِ الْعِصَاهُ
 نَعْمًا، لَقَسَمْتُهُ بَيْتِكُمْ، ثُمَّ لَا تَجِدُونِي بَخِيلًا وَلَا كَدَّابًا وَلَا جَبَانًا. (رواه البخاري)
 ((مَمْقُفَلَةٌ)) أَيْ: حَالُ رُجُوعِهِ. وَ((السَّمْرَةُ)) شَجَرَةٌ. وَ((الْعِصَاهُ)):
 شَجَرَةٌ لَهُ شَوْكٌ.

ترجمہ:- حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ جب غزوہ
 حنین سے واپس لوٹ رہے تھے، تو دیہات کے رہنے والے بہت سے لوگ آپ ﷺ سے لپٹ
 گئے، آپ کو گھیر لیا اور سوال کرنے لگے (کہ ہم کو دیجئے) یہاں تک کہ (وہ آپ کے پیچھے ایسے
 پڑے کہ ان سے بچنے کے لیے آپ ﷺ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے، اور مجبوراً آپ
 ﷺ کو کیکر کے ایک درخت کے پاس پناہ لینی پڑی (تو کیکر کے درخت کی ٹہنیوں اور
 کانٹوں میں آپ کی چادر الجھ گئی اور آپ کے جسم سے اتر گئی، تو) وہ چادر بھی ان دیہاتیوں
 نے لے لی۔ حضور ﷺ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: میری چادر تو مجھے دیدو (اس پر تم نے کیوں
 قبضہ کر لیا؟) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو! اس پوری وادی کے اندر جتنے بھی کانٹے دار درخت
 ہیں ان کے برابر اگر میرے پاس مویشی اور جانور ہوتے تو میں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا اور تم
 مجھے بخیل، جھوٹا یا بزدل نہ پاتے۔

افادات :- مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو نہیں دے رہا ہوں وہ اس لیے کہ میرے پاس ہے ہی نہیں، اگر میرے پاس ہوتا تو میں ذرہ برابر بخل سے کام نہ لیتا۔

غزوہ حنین

مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد یہ غزوہ پیش آیا تھا، حضور ﷺ کو پتہ چلا کہ قبیلہ ہوازن اور قبیلہ بنو ثقیف اور آس پاس کے دوسرے قبائل کے لوگ جمع ہوئے ہیں اور ان کا ارادہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کا ہے، تو نبی کریم ﷺ نے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا کہ جاؤ معلوم کر کے آؤ کہ جو خبر ہمیں ملی ہے کہ یہ لوگ جمع ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں؛ واقعتاً یہ خبر صحیح ہے؟ چنانچہ وہ جا کر آئے اور اطلاع دی کہ جی ہاں! وہ سب جمع ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان صحابہ کو۔ جن کو لے کر آپ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ فتح کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ حکم دیا کہ چلیں! اس سے پہلے کہ وہ ہم پر چڑھائی کریں، ہم ہی جا کر ان کی خبر لیں۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ حضرات صحابہ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ وادی حنین وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان عرفات سے تھوڑی ہی آگے واقع ہے۔ وہ لوگ تیر اندازی میں بڑے مشہور تھے۔ جب نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ان کی وادی میں داخل ہوئے تو شروع میں معمولی سا مقابلہ کر کے وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے پہلے سے ہی یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے تیر اندازوں کو پہاڑوں کے اندر چھپا دیا تھا، اور مقابلہ کے لیے کچھ لوگ ظاہری طور پر آئے، پھر انہوں نے بھی پسپائی اختیار کی۔ صحابہ میں کچھ جلد باز لوگ تھے، وہ یوں سمجھے کہ ہمارا پلڑا بھاری ہو گیا ہے، تو وہ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے، اتنے میں جو لوگ چھپے ہوئے تھے انہوں نے اچانک حملہ کر کے پیچھے سے تیر

برسانے شروع کر دیئے، اس سے بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس ابتدائی شکست کی اصل وجہ تو یہ ہوئی تھی کہ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی طرف جا رہے تھے، اس وقت بارہ ہزار کا لشکر ساتھ تھا۔ ایک آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ آج ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔ اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعداد کی زیادتی کامیابی کا سبب بن سکتی ہے، حالانکہ ایک مؤمن کا ایمان تو یہ ہونا چاہیے کہ ساز و سامان یا تعداد کی زیادتی سے کامیابی نہیں ملتی؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے کامیابی ملتی ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے بتلایا ﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئاً﴾ یاد کرو حنین والے دن کو؛ جب تمہاری تعداد کی کثرت نے تم کو عجب و غرور میں مبتلا کر دیا تھا، اور وہ کسی کام نہیں آئی، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد اتاری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو جے رہے تھے، بالآخر مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا اور کامیابی ہوئی اور بہت سارا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ مالِ غنیمت کے اندر ۴ ہزار اوقیہ چاندی، ۲۴ ہزار اونٹ، ۴۰ ہزار بکریاں ملی تھیں، اور ۶ ہزار قیدی بھی تھے۔ اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کا جو خمس یعنی پانچواں حصہ تھا اس میں سے بہت سے لوگوں کو دیا تھا۔

صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا

۵۵۶:- وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعُ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ عِزًّا وَجَلًّا. (رواہ مسلم)

۵۵۷:- وَعَنْ أَبِي كَبْشَةَ عَمْرِو بْنِ سَعْدٍ الْأَنْمَارِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ

اللَّهُ ﷻ يَقُولُ: ثَلَاثَةٌ أُقْسِمَ عَلَيْهِنَّ وَأُحَدِّثُكُمْ حَدِيثًا فَاحْفَظُوهُ: مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ، وَلَا ظَلِمَ عَبْدٌ مُظْلَمَةً صَبَرَ عَلَيْهَا، إِلَّا زَادَهُ اللَّهُ عِزًّا، وَلَا فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ إِلَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ - أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا - وَأُحَدِّثُكُمْ حَدِيثًا فَاحْفَظُوهُ. قَالَ: إِنَّمَا الدُّنْيَا لِارْبَعَةِ نَفَرٍ، عَبْدٍ رَزَقَهُ اللَّهُ مَالًا وَعَلِيًّا فَهُوَ يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَيَصِلُ فِيهِ رَحْمَهُ وَيَعْلَمُ لِلَّهِ فِيهِ حَقًّا، فَهَذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ، وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللَّهُ عَلِيًّا وَلَمْ يَزُرْ رَقَهُ مَالًا، فَهُوَ صَادِقُ النَّيِّتَةِ، يَقُولُ: لَوْ أَنَّ لِي مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنَيْتِهِ، فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ. وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللَّهُ مَالًا وَلَمْ يَزُرْ رَقَهُ عَلِيًّا، فَهُوَ يَحْبُطُ فِي مَالِهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ، لَا يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَلَا يَصِلُ فِيهِ رَحْمَهُ، وَلَا يَعْلَمُ لِلَّهِ فِيهِ حَقًّا، فَهَذَا بِأَخْبَثِ الْمَنَازِلِ. وَعَبْدٍ لَمْ يَزُرْ رَقَهُ مَالًا وَلَا عَلِيًّا، فَهُوَ يَقُولُ: لَوْ أَنَّ لِي مَالًا لَعَمِلْتُ فِيهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنَيْتِهِ. فَوِزْرُهُمَا سَوَاءٌ.

(رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ: - حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدقہ مال کو کم نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ کسی بندہ کی معافی کے نتیجے میں اس کی عزت ہی بڑھاتے ہیں، اور جو آدمی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزوں پر میں قسم کھاتا ہوں، پھر میں ایک بات کہوں گا؛ اس کو یاد رکھنا۔

❶ اللہ کی قسم! کسی بندے کا مال صدقہ سے کم نہیں ہوتا۔

❷ جس بندے پر ظلم کیا جاتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو

بڑھاتے ہیں۔

❸ جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: ایک بات کہتا ہوں اس کو یاد رکھو: دنیا میں چار قسم کے

آدمی ہیں:-

[۱] ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا، وہ آدمی اپنے اس علم کی وجہ سے مال کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے (اس کو کماتا ہے تو بھی اللہ کے حکم کے مطابق، اور خرچ کرتا ہے تو بھی اللہ ہی کے حکم کے مطابق) اور اس مال کے ذریعہ سے صلہ رحمی کرتا ہے، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جتنے حقوق اس مال کے اندر لگائے ہیں ان کو جاننا اور ادا کرتا ہے؛ یہ آدمی سب سے اونچے درجہ کا ہے۔

[۲] دوسرا بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو دیا ہے؛ لیکن مال نہیں دیا۔ اس کے دل میں نیت سچی ہے، اس لیے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر مجھے مال دیا ہوتا تو (جیسے اس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم دونوں دیا ہے، اور وہ اس مال کے حقوق ادا کرتا ہے) میں بھی اسی طرح مالی حقوق ادا کرتا، صلہ رحمی کرتا اور جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کے لیے کہا ہے، وہاں خرچ کرتا؛ اس کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق ہی معاملہ کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اور پہلے والا دونوں کو برابر ثواب ملے گا۔

[۳] تیسرا وہ بندہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال تو دیا ہے؛ لیکن علم سے محروم ہے۔ وہ اپنے مال میں جہالت کی وجہ سے بہت گڑبڑ کرتا ہے۔ نہ اس مال کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، نہ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتا ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائے ہوئے دیگر حقوق جانتا اور ادا کرتا ہے؛ یہ سب سے بدتر آدمی ہے۔

[۴] اور چوتھا آدمی وہ جس کے پاس نہ مال ہے، اور نہ علم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے پاس بھی اگر مال ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا جیسے وہ کرتا ہے (یعنی مال کو بے جا خرچ کرتا) یہ اس کی نیت کی بات ہے، اس لیے اس کا اور تیسرے والے کا گناہ برابر ہے۔

افادات:- اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے قسم کھا کر یہ بات ارشاد

فرمائی ہے کہ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ صدقہ دینے سے مال گھٹ رہا ہے؛ لیکن حقیقت میں اس کی وجہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی؛ بلکہ زیادتی ہی ہوتی ہے۔

اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی نے ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کیا، پٹائی کر دی، بے عزتی اور انسٹ کر دی، تو ہمارا نفس چاہتا ہے کہ اس سے انتقام اور بدلہ لیں، لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ معاف کر دو۔ جب معاف کرنے کی بات آتی ہے اور دوسرے لوگ بھی تلقین کرتے ہیں کہ ہاں بھائی! معاف کر دو، تو وہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ تو میری بے عزتی کی بات ہے، لوگ کہیں گے کہ بہت ڈھیلا آدمی ہے، بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتا، اسی جذبہ کے نتیجے میں آدمی معاف نہیں کرتا اور انتقام لیتا ہے۔ شریعت کہتی ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں معاف کر دوں گا تو میری بے عزتی ہوگی، حضور ﷺ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ اگر معاف کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری عزت اور بڑھا دے گا۔ جیسا کہ صدقہ کرنے میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مال گھٹ رہا ہے، ایسا ہی یہاں پر بھی ہے۔

”اور جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں، یعنی کوئی آدمی مانگنے کا سلسلہ شروع کرتا ہے تو بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مانگے گا تو لوگ اس کو دیں گے، اور اس کے نتیجے میں مال میں اضافہ ہوگا۔ لیکن حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ آدمی سوال کا دروازہ کھول کر اپنے لیے فقر کا دروازہ کھول رہا ہے، اس سے مال بڑھتا نہیں؛ بلکہ گھٹتا ہے۔

اس روایت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آدمی کو اپنا ارادہ اور نیت ہمیشہ اچھی ہی رکھنی چاہیے، اس لیے کہ بعض آدمی محض اپنے ارادہ اور نیت کی وجہ سے مال اور علم نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اوپر گزرا۔

جو خرچ کیا وہ سب باقی ہے

۵۵۸:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: ما بقي من مال النبي ﷺ: ما بقي منها؛ قالت: ما بقي منها إلا كتفها. قَالَ: بقي كلها غير كتفها.

(رواه الترمذی وقال: حدیث صحیح))

ومعناه: تصدَّقوا بِهَا إِلَّا كَتَفَهَا. فَقَالَ: بَقِيَتْ لَنَا فِي الْأَخِرَةِ إِلَّا كَتَفَهَا.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کے گھر والوں نے بکری

ذبح کی، حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: اس میں سے کتنا بچا؟ بتایا گیا کہ سب تقسیم ہو گئی، صرف اس کا بازو بچا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب باقی ہے؛ ہاں! جو بازو بچا ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔

انادات:- مطلب یہ ہے کہ تم نے جو تقسیم کر دیا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں

محفوظ ہو گیا ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْقُذُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ﴾ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ گویا جتنا دے دیا وہ باقی ہے اور جو ابھی تمہارے پاس باقی ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔

تم روک کر مت رکھو؛ ورنہ.....

۵۵۹:- وعن أسماء بنت أبي بكر الصديق رضي الله عنها قالت: قَالَ لِي رَسُولُ

اللَّهِ ﷺ: لَا تُورِكِي فَيْوُوكِي عَلَيَّكَ.

وفي رواية: أَنْفَقِي أَوْ ائْتَفِجِي، أَوْ ائْضَحِي، وَلَا تُحْصِي. فَيُحْصِي. اللَّهُ عَلَيَّكَ،

وَلَا تُوعِي فَيْوُوعِي اللَّهُ عَلَيَّكَ. (متفق عليه)

وَوَ ((أَنْفَعِي)) بِالْحَاءِ الْمُهْمَلَةِ، وَهُوَ بِمَعْنَى ((أَنْفَقِي)) وَكَذَلِكَ ((ائْضَحِي))

ترجمہ:- حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم

روک کر مت رکھو کہ تم پر روکا جائے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ تم بچا کر نہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے بچا کر رکھیں گے۔

سخی اور بخیل؛ ایک مثال

۵۶۰:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: مَثَلُ

الْبَخِيلِ وَالْمُنْفِقِ، كَمَثَلِ رَجُلَيْنِ عَلَيْهِمَا جُنْتَانِ مِنْ حَدِيدٍ مِنْ ثُدَيَّيْهِمَا إِلَى تَرَاقِيهِمَا. فَأَمَّا الْمُنْفِقُ: فَلَا يُنْفِقُ إِلَّا سَبَعَتْ - أَوْ وَفَرَتْ - عَلَى جِلْدِهِ حَتَّى تُخْفِي بَنَانَهُ، وَتَعْفُو أَثْرَهُ. وَأَمَّا الْبَخِيلُ: فَلَا يُرِيدُ أَنْ يُنْفِقَ شَيْئاً إِلَّا لَرِقَتْ كُلُّ حَلْقَةٍ مَكَانَهَا فَهُوَ يُوسِعُهَا فَلَا تَتَّسِعُ.

(متفق علیہ۔)

و((الْجُنَّةُ)): الدِّرْعُ، وَمَعْنَاهُ أَنَّ الْمُنْفِقَ كُلَّمَا أَنْفَقَ سَبَعَتْ،

وَطَالَتْ حَتَّى تَجَزَّ وَرَاءَهُ، وَتُخْفِي رَجْلَيْهِ وَأَثْرَ مَشْيِهِ وَخَطْوَاتِهِ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بخیل کی اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمی ہیں جن پر لوہے کی دوزر ہیں۔ جوڑائی کے موقع پر پہنی جاتی ہیں۔ ان کے سینے سے ہنسلوں تک ہوں، پس سخی کی حالت تو یہ ہے کہ اس نے جو نبی خرچ کیا تو وہ زرہ باسانی نیچے اتر گئی، یا اس کی کھال پر مکمل آگئی یہاں تک کہ اس نے اس کے پوروں کو بھی ڈھانپ لیا، اور وہ کرتے نیچے زمین کے ساتھ گھسٹ رہا ہے۔ اور بخیل کا حال ایسا ہے کہ جب بھی وہ خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ہر حلقہ اپنی جگہ چپک جاتا ہے، وہ اس کو کشادہ کرتا ہے، لیکن کشادہ نہیں ہوتی۔

افسادات:- آدمی جب اپنا کرتہ پہنتا ہے تو جسم کو اس میں داخل کرنے

کے لیے پہلے نچلا حصہ اپنے سر کے اوپر ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے نچلا حصہ اوپر آئے گا، پھر آستین داخل کرے گا، اور دھیرے دھیرے وہ کرتہ نیچے اتر کر پورے جسم کو ڈھانپ

لے گا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کرتہ تنگ ہوتا ہے تو اوپر ہی اوپر پھینس جاتا ہے، نیچے اترتا ہی نہیں، آدمی اس کو اتارنے کی محنت کرتا ہے، اس کے ہاتھ بھی اس میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن نیچے اترنے کا نام نہیں لیتا، اگر کرتہ کشادہ ہو تو آسانی کے ساتھ اتر جاتا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہی ہے، جب وہ چاہتا ہے تو اس کا دل اور طبیعت ایسی بنی ہوئی ہے کہ جیسے ہی اس نے خرچ کرنے کا ارادہ کیا، فوراً وہ بڑی آسانی سے خرچ کر لیتا ہے، خرچ کرنے کے معاملہ میں اس کے دل کی طرف سے ذرہ برابر بھی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ گویا اس کا حال ایسا ہے جیسے وہ کرتہ جو اس نے اوپر ڈالا تو بڑی آسانی سے نیچے تک اترتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس نے اس کے پاؤں بھی ڈھانپ لیے، اور وہ کرتہ نیچے زمین کے ساتھ گھسٹ رہا ہے۔

اور بخیل کا حال ایسا ہے کہ وہ خرچ کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کا مزاج اور طبیعت ساتھ نہیں دیتی، وہ ارادہ کرتا ہے تب بھی ہاتھ جیب کے اندر جاتے ہی نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کرتہ پہننے کے لیے اس کو اوپر سے ڈالا اور نیچے اتارنے کی بڑی کوشش کرتا ہے؛ لیکن کرتہ اترتا ہی نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بخل اور سخاوت کو ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مزاج اور طبیعت کی ہیں۔ بعضوں کی طبیعت میں سخاوت ہوتی ہے، جب بھی وہ کسی کارِ خیر میں خرچ کرنا چاہتے ہیں تو بڑی آسانی سے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور بعضوں کے مزاج میں بخل ہوتا ہے، وہ اگر کارِ خیر میں خرچ کرنے کا ارادہ بھی کریں تب بھی اس کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ تو سخی آدمی کارِ خیر میں خرچ کرنے کے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور بخیل آدمی کارِ خیر میں خرچ کرنے کے اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔

الکرم والجود او الانفاق فی وجوہ الخیر ثقة بالله تعالیٰ

سخاوت اختیار کرنا
اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے
نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

﴿ مجلس ۳ ﴾

۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱ جولائی ۲۰۰۰ء
سخاوت اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں یہ باب چل رہا تھا
بہت ساری روایتیں ذکر کیں، آخری دو روایتیں باقی رہ گئی ہیں۔

.....تو بخل کیوں؟

اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں درحقیقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی دل کی تنگیوں کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ اے اللہ! تو ہمارے دل کی تنگی کو دور کر دے۔ وجہ کیا ہے؟ آدمی جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرما رکھا ہے، اس میں کسی آدمی کی محنت و مشقت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ بات پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ اگر محنت و مشقت، یا آدمی کی صلاحیتوں پر، یا سٹرٹیفلکٹ اور پڑھائی پر روزی کی کمی اور زیادتی موقوف ہوتی؛ تو جن کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں وہ روزی سے محروم رہتے۔ ایک مزدور جسمانی طور پر جتنی محنت و مشقت اٹھاتا ہے، دفتر میں بیٹھنے والا سیٹھ اتنی محنت و مشقت نہیں اٹھاتا، اس کے باوجود دونوں کی روزی میں بیّن فرق ہے۔ روزی کے معاملہ میں تو اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دیتا ہے۔ تو جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی، آدمی اس کے خرچ کرنے میں آخر بخل اور تنگی سے کیوں کام لے؟

بغیر خرچ کئے سخاوت کا ثواب

آپ پہلے روایت پڑھ چکے ہیں، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مال و دولت کے استعمال کے اعتبار سے آدمیوں کی چار قسمیں ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کو

اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا، اس علم کی وجہ سے وہ اس مال کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور ناراضگی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سب سے اونچا مقام عطا فرماتے ہیں۔ اور دوسرا آدمی وہ جس کے پاس مال نہیں ہے، لیکن اس کو علم دیا گیا ہے، پہلے والے کو دیکھ کر یہ سوچتا اور تمنا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر مجھے بھی مال دیتا تو میں بھی مال کو اسی طرح نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کو بھی اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا۔ اب دیکھو کہ اس نے کیا خرچ کیا؟ پہلے آدمی نے تو خرچ بھی کیا اور دوسرے نے تو ایک پائی بھی خرچ نہیں کی، صرف دل میں ارادہ و نیت اور پختہ عزم ہے۔ اب اس کا ارادہ سچا ہے یا جھوٹا؛ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اور اجر دینے والے بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ کس کے دل میں کیا ہے۔ دنیا کے کسی آدمی کے سامنے تو ہم اپنی لچھے دار باتوں سے ہوسکتا ہے کہ دھوکہ دیدیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو ایسا نہیں ہے، وہ تو دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے کہ کس کی نیت سچی ہے اور کس کی جھوٹی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو نیکی کا ارادہ کرنے پر بھی بہت کچھ دیا جاتا ہے۔

دعا میں بھی سخاوت سے کام لو

دعا کا معاملہ ہی لے لو۔ ہم لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ ہم نے دل اتنا تنگ کر لیا ہے کہ دعا کے لیے جب بیٹھتے ہیں تو اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے گھر والوں کے لیے تو مانگتے ہیں، لیکن کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ساری امت اور ساری انسانیت کے لیے مانگیں، حالانکہ ہمیں اپنی جیب سے تو کچھ دینا نہیں ہے، صرف مانگنا ہے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہی کرنی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور یہ کہنا ہے: اے باری تعالیٰ! سب کو نوازئیے۔ اور جس کو کہا جا رہا ہے وہ تو ویسے بھی دینے والا ہے، اس کے خزانے

بھرے ہوئے ہیں۔ جب وہ ہمارے مانگنے پر ہماری ضرورتیں پوری کرے گا، تو ہمارے اسی مانگنے پر ساری دنیا کی ضرورتیں بھی پوری کرے گا، بلکہ وہاں تو وعدہ یہ ہے کہ آدمی اگر تنہا اپنے لیے مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ اس پر نہ دیا جائے۔ لیکن اگر وہ کسی اور کے لیے مانگتا ہے، تو فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں اور کہتے ہیں: "وَلَا تَكُ مِثْلَهُ"۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اتنا ہی دے۔ تو مانگنے میں بھی ہم اپنے دلوں کی تنگی کو ظاہر کرتے ہیں، حالاں کہ جب مانگنے ہی کے لیے بیٹھے ہیں تو پھر تنگی کیوں کی جائے، ساری دنیا کے لیے مانگو اور خوب مانگو۔ اسی طرح نیکی کے کاموں کا ارادہ کرنے کا بھی حال ہے۔

پچھتر ہزار مکاتب

حضرت حاجی فاروق صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، چند سال پہلے ہی انتقال ہوا، انہوں نے ایک بات فرمائی کہ ڈھا کہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ حافظ جی حضور کے نام سے مشہور تھے، بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے وہاں کی غریب آبادیوں اور دیہاتوں کے اندر مکاتب قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے بھی بلایا تو میں وہاں گیا، تو انہوں نے کہا: میں نے پچھتر ہزار (۵۰۰۰) مکاتب قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور وہ اس لائن سے کام بھی کر رہے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) مکاتب ہی قائم کر سکے تھے، لیکن دنیا سے گئے تو ثواب تو پچھتر ہزار (۵۰۰۰) مکاتب کا لے کر گئے۔ اتنا آسان مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں تنگی ہے۔

غور و فکر کی بات

جب آدمی دنیا میں آتا ہے تو سوچو کہ کیا لے کر آتا ہے؟ خالی ہاتھ آتا ہے، اور

جب جائے گا تب بھی خالی ہاتھ جائے گا، اپنے ساتھ پیسے لے کر نہیں جائے گا۔ اب شیطان آدمی کو دھوکہ میں ڈالتا ہے ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ﴾ شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے یعنی آدمی کو یہ فکر دلاتا ہے کہ تمہارا سارا مال ختم ہو جائے گا؛ تو تمہارے بچے کیا کھائیں گے؟ اگر تم خرچ کر دو گے تو تمہارے پاس کیا رہے گا؟

دیکھو! دنیا میں جتنے بھی نیکی کے کام ہو رہے ہیں، مسجدیں بن رہی ہیں، مدرسے اور مکاتب قائم ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریبوں، بیواؤں، مسکینوں کی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، بیماروں کے لیے ہسپتال قائم کروا رہے ہیں۔ پوری دنیا میں ضرورت مندوں کی ضرورتوں کے اور نیکی کے جتنے بھی کام ہو رہے ہیں، سب اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی کے ہاتھ سے کروا ہی رہا ہے، کوئی کام رکا ہوا نہیں ہے۔ اگر کہیں مسجد بن رہی ہے اور میں یا آپ پیسہ نہیں دیں گے، تو ایسا نہیں ہے کہ وہ مسجد نہیں بنے گی؛ مسجد تو کھڑی ہو کر رہے گی۔ اگر ہسپتال بن رہا ہے، اور میں یا آپ پیسہ خرچ نہیں کریں گے تو ایسا نہیں ہے کہ ہسپتال نہیں بنے گا؛ ہسپتال تو ضرور بنے گا۔ غریبوں کا علاج معالجہ ہوگا، یتیموں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کی جتنی بھی جگہ ہیں، وہاں ہمارے نہ دینے سے، یا ہمارے ہاتھ کھینچ لینے سے، یا ہمارے دل کی تنگی سے کوئی کام رکنے والے نہیں ہیں، بلکہ اس طرح کے سب کام ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سب کام کروا رہے ہیں تو اگر ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ لیں کہ: اے اللہ! تیرے یہ سب کام جن کے تو نے فیصلے کئے ہیں اور دنیا میں ہو رہے ہیں، مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں، مدارس قائم ہو رہے ہیں، مکاتب بنائے جا رہے ہیں، ہسپتالیں قائم ہو رہی ہیں، عسر یتیموں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں، بیماروں کے علاج معالجے ہو رہے ہیں، اور رفاہ عام کے سینکڑوں کام دنیا

میں ہو رہے ہیں اور اے اللہ! تو اپنے خزانوں سے دیتا ہے، اپنی مخلوق ہی میں سے کسی نہ کسی کو تو واسطہ بنا رہا ہے، تو اے اللہ! تیرا احسان اور فضل ہوگا اگر تو مجھے بھی ان کاموں کے لیے واسطہ بنا لے۔ اگر ہم یہ دعا کر لیں تو اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کیا کمی ہے؟

دل کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے

اصل تو یہ ہے کہ ہمارا ہی دل تنگ ہے، اپنے دل کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ نیکی کے کاموں میں خرچ کر رہے ہیں، ہسپتال قائم کروا رہے ہیں، غریبوں کے علاج و معالجہ پر ہزاروں لاکھوں خرچ کرنے والے دنیا میں موجود ہیں۔ حاجی ابراہیم صاحب یہاں موجود ہیں، ان سے پوچھ لو! ایسے ایسے لوگ آتے ہیں اور کہہ جاتے ہیں کہ ہماری طرف سے پچاس لاکھ، اور ایک کروڑ لیجئے۔ تو کیا جنہوں نے یہ پیسے دئے ہیں وہ غریب و محتاج ہو گئے؟ کیا ان کی اولاد معوذ باللہ لوگوں کے سامنے بھیک مانگ رہی ہیں؟ نہیں۔ بلکہ جتنا انہوں نے دیا، اللہ تعالیٰ نے اس سے زیادہ ان کو دیا۔ آپ پہلے پڑھ ہی چکے ہیں کہ فرشتے دعا کرتے ہیں: ”اللَّهُمَّ اَعْطِ مَنْفِقًا خَلْفًا“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں جن کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ روزانہ دعا کرتے رہیں: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اچھا بدلہ عطا فرما۔

یہ شانِ کریمی کے خلاف ہے

اور دیکھو! اللہ تعالیٰ تو ایسے کریم ہیں کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کے خلاف ہے کہ بندہ تو نقد دے اور اللہ تعالیٰ صرف ادھار وعدہ کرتا رہے؛ ایسا نہیں ہو سکتا۔ آخرت میں تو اللہ تعالیٰ دے گا ہی؛ دنیا میں نقد بدلہ بھی دیتا ہے۔ جو خرچ کرتے ہیں ان سے جا کر پوچھ لو۔ اس لیے آدمی یوں نہ سمجھے کہ خرچ کرنے سے کمی

آئے گی۔ یہ شیطانی دھوکہ ہے، شیطان آدمی کو ورغلا تا ہے۔ آدمی جتنا خرچ کرے گا وہ اس کے فائدہ کی چیز ہے، اور اس سے کمی آنے والی نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اور اضافہ ہی کریں گے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے قصے تو آپ حضرات نے سنے ہی ہوں گے۔ وہ لوگ تو ایسے تھے کہ اپنی ذات پر ایک پائی بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے تھے، لیکن اللہ کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما اور ان کے بعد دنیا میں جتنے بھی اسخیاء گزرے ہیں جنہوں نے اللہ کے راستہ میں بے شمار دولت خرچ کی ہے؛ کیا ان کی دولت گھٹ گئی؟ نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دیا کہ مرتے وقت جو چھوڑا اس کی تقسیم کرنے والوں کے لیے حساب کرنا مشکل ہو گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ان کی وراثت تقسیم ہوئی تو سونا کلباڑی سے توڑا گیا (جس کا تفصیلی قصہ جلد: ۳/ ص: ۱۰۳ تا ۱۱۰ پر قابل مطالعہ ہے۔ مرتب۔) بہر حال! یہ چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حلال خرچ کرنے کی برکت

۵۶۱:- وعنه قال قال رسول الله ﷺ: مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلٍ تَمَّتْ رِزْقُهُ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللَّهُ إِلَّا الطَّيِّبَ، فَإِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُهَا بَيِّنِينَ، ثُمَّ يُرِيهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرِي بَنِي أَحَدِكُمْ فَلَوْهُ حَتَّى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کسی نے اللہ کے راستہ میں ایک کھجور کے برابر حلال کمائی میں سے صدقہ کیا، اور چوں کہ اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ (بڑی خوشنودی کے ساتھ) اپنے دائیں ہاتھ سے لیتے ہیں، پھر اس خرچ کئے ہوئے کو دینے والے ہی کے لیے بڑھاتے ہیں جیسے تم میں

سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے کے بچے، یا گائے کے بچھڑے کو پالتا اور اس کی پرورش کرتا ہے۔
افادات:- کھجور کا ایک دانہ کیا حیثیت رکھتا ہے؛ لیکن یہاں ایک ہی دانہ کا تذکرہ ہے، اور قید ہے کہ حلال کمائی میں سے ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول کرتا ہے، حرام کو قبول نہیں کرتا۔

آج ہمارے اس زمانہ میں ایک اور مصیبت آگئی ہے کہ بہت سے لوگ یوں سوچتے ہیں کہ غلط طریقہ سے دولت حاصل کر لو، بعد میں اس کا کچھ حصہ نیکی کے کاموں میں خرچ کر دیں گے۔ اس طرح کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ کمائی کی دھلائی ہو گئی اور کفارہ ہو گیا۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث اور فقیہ گزرے ہیں، بڑے بزرگ بھی ہیں، ان کا مقولہ ہے: جو آدمی حرام کمائی میں سے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسے ناپاک کپڑے کو پیشاب سے دھو کر پاک کرنے کی کوشش کرے۔ حالاں کہ ناپاک کپڑا پیشاب کے ذریعہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا، اس کو پاک کرنے کے لیے پانی ہی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح حرام کمائی سے جو صدقہ دیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہی نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو پاکیزہ ہی کو قبول کرتا ہے۔ اگر کوئی آدمی غلط چیز لا کر ہمیں دے، اور بعد میں معلوم ہو؛ تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ کیا ہم اس کو منظور رکھیں گے؟ نہیں۔ جب ہماری اور آپ کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرتی؛ تو اللہ تعالیٰ کیسے قبول کریں گے؟۔

جب کھجور کا ایک دانہ پہاڑ بن جاتا ہے!

اگر ہم پاکیزہ اور حلال کمائی میں سے ایک کھجور کا دانہ بھی صدقہ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بڑی خوشنودی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ سے لیتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اس کے یہاں دائیں بائیں کا کوئی فرق نہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ دائیں ہی ہیں (۱)

(ثُمَّ يَرْبِيهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يَرْبِي أَحَدُكُمْ فَلَوْهٗ) اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرنے بعد خرچ کرنے والے کے لیے اس کو بڑھاتے ہیں جیسے تم میں سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے کے بچے، یا گائے کے بچھڑے کو پالتا اور اس کی پرورش کرتا ہے، یہاں تشبیہ گھوڑے کے بچھڑے کے ساتھ اس لیے دی گئی ہے کہ اس کی نشوونما بہت تیزی کے ساتھ ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ صدقہ کی ہوئی کھجور کو اتنا جلدی بڑھاتا ہے کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ کہاں کھجور کا صرف ایک دانہ اور کہاں پہاڑ! مطلب یہ ہے کہ ایک معمولی چیز بھی اگر آپ نے اللہ کی راہ میں خرچ کی ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو بڑھا کر بہت زیادہ کر دیا جاتا ہے، اور اس میں نہایت برکت ہوتی ہے۔

ایک تہائی خرچ کرنے کی برکت

۵۶۲:- وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: بَيْتًا رَجُلٌ يَمْشِي - بِفَلَاحٍ مِنَ الْأَرْضِ، فَسَمِعَ صَوْتًا فِي سَحَابَةٍ: اسقِ حَدِيقَةَ فُلَانٍ، فَتَنَسَّى ذَلِكَ السَّحَابَ فَأَفْرَغَ مَاءَهُ فِي حَرَّةٍ، فَإِذَا شَرِبَتْهُ مِنْ تِلْكَ الشَّيْءِ. أَحْجَدِ اسْتَوْعَبَتْ ذَلِكَ الْمَاءَ كُلَّهُ، فَتَنَبَّحَ الْمَاءَ، فَإِذَا رَجُلٌ قَائِمٌ فِي حَدِيقَتِهِ يُحْوِلُ الْمَاءَ بِمَسْحَاتِهِ، فَقَالَ لَهُ: يَا عَبْدَ اللَّهِ! مَا اسْمُكَ؟ قَالَ: فُلَانٌ لِلَّاسِمِ الَّذِي سَمِعَ فِي السَّحَابَةِ. فَقَالَ لَهُ: يَا عَبْدَ اللَّهِ! لِمَ تَسْأَلُنِي عَنِ

اسْتَمِعِي؟ فَقَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ صَوْتًا فِي السَّمَاءِ حَابِ الَّذِي هَذَا مَا وُكُ. يَقُولُ: اسْتَمِعِي حَدِيثَةً فَلَا نَ لَاسِمَاكَ، فَمَا تَصْنَعُ فِيهَا؟ فَقَالَ: أَمَا إِذْ قَدْتُ هَذَا، فَإِنِّي أَنْظُرُ إِلَى مَا يَخْرُجُ مِنْهَا، فَأَتَصَدَّقُ بِشُلُثِهِ، وَأَكُلُ أَنَا وَعِيَالِي ثُلُثًا، وَأُرَدِّفُهَا ثُلُثَهُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد

نقل کرتے ہیں کہ: ایک آدمی ایک ویران صحراء میں سے گزر رہا تھا، اوپر سے ایک بادل گزرا، اس آدمی نے اس بادل میں سے آواز سنی، کوئی اس بادل کو کہہ رہا تھا: فلاں آدمی کے باغ اور کھیتی کو پانی پلا اور سیراب کر۔ یہ آواز اس آدمی نے بھی سنی، اس کے بعد اس نے دیکھا کہ اس بادل میں سے ایک ٹکڑا الگ ہو گیا اور آگے جا کر اس کا پورا پانی ایک پتھر لی زمین پر برسا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی نالیاں اور ایک نہر بنی ہوئی تھی، وہ سارا پانی جمع ہو کر ان نالیوں کے اندر آ گیا اور اس نہر میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ آدمی اس پانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تاکہ دیکھے کہ یہ پانی کہاں جاتا ہے۔ آگے جا کر دیکھا تو ایک آدمی اپنے باغ میں پھاوڑ لے کر اپنے باغ میں پانی داخل کر رہا تھا اور پھاوڑے کے ذریعہ سے پانی کا رخ اپنے باغ کی طرف پھیر رہا تھا۔ اس آدمی نے اس باغ اور باڑی والے سے پوچھا: او بھائی! تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: میرا نام یہ ہے۔ اس کا وہی نام تھا جو اس نے بادل کے اندر سے سنا تھا۔ اس باغ والے نے پوچھا: اے اللہ کے بندے! تو مجھ سے میرا نام کیوں پوچھ رہا ہے؟ تجھے کیا ضرورت پیش آئی؟ اس نے کہا: اس نالی کے ذریعہ سے جو پانی آ رہا ہے اور تو نے پھاوڑے سے اس کا رخ پھیر کر اپنے باغ کے اندر داخل کیا ہے، یہ پانی جس بادل سے برسا، اس بادل میں سے تیرے نام کے ساتھ یہ آواز آئی تھی۔ (گو یا کوئی کہنے والا اس بادل سے کہہ رہا تھا کہ فلاں کے کھیت کو پانی پلا اور تیرا ہی نام لیا تھا۔) اب تو بتا کہ آخر کون سی بات ہے جس کی وجہ سے

تیرے لیے یہ سارے انتظامات ہو رہے ہیں؟ تیرے اندر وہ کون سی ایسی خوبی ہے؟ اس نے کہا: بھائی دیکھ! جب تو نے یہ بات مجھے بتلا ہی دی؛ تو اب میرے لیے بھی ضروری ہو گیا کہ میں کیا کرتا ہوں وہ تجھے بتلا دوں۔ اس کھیتی میں جو کچھ پیداوار ہوتی ہے، میں اس کے تین حصے کرتا ہوں۔ ایک تہائی حصہ تو اللہ کے راستہ میں حشر چ کرتا ہوں۔ ایک تہائی میں اور میرے بال بچے کھاتے ہیں۔ ایک تہائی حصہ جمع رکھتا ہوں تاکہ آئندہ سال اس کو دوبارہ بونے کے کام میں لاؤں۔

دیکھو! پورا مال صدقہ نہیں کرتا تھا؛ بلکہ تیسرا حصہ خرچ کرتا تھا، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے یہ سارے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اپنی کمائی کے اندر سے کچھ حصہ مقرر کر لے جو اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جاتا ہو۔

ہمارے اسلاف کا عمل

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ: حضرت کے پاس جو کچھ آتا تھا اس کے تین حصے کر لیتے تھے، اس میں سے ایک حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا کرتے تھے۔

خود حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ان کے صاحبزادے حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ والد صاحب کا یہی معمول تھا۔ آدمی کے پاس جو پیسے آتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جس میں آدمی کی محنت کو دخل ہوتا ہے، اور دوسرے وہ جو بغیر محنت کے آئیں، مثلاً آپ ملازمت، تجارت، یا محنت مزدوری کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں کچھ پیسے آتے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ کسی نے ہدیہ دیا، کوئی چیز بھیج دی۔ تو محنت کے نتیجہ میں جو آتا، اسی وقت اس کا بیسواں حصہ الگ کر لیتے تھے، مثلاً دس روپے کا نوٹ ہے، اس کا بیسواں حصہ یعنی پچاس پیسے

نکال کر الگ کر لیتے تھے۔ یہ نہیں سوچتے تھے کہ ابھی کھلے نہیں ہیں تو بعد میں الگ کر لیں گے؛ بلکہ اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ جس وقت وہ ہاتھ میں آتا تھا اور کھلے پاس ہوتے تو اسی وقت الگ کر دیتے۔ اور اگر کھلے نہیں ہوتے تو بڑے اہتمام کے ساتھ اسی وقت آدمی کو بازار بھیج کر کھلے کرواتے، اور اس میں سے بیسواں حصہ الگ کر دیتے۔ اور جو مال بغیر محنت کے آتا تھا اس کا دسواں حصہ الگ کرتے تھے۔ اور ایک تھیلی الگ ہی رکھی تھی، جو رقم بھی الگ کرتے، اس تھیلی میں ڈالتے رہتے تھے، پھر نیسکی کے کاموں میں جہاں کہیں خرچ کرنے کی نوبت آتی؛ اس میں سے خرچ کرتے رہتے اس لیے ہر آدمی کو چاہئے کہ ایسا کوئی انتظام کر لے، پھر اہتمام سے اس پر عمل کرے۔

نفس کا مکر اور اس کی پکڑ

اور نفس پر ذرا بھی اطمینان نہیں ہے۔ بہت سی مرتبہ ہم سوچتے ہیں کہ بعد میں یہ کام کر لیں گے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو آدمی کسی نیسکی کے کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرے، اس میں دیر نہ کرے، معلوم نہیں کہ کب دل پلٹ جائے۔ اور اگر دل نہ پلٹے تب بھی شیطان اس میں کچھ نہ کچھ کمی تو کروا ہی دیتا ہے، مثلاً: پہلے ہزار روپے خرچ کرنے کی نیت کی تھی، لیکن خرچ کرتے وقت شیطان ہزار کے بجائے پانچ سو، یا سو پچاس تو کم کروا ہی دے گا۔ بہت سی مرتبہ تو بالکل ہی ختم کروا دیتا ہے۔ دل میں یہ خیال اور وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ کام فرض تو ہے نہیں، نفل ہی ہے نا، ابھی نہیں بلکہ بعد میں خرچ کریں گے۔ مگر دیکھو ایک بات یاد رکھنا! آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل میں جو معاملہ کرتا ہے، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے آدمی لوگوں کو تو دھوکہ دیتا ہی ہے، اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں بھی یہی حلالا کی کرنے کی

سوچتا ہے۔ مثلاً: دل میں نیت کرتا ہے کہ میرے اس سودے میں نفع ہو گیا تو میں اس کا دس فیصد (۱۰%) فلاں نیکی کے کام میں خرچ کروں گا۔ اب جتنا سوچا تھا اسی کے مطابق نفع ہو گیا، جب نفع ہاتھ میں آیا تو اب سوچتا ہے کہ نفع ایک لاکھ ہوا، تو دس فیصد تو دس ہزار ہو جاتے ہیں۔ پہلے جب دس فیصد بول رہا تھا، اس وقت نہیں سوچا تھا، اب سوچ رہا ہے کہ دس ہزار نکالنا تو مشکل ہے۔ لہذا دل ہی دل میں ادھر ادھر کی تاویل کرنا شروع کرتا ہے، اور کسی نہ کسی طرح دس ہزار میں کمی کر ہی ڈالتا ہے۔ بعض تو ایسے ہیں کہ کہہ دیتے ہیں کہ بعد میں دیں گے۔ بعض وہ ہوتے ہیں کہ دس ہزار کے پانچ ہزار کر ڈالتے ہیں۔ لیکن دیکھو بھائی! اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کون سی کمی ہے؟ اگر نہیں دینا ہے تو پانچ ہزار بھی کیوں خرچ کرتے ہو؟ یہ دے کر کیا اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان کر رہے ہو؟ نعوذ باللہ! کیا اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کمی ہے، اس لیے پانچ ہزار بھی دے رہے ہو؟

نیت کا اثر..... سبق آموز قصہ

ایک قصہ یاد آیا، حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (جو ہمارے تمام بزرگوں کے شیخ ہیں اور ہمارے اکثر سلسلے وہیں ملتے ہیں، ان) کے شیخ تھے۔ جس زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون میں خانقاہ کی مسجد میں آکر قیام پذیر ہوئے، اس وقت مسجد کو درست کرنے اور اس میں کمرہ وغیرہ بنانے کی ضرورت تھی۔ ایک آدمی حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دعا کے لیے آیا، اس کی جائیداد پر کوئی دوسرا قابض ہو گیا تھا اور اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس نے آکر حافظ نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے دعا کی درخواست کی کہ: حضرت! دعا فرما دیجئے کہ جائیداد پر دوسرا آدمی قابض ہو گیا ہے، مقدمہ چل رہا ہے، اللہ

تعالیٰ اس کے ہاتھ سے چھڑا دے، اور مجھے کامیابی دے۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بھائی دیکھو! ہمارے حاجی صاحب کی مسجد میں کمرہ نہیں ہے، ان کو فلاں فلاں ضرورت ہے (جو جو ضرورت تھی وہ ساری بتائی) وہ کام تم کرا دو، ہم تمہارے لیے دعا کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ اس نے کہا: حضرت! ضرور کرا دوں گا۔ حضرت نے دعا کر دی اور وہ مقدمہ میں کامیاب ہو گیا، واپس آ کر اطلاع بھی دی۔ اب اس کے دل میں چور آیا، اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ بہت سارا کام ہے، چلو! ایسا کرتا ہوں کہ آدھا بنا دوں۔ ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ کورٹ سے آدھی جائیداد چھوڑنے کا آرڈر آ گیا۔ اس نے آ کر حافظ صاحب سے کہا: حضرت! جائیداد تو آدھی ہی چھوٹی۔ حضرت نے فرمایا: کیا کریں! یہ تو تمہارے اختیار میں تھا۔ ہم نے تو دعا پوری کے لیے کی تھی، تم نے اپنے ہی ہاتھ سے اس کو آدھا کر دیا۔ تم نے اپنی نیت بدل دی، تو وہاں سے فیصلہ بھی ایسا ہی ہو گیا۔

تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی سوچتا ہے کہ ابھی نہیں دیتے، بعد میں دیں گے تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ابھی دوسرا سودا بھی تو آنے والا ہے۔ اس لیے آدمی کو شیطان کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے۔ شیطان آدمی کو فقر سے ڈراتا ہے، کہتا ہے کہ تم اتنا سب خرچ کرو گے تو مال کم ہو جائے گا، ابھی فلاں ضرورت باقی ہے، پہلے وہ پوری کر لو بعد میں دوسرا مال بھی تو آنے والا ہے، اس وقت نکال لیں گے۔ اور شیطان تم کو برائی کا (یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرنے کا) حکم کرتا ہے۔ اس لیے انسان کو شیطان کی باتوں پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

النَّهْيُ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ

بخل اور لالچ ملے ہوئے بخل کی مذمت

۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۷ جولائی ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِیْهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضِلِّهٗ
 فَلَا هَادِیَّ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا
 مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَوَعَلٰی اٰلِهٖ وَاصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا
 كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ:-

بخل و شح کا معنی

نیاباب قائم کیا ہے: ”اللَّهُمَّ عَنِ الْبُخْلِ وَالشَّحِّ“ ”بخل“ سخاوت کی ضد ہے، یہ بھی نفس کی ایک بیماری ہے کہ آدمی کی طبیعت میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا مزاج نہ ہو۔ دوسری چیز ”شح“ ہے جو بخل ہی کی ایک قسم ہے لیکن اور زیادہ خطرناک ہے کہ مزاج میں بخل بھی ہو اور ساتھ میں حرص اور لالچ لُج بھی ہو، جیسے بعض لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج کے اندر خرچ کرنے کا مادہ تو نہیں ہوتا، لیکن ساتھ میں حرص بھی ہوتی ہے۔ تو ایسا بخل جو حرص کے ساتھ ملا ہوا ہو؛ اسی کو ”شح“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جہنم کا راستہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ﴾ جس نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے بخل کیا اور آخرت کی طلب سے بے پروا ہی برتی۔ خرچ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں جو بدلہ ملنے والا ہے اس کو جھٹلایا، یعنی اس پر یقین نہیں کیا؛ تو ہم اس کے لیے جہنم کا راستہ آسان کر دیں گے ﴿وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ﴾ جب اس کی ہلاکت کا وقت آئے گا تو اس کا مال

کچھ بھی کام نہ دے گا۔ آدمی اس امید پر مال جمع کرتا ہے کہ وقت پر کام آئے گا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی پکڑ ہونے لگتی ہے تو پھر وہ کام نہیں دیتا۔

نعمتیں صحیح جگہ استعمال نہ کرنے کی نحوست

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے کاموں میں خرچ کرنے کا وقت آتا ہے (اور اس کے سامنے مطالبہ بھی رکھا گیا) پھر باوجود خرچ کرنے کی استطاعت کے خرچ نہیں کرتا؛ تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور گناہ کے کاموں میں خرچ کرنے کی نوبت آتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو ترغیب دی جاتی ہے، ان کے پاس پیسے بھی موجود ہوتے ہیں، خرچ بھی کر سکتے ہیں، لیکن نہیں کرتے؛ ایسے لوگوں کے پیسے پھر مقدمہ بازی اور ڈاکٹروں کے یہاں، وکیلوں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں۔ یا ان کی اولاد ایسی ناہنجار نکلتی ہے کہ وہ اس مال کو جوئے سٹے اور گانے بجانے میں استعمال کر دیتی ہے۔ مال جب نیکی کے کام میں خرچ نہیں ہوگا تو گناہ کے کام میں خرچ کرنے کی نوبت آئے گی۔

اسی روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، آپ نے فضائلِ حج میں سنا ہوگا کہ جب کسی آدمی پر حج فرض ہو جاتا ہے، پھر وہ کسی دنیاوی کام کی وجہ سے حج کے لیے نہیں جاتا، یہ سوچتا ہے کہ آئندہ سال جائیں گے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ: لوگ حج کر کے آجائیں گے اور اس کا دنیاوی کام ابھی تک نہیں ہوا ہوگا۔ جس کام کے لیے حج کو ٹالا تھا، وہ کام بھی نہیں ہوا اور حج بھی رہ گیا۔ اور جو آدمی اپنے پاؤں کو اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرنے کے لیے مشقت نہیں دیتا، تو پھر اس کے پاؤں گناہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ اب ہمارے اختیار کی بات ہے کہ ہم اپنے لیے کون سی راہ چنتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ اور جو آدمی اپنے نفس

کے بخل سے بچالیا گیا؛ وہی کامیاب ہے۔

ظلم و شح سے بچو

۵۶۳:- وعن جابر بن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: اتَّقُوا الظُّلْمَ؛ فَإِنَّ

الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. وَاتَّقُوا الشُّحَّ؛ فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلَى أَنْ سَفَكُوا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوا حِمَارَهُمْ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: ظلم وزیادتی سے، اور کسی کا حق مارنے سے بچو؛ کیوں کہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل اختیار کرے گا۔ اور وہ بخل جو حرص و لالچ کے ساتھ ملا ہوا ہو، اس سے بھی بچو؛ اس لیے کہ اسی بخل نے جو لالچ کے ساتھ ہوتا ہے، تم سے اگلوں کو ہلاک کیا کہ انہوں نے اسی کے نتیجے میں خون بہائے، آپس میں قتل و قتال اور لڑائی جھگڑے کی نوبت آئی۔ اور اسی بخل و حرص کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ایسا بخل جو لالچ کے ساتھ ہو، یہ ایک ایسی

برائی اور ایسا رذیلہ اور دل کی ایسی بری صفت ہے جس کے نتیجے میں آدمی بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جب آدمی بخل کی وجہ سے کسی کا حق ادا نہیں کرے گا، کسی کا مطالبہ پورا نہیں کرے گا، مثلاً: بھائی کا یا پارٹنر کا حق دبا کر بیٹھا ہے وہ نہیں دیتا، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ لڑائی ہوگی، خون خرابہ ہوگا، آپس میں جھگڑے کی نوبت آئے گی۔ اس کے بالمقابل طبیعت اور مزاج میں انفاق اور سخاوت کا مادہ ہے، تو پھر ان ساری برائیوں کی نوبت نہیں آئے گی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں ان ساری چیزوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

بَابُ الْإِيْثَارِ وَالْمُوَاسَاةِ ایشارا اور غم خواری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِنَا اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهٗ
فَلَا هَادِيَ لَهُوْ نَشْهَدُ اَنَّ اِلٰهَ الْاِلٰهَاتِ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَوَلَدَنَا
مُحَمَّدًا عَبْدًا وَرَسُوْلَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا
كَثِيْرًا - اَمَّا بَعْدُ :-

﴿وَيُؤْتِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر: ۹) ﴿وَيُطْعَبُوْنَ الطَّعَامَ
عَلٰی حُبِّهِ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا﴾ (الدهر: ۸)

ایثار اور مواسات کا مطلب

باب کا عنوان قائم کیا ہے: باب الاِیثار والمواسات ”ایثار“ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دے، مثلاً: کھانا موجود ہے، خود بھی بھوک لگ رہی ہے، طبیعت میں کھانے کا تقاضہ ہے، اس کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہوئے ان کو کھلا دے؛ اس کو ”ایثار“ کہتے ہیں۔ گجراتی میں اسی کو ”تیگ بھاونا“ (त्याग भावना) کہتے ہیں کہ وہ چیز خود استعمال کرنے کے بجائے دوسروں کے لیے چھوڑ دے، دوسروں کو اپنے مقابلہ میں ترجیح دے۔

”مواسات“، یعنی غم خواری۔ کسی مصیبت زدہ کی مصیبت میں آپ بھی شریک ہو جائیں؛ اسی کو ”مواسات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿يُؤْتِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ وہ خود فاقہ سے اور ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اس آیت کا شان نزول آگے

جو روایت آرہی ہے اس میں بتلایا ہے۔ اس میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خاص طور پر انصار کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ ان حضرات کی شان یہ ہے کہ خود محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں اس کے باوجود اپنے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا دوسرا ارشاد نقل کیا: ﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ خود کھانے کی چاہت ہے، کھانے کی طرف میلان ہے، طبیعت میں تقاضہ موجود ہے، اس کے باوجود مسکین، یتیم کو اور قیدی کو کھلاتے ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے کرتے ہیں۔

بعضوں نے ”حُبِّهِ“ میں ضمیر کو باری تعالیٰ کی طرف لوٹا کر کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی بنیاد پر ان لوگوں کو کھلاتے ہیں۔

ایثار کرنے پر اللہ تعالیٰ خوش ہو گئے

ایثار کا وصف حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں کیسا موجود تھا اس کو اس روایت

میں بتلاتے ہیں۔

۵۶۴:- وعن أبي هريرة عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: إِنِّي مَجْهُودٌ، فَأَرْسَلْ إِلَى بَعْضِ نِسَائِهِ، فَقَالَتْ: وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا عِنْدِي إِلَّا مَاءٌ، ثُمَّ أُرْسِلَ إِلَى الْآخَرَى، فَقَالَتْ مِثْلَ ذَلِكَ، حَتَّى قُلْنَ كُلُّهُنَّ مِثْلَ ذَلِكَ: لَا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا عِنْدِي إِلَّا الْمَاءُ. فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ يُضَيِّفْ هَذَا اللَّيْلَةَ؟ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ: أَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ. فَأَنْطَلَقَ بِهِ إِلَى رَحْلِهِ، فَقَالَ لَامْرَأَتِهِ: أَكْرِمِي ضَيْفَ رَسُولِ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم.

وفی روایتی قَالَ لَامْرَأَتِهِ: هَلْ عِنْدَكَ شَيْءٌ؟ فَقَالَتْ: لَا! إِلَّا اقْوَات

صَبِيَانِي. قَالَ: فَعَلَّلِيْنِي بِمِشْيِءٍ، وَإِذَا أَرَادُوا الْعَشَاءَ فَتَوِّمِيْهِمْ، وَإِذَا دَخَلَ ضَيْفُنَا فَاطْفِي السِّرَاجَ، وَأَرِيْهِ أَتَانَا كُلُّهُ. فَتَقَعْدُوا وَأَكَلِ الضَّيْفَ، وَبَاتَا طَائِفِيْنَ. فَلَمَّا أَصْبَحَ غَدَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: لَقَدْ عَجَبَ اللَّهُ مِنْ صَنِيعِكُمْمَا بِضَيْفِكُمَا اللَّيْلَةَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع شرح: - حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ

ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں مصیبت زدہ ہوں، مجھے فاقہ اور مصیبت لاحق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے (اس کی ضرورت کو اپنی طرف سے پورا کرنے کی خاطر) ایک آدمی کو اپنی ازواج میں سے ایک کے یہاں بھیجا (کہ اگر کچھ کھانے کی چیز ہو تو بھیج دو) انہوں نے جواب دیا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے، میرے پاس سوائے پانی کے اور کچھ بھی نہیں ہے (وہ آدمی یہ جواب لے کر آیا) پھر نبی کریم ﷺ نے اپنی دوسری زوجہ مطہرہ کے یہاں آدمی بھیجا، انہوں نے بھی وہی جواب دیا، یہاں تک کہ تمام ازواج مطہرات نے یہی جواب دیا۔ (اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کا اور ازواج مطہرات کا گزر بسر کیسے ہوتا تھا) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس آدمی کو آج کی رات مہمان بنا کر اپنے یہاں کون لے جاتا ہے؟ ایک انصاری نے کہا: اللہ کے رسول! میں اس کی میزبانی کا فریضہ انجام دوں گا۔ (روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوتیلے والد ہوتے ہیں انہوں نے یہ پیشکش کی تھی) چنانچہ وہ اس مصیبت زدہ صحابی کو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گئے اور (اپنی بیوی سے کہا) کہ دیکھو! یہ نبی کریم ﷺ کے مہمان ہیں) ان کا اکرام کرو (مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے مہمان کے ساتھ ان کی خدمت گزاری، ان کے اکرام اور عزت و احترام کا جو معاملہ کرنا چاہیے، وہ پورے طور پر ملحوظ رہے) دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی

بیوی سے پوچھا: کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟ (یعنی گھر میں کوئی چیز ہے جو کسی کے سامنے پیش کی جاسکے؟) اس نے بتایا کہ سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہیں ہے (یعنی صرف بچوں کے کھانے کے لیے کچھ رکھا ہے) تو انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: بچوں کو جب کسی چسیز کی ضرورت ہو، اور جب شام کا کھانا مانگیں تو ان کو بہلا پھسلا کر سلا دینا، اور رات کے وقت جب میں مہمان کو لے کر آؤں (اور ہم کھانے کے لیے بیٹھیں) اس وقت چراغ بجھا دینا (ہم مہمان کو ایسا تاثر دیں گے کہ ہم بھی کھا رہے ہیں۔ چنانچہ جب مہمان آئے، سب کھانے کے لیے بیٹھے تو ان کی اہلیہ نے چراغ بجھا دیا) مہمان نے کھانا کھایا (اور یہ دونوں کھانے کا محض دکھلاوا کرتے رہے، جیسے ہاتھ میں لقمہ بنا کر منہ تک لے جاتے اور منہ ہلاتے رہتے) اس طرح خود بھوکے رہ کر رات گزاری۔ صبح کے وقت جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں وہ صحابی حاضر ہوئے تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رات کو تم دونوں (میاں بیوی) نے اپنے مہمان کے ساتھ جو معاملہ اور سلوک کیا (جس ایثار سے کام لیا کہ تم خود بھی بھوکے اور ضرورت مند تھے اس کے باوجود خود کھانا کھانے کے بجائے مہمان کے لیے وہ کھانا پیش کر دیا، اور اپنے مقابلہ میں مہمان کو ترجیح دی) اس پر اللہ تعالیٰ بہت خوش اور راضی ہوئے

دو کا کھانا تین کو کافی ہے

۵۶۵:- وعنه قال: قال رسول الله ﷺ: طَعَامُ الاثْنَيْنِ كَافِي

الثَّلَاثَةِ، وَطَعَامُ الثَّلَاثَةِ كَافِي الْارْبَعَةِ. (متفق علیہ)

وفي رواية لِمُسْلِمٍ: عن جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: طَعَامُ الْوَاحِدِ

يَكْفِي الاثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الاثْنَيْنِ يَكْفِي الْارْبَعَةَ، وَطَعَامُ الْارْبَعَةِ يَكْفِي السَّمَاوِيَةَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے کافی ہو جاتا ہے، اور تین کا چار کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔
مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہ ہے کہ ایک کا کھانا دو کو کافی ہو جاتا ہے اور دو کا چار کو اور چار کا آٹھ کو کافی ہو جاتا ہے۔

افادات:- اگر کھانا اتنا ہی ہو کہ دو آدمی شکم سیر ہو کر کھا سکیں، پھر اس کے اندر تیسرے کو بھی شریک کر لیا جائے، تو اگر چہ تینوں کا پیٹ گلے تک نہیں بھرے گا؛ لیکن اس کھانے میں سے تینوں اتنا کھالیں گے جس سے تینوں کی بھوک مٹ جائے گی اور ضرورت پوری ہو جائے گی۔

در اصل یہ ارشاد فرما کر نبی کریم ﷺ غم خواری کی تعلیم دے رہے ہیں کہ دو آدمی اگر کھانا لے کر بیٹھے ہوں اور ان کو خیال ہو کہ ہم یہ کھانا شکم سیر ہو کر کھائیں گے تو ان کو چاہیے کہ تیسرا آدمی جو بھوکا اور ضرورت مند ہے، اس کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیں۔ گویا دوسرے کے غم اور تکلیف کو بانٹ لو، اس کے غم میں شریک ہو جاؤ، تھوڑی سی تکلیف اپنے اوپر لے لو۔ کسی کے ساتھ اس کے غم و مصیبت میں شریک ہو جانا: اسی کو مواسات اور غم خواری سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب دو آدمی اپنے کھانے میں تیسرے کو شریک کر لیں گے، یا تین آدمی چوتھے کو شریک کر لیں گے، تو یہ صفت اپنے اندر پیدا ہو جائے گی اور اسی کی نبی کریم ﷺ نے ترغیب دی ہے۔

ضرورت سے زائد کو خرچ کر دو

۵۶۶:- وعن أبي سعيد بن الخدري رضي الله عنه قال: بيئنا نحن في سفرٍ مع النبي ﷺ إذ جاء رجلٌ على راحلةٍ له، فجعل يصرِفُ بصرَهُ يميناً وشمالاً، فقال رسول الله ﷺ: مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلٌ ظَهَرَ فَلْيُعِدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا ظَهَرَ لَهُ، وَمَنْ كَانَ لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيُعِدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا زَادَ لَهُ. فَذَكَرَ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ مَا

ذکر، حَتَّىٰ رَأَيْنَا أَنَّهُ لِأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ . (رواہ مسلمہ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں جا رہے تھے، ایک آدمی اپنی سواری پر سوار ہو کر آیا، اور اپنی ننگا ہیں دائیں بائیں دوڑانے لگا (جیسے ضرورت مند آدمی ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو میری ضرورت کو پورا کر سکے؟) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جس کسی کے پاس زائد سواری ہو، وہ سواری کسی ایسے آدمی کو دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد توشہ (کھانے پینے کا سامان) ہو، وہ ایسے آدمی کو دے دے جس کے پاس کھانے پینے کا سامان موجود نہ ہو (حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ) آپ ﷺ نے اس موقع پر مال کی اور بھی انواع و اصناف کو بیان کیا (جیسے اگر کسی کے پاس زائد بستر ہو تو ایسے آدمی کو دے دے جس کے پاس بستر نہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس زائد کپڑے ہیں تو ایسے آدمی کو دے دے جس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ اس طرح نبی کریم ﷺ نے مال کی مختلف قسمیں بیان فرما کر یہی تاکید فرمائی کہ زائد مال ایسے آدمی کو دیدے جو اس کا ضرورت مند ہو) آپ ﷺ کے اس ارشاد کو سن کر ہمیں یہ خیال ہونے لگا کہ آدمی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کسی بھی چیز (سواری، کھانا، کپڑا، بستر وغیرہ) میں خود اس کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔

افادات:- اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس کے ذریعہ سے دوسرے ضرورت مند لوگوں کی حاجتوں کو پورا کریں۔ ویسے قرآن پاک میں بھی باری تعالیٰ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے: ﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ باری تعالیٰ نے فرمایا: جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ سب خرچ کر دو۔ ظاہر ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد جو زائد ہے اس کو پڑا رہنے دیں گے، تو اس سے آپ کی ضرورت تو پوری ہو نہیں رہی ہے، آپ کی

ضرورت کا جو تھا وہ آپ کے پاس موجود ہے، یہ تو زائد ہے، آپ اس کو دوسرے کے حوالہ نہیں کریں گے، اور نیکی کے راستہ میں خرچ نہیں کریں گے، تو وہ کسی کام کا نہیں ہے، اسی لیے اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

ایشیارا کا عملی سبق

۵۶۷:- وعن سهل بن سعدٍ رضي الله عنه أن أُمْرَأَةً جَاءَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ بِدُرْدَةٍ مَسْجُوعَةٍ، فَقَالَتْ: نَسَجْتُهَا بِيَدَيَّ لِأَكْسُو كَهَا، فَأَخَذَهَا النَّبِيُّ ﷺ مُحْتَاجًا إِلَيْهَا، فَخَرَجَ إِلَيْنَا وَإِنَّهَا إِزَارَةٌ. فَقَالَ فُلَانٌ: أَكْسُوِيهَا مَا أَحْسَنَتْهَا! فَقَالَ: نَعَمْ. فَجَلَسَ النَّبِيُّ ﷺ فِي الْمَجْلِسِ، ثُمَّ رَجَعَ فَظَوَّاهَا، ثُمَّ أُرْسِلَ بِهَا إِلَيْهِ. فَقَالَ لَهُ الْقَوْمُ: مَا أَحْسَنْتِ! لَبِسَهَا النَّبِيُّ ﷺ مُحْتَاجًا إِلَيْهَا، ثُمَّ سَأَلْتَهُ، وَعَلِمْتَ أَنَّهَا لَيْزٌ دُسَائِلًا؟ فَقَالَ: إِنِّي وَاللَّهِ مَا سَأَلْتُهُ لِأَلْبِسَهَا، إِنَّمَا سَأَلْتُهُ لِتَكُونَ كَفِينِي. قَالَ سَهْلٌ: فَكَانَتْ كَفِينَهُ. (رواه البخاري)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سهل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس بنی ہوئی ایک چادر لے کر حاضر ہوئی (جو اس نے خود تیار کی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ ایسی چادر تھی جس کے کناروں کو ذرا لچھے دار بنایا گیا تھا) اس نے وہ چادر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ چادر میں نے خود اپنے ہاتھ سے بن کر تیار کی ہے؛ تاکہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کی چادر بطور ہدیہ قبول فرمائی ایسی حالت میں کہ آپ کو خود اس کی ضرورت بھی تھی، پھر (دوسری مجلس میں جب) نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو آپ اسی چادر کو لنگی کے طور پر زیب تن کیے ہوئے تھے (اس سے پتہ چلا کہ آپ کو ضرورت تھی۔ حضرت سهل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے مجلس میں تشریف لانے کے بعد)

ایک صحابی (بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے) نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ چادر تو بہت عمدہ ہے، آپ مجھے عنایت فرمادیجئے (بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چھو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو بہت عمدہ ہے، مجھے عنایت فرمادیجئے) حضور اکرم ﷺ نے کہا: ٹھیک ہے (اسی وقت تو دے نہیں سکتے تھے، اس لیے کہ آپ اس کو پہننے ہوئے تھے، اس لیے وعدہ فرمایا) چنانچہ نبی کریم ﷺ کو اس مجلس میں جتنی دیر بیٹھنا تھا اتنی دیر تشریف فرما رہے، پھر آپ اٹھ کر (مکان میں) تشریف لے گئے اور وہ چادر (جو لنگی کے طور پر آپ زریب تن کیے ہوئے تھے اس کو نکال کر) لپیٹ کر ان صحابی کے پاس بھجوا دی (جن سے آپ نے وعدہ کیا تھا۔ بعض روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں تو درخواست کرنے والے صحابی سے کسی نے کچھ نہیں کہا؛ لیکن جب نبی کریم ﷺ اس مجلس سے اٹھ کر اپنے مکان میں تشریف لے گئے) تو لوگوں نے کہا: تم نے (حضور ﷺ سے اس چادر کا جو مطالبہ کیا، یہ) ٹھیک نہیں کیا (تمہیں معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جب یہ چادر پیش کی گئی تو) آپ کو خود ہی چادر کی ضرورت تھی (شاید اسی وجہ سے آپ نے اس کو فوراً زریب تن کیا اور یہ جانتے ہوئے بھی تم نے نبی کریم ﷺ سے مانگ لی) پھر تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی آدمی جب کوئی چیز آپ ﷺ سے مانگتا ہے تو نبی کریم ﷺ اس کی بات کو رد نہیں فرماتے (اگر وہ چیز موجود ہوتی ہے تو فوراً عنایت فرمادیتے ہیں، اور اگر نہیں ہوتی ہے تو وعدہ فرمالتے ہیں۔ گویا تم نے نبی کریم ﷺ سے اس چادر کی درخواست کر کے حضور کو زحمت و مشقت میں ڈالا۔ اگر آپ کی ضرورت سے زائد چیز ہوتی تو کوئی بات بھی نہ تھی، لیکن یہ تو آپ کی ضرورت کی چیز تم نے لے لی۔ جب دوسرے صحابہ نے ان کو اپنی درخواست اور مطالبہ پر تنبیہ کی) تو

انہوں نے کہا (بھائیو دیکھو!) اللہ کی قسم! میں نے وہ چادر اپنے استعمال اور پہننے کے لیے نہیں مانگی ہے، بلکہ اس لیے مانگی تاکہ (آئندہ چل کر جب میری موت آئے تو یہ چادر) میرے کفن کے طور پر استعمال ہو۔ چنانچہ اس واقعہ کو نقل کرنے والے صحابی حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں (اس چادر کو انہوں نے محفوظ رکھا اور جب ان کی وفات ہوئی تو) وہ چادر ان کے کفن کے طور پر استعمال ہوئی۔

افادات:- یہاں اس روایت کو پیش کر کے یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ دیکھو! خود نبی کریم ﷺ کو اس چادر کی ضرورت تھی، آپ کے پاس لنگی کے طور پر پہننے کے لیے اس وقت دوسری چادر نہیں تھی، اس کے باوجود آپ نے اپنے مقابلہ میں ان مطالبہ کرنے والے صحابی کو ترجیح دیتے ہوئے وہ چادر عنایت فرمادی۔ اس طرح آپ ﷺ نے امت کو ایثار کا عملی سبق دیا۔

ایثار کرنے والوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہارِ تعلق

۵۶۸:- وعن أبي موسى رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: إِنَّ الْأَشْعَرِيَّيْنَ إِذَا أَرْمَلُوا فِي الْغَزْوِ، أَوْ قُلَّ طَعَامُ عِيَالِهِمْ بِالْمَدِينَةِ، يَجْعَوْنَ مَا كَانَ عِنْدَهُمْ فِي تَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ اقْتَسَمُوهُ بَيْنَهُمْ فِي إِنْاءٍ وَاحِدٍ بِالسَّوِيَّةِ، فَهُمْ مِثِّي وَأَنَا مِثْلَهُمْ. (متفق عليه)

((أَرْمَلُوا)) : فَرَّغَ زَادُهُمْ أَوْ قَارَبَ الْفَرَاغَ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اشعریین (قبیلہ بنو اشعر کے لوگ) جب سفر میں جاتے ہیں اور ان کا توشہ ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے، یا مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے (حالتِ حضر میں) جب ان کے یہاں کھانا کم ہو جاتا ہے تو جس کے پاس جو ہوتا ہے اس کو ایک کپڑے یا برتن میں جمع کر لیتے ہیں، پھر آپس میں

برابر تقسیم کر لیتے ہیں (ان کے اس وصف کو بیان فرمانے کے بعد حضور اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ) میں ان سے ہوں اور وہ مجھ سے ہیں۔

افادات:- ”اشعر“ یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

ان کے بھائی اور ان کے قبیلہ کے باون ترپین حضرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لیے یمن سے روانہ ہوئے، انہوں نے سمندری راستہ اختیار کیا، کشتی میں سوار ہوئے، باد بانی کشتی تھی، اتفاق کی بات کہ ہوا کا رخ بدل جانے کی وجہ سے مدینہ منورہ پہنچنے کے بجائے وہ حبشہ پہنچ گئے، وہاں پہلے سے کچھ مسلمان قیام پذیر تھے جو ہجرت کر کے وہاں پہنچے ہوئے تھے، ان سب کے امیر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، وہ لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ کچھ میں جب خیبر فتح ہوا اس وقت حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان تمام مسلمانوں کو جو ہجرت کر کے حبشہ پہنچے ہوئے تھے۔ اپنے ساتھ لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے، اس وقت حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے، وہ سب خیبر حاضر ہوئے، وہاں حضور اکرم ﷺ سے ملاقات کی۔

اس روایت میں حضور اکرم ﷺ نے ان اشعری قبیلہ والوں کی ایک خوبی ذکر کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی جماعت ایسی ہو کہ جس کے اندر کوئی ایسا وصف پایا جاتا ہو جو ان کے لیے خوبی اور کمال کا ہو، اور اس کے ذریعہ دوسروں کو امر نیر کے واسطے ترغیب بھی دی جاسکتی ہو، تو دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے کہ فلاں لوگ ایسا کرتے ہیں۔

دیکھو! کسی کے دکھ درد کو بانٹ لینا مواسات اور غم خواری کا وصف ہے۔ اور ظاہر ہے جب کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو، یا کسی کے پاس زیادہ ہو اور کسی کے پاس کم ہو، اور سب مل کر ساتھ دیں، تو تمام کی ضرورتیں آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں۔

التَّنَافُسُ فِي أُمُورِ الْآخِرَةِ
 وَالِإِسْتِكْثَارُ هِمًّا يُتَبَرَّكُ بِهِ
 آخرت کے کاموں میں سبقت لے جانے
 اور
 برکت والی چیز کو زیادہ حاصل کرنے
 کا اہتمام کرنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مُحَمَّدًا وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُوْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُّضِلِّهٗ
فَلَا هَادِيَ لَهُوْ ذَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا
مُحَمَّدًا عَبْدًا وَرَسُوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَوَعَلَى اٰلِهِ وَاصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا
كَثِيْرًا ۱۔ اَمَّا بَعْدُ :-

باب کا عنوان

آخرت اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا، سبقت لے
جانا۔ اور ایسی چیز جس سے برکت حاصل کی جاسکتی ہو اس کو زیادہ حاصل کرنے کی اگر
کوئی آدمی کوشش کرے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ
دنیوی امور ایسے نہیں ہیں کہ ان میں لوگ ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی
کوشش کریں۔ مثلاً: فلاں کے پاس اتنی دولت ہے تو میں اس سے زیادہ دولت سمیٹ
لوں۔ فلاں نے اتنا بڑا بنگلہ بنایا تو میں اس سے بڑا بنگلہ بنا لوں۔ فلاں نے ایسے
کپڑے پہنے ہیں تو میں اس سے بھی اچھے کپڑے پہن لوں۔ دنیا کی کسی بھی چیز میں
مقابلہ آرائی کی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور آگے بڑھنے کی ترغیب نہیں
دی گئی ہے۔ ہاں! نیکی کے کاموں میں البتہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ترغیب
دی گئی ہے، آخرت کے کام ایسے ہیں کہ آپس میں سبقت کرنے والے، مقابلہ اور ریس
کرنے والے اس میں ریس کر سکتے ہیں ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾

برکت حاصل کرنے کا اہتمام

۵۶۹:- وعن سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أُتِيَ بِبَشَرٍ ابٍ،

فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِينِهِ غُلَامٌ، وَعَنْ يَسَارِهِ الْأَشْيَاخُ، فَقَالَ لِلْغُلَامِ: أَتَأْذُنُ لِي أَنْ أُعْطِيَ هَؤُلَاءِ؟ فَقَالَ الْغُلَامُ: لَا وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ! لِأَوْثُرِي بِنَصِيْبِي مِنْكَ أَحَدًا. فَتَلَّهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي يَدِهِ. (متفق عَلَيْهِ)

((تَلَّهُ)) بالتاء المشناة فوق: أئى وَضَعَهُ. وَهَذَا الْغُلَامُ هُوَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے

پاس مشروب لایا گیا، آپ نے اس میں سے نوش فرمایا اور (جو بچا اس کو دینے کے لیے پاس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے) اپنی داہنی جانب دیکھا تو ایک نوعمر لڑکا بیٹھا ہوا تھا اور آپ کی بائیں طرف معمر لوگ، عمر رسیدہ شیوخ تھے۔ آپ ﷺ نے اس نوعمر لڑکے سے کہا: کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں میرا بچا ہوا ان کو دوں؟ اس پر اس نوعمر لڑکے نے کہا: (یہ آپ کا بچا ہوا بڑا متبرک ہے، یہ میرا حصہ ہے) اللہ کی قسم! اس کے بارے میں میں کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دوں گا۔ تو حضور اکرم ﷺ نے گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

افادات:- چونکہ دائیں طرف ہونے کی وجہ سے اصولی طور پر اسی کو

دینا چاہیے، جیسا کہ بعض روایتوں میں یہ ادب بتلایا ہے۔ دائیں طرف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیٹھے ہوئے تھے اور بائیں طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما تھے اور یہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے مقابلہ میں معمر تھے۔ اور یہ واقعہ حضور اکرم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے یہاں پیش آیا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ان دونوں حضرات - حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما - کی خالہ ہوتی ہیں۔ وہیں حضور ﷺ تشریف فرما تھے، پینے کی کوئی چیز آئی، آپ ﷺ نے نوش فرمایا اور بچے ہوئے کے متعلق حضور اکرم ﷺ نے عبد اللہ بن عباسؓ سے فرمایا کہ یہ بچا ہوا ہے اور چونکہ تم میری دائیں طرف ہو؛ اس لیے اس کے زیادہ مستحق تم ہی ہو اور حق

بھی تمہارا ہے، لیکن اگر اجازت دو تو میں ان کو دوں۔ اس پر انہوں نے کہا: آپ کا بچا ہوا بڑا متبرک ہے اور میرا حصہ ہے، اس کو میں کسی اور کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے گلاس ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”قَتَلَهُ“، ”تَلَّ“ کا مطلب یہ ہے کہ ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے قوت کے ساتھ کسی کے ہاتھ میں دینا، جس کو ہم ”تھما دینا“ کہتے ہیں۔

حالاں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا جس سے حضور کی منشاء معلوم ہو سکتی تھی کہ آپ کی بھی خواہش یہ تھی کہ ان کو دیا جائے، لیکن منشاء معلوم ہو جانے کے بعد بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں! میں خود ہی لینا چاہتا ہوں، اس لیے نبی کریم ﷺ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

برکت سے کوئی مستغنی نہیں

۵۷۰:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قَالَ: بَيْنَا أَيُّوبُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَغْتَسِلُ عُرْيَانًا، فَخَرَّ عَلَيْهِ جَرَادٌ مِنْ ذَهَبٍ، فَجَعَلَ أَيُّوبُ يَمْشِي فِي ثَوْبِهِ، فَنَادَاهُ رَبُّهُ - عَزَّوَجَلَّ - يَا أَيُّوبُ! أَلَمْ أَكُنْ أُغْنِيكَ عَمَّا تَتَرَى؟ قَالَ: بَلَى وَعَزَّتْكَ! وَلَكِنْ لَأَغْنِي بِي عَنْ بَرِّكَتِكَ. (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ حضرت ایوب علیہ السلام غسل خانے میں کپڑے نکال کر غسل فرما رہے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے اوپر سونے کی ٹڈیاں گریں، حضرت ایوب علیہ السلام ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑوں میں سمیٹنے لگے، باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو خطاب ہوا: اے ایوب! تم جو ٹڈیاں دیکھ رہے ہو، اس سے ہم نے تم کو مستغنی نہیں کر رکھا ہے؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے جواب دیا: اے باری تعالیٰ! تیری عزت کی قسم!

(آپ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آسمان سے آئی ہوئی یہ چیز بھی تو آپ کی نعمت اور برکت کی ہے؛ اور) میں آپ کی برکت کی اس چیز سے کیسے مستغنی ہو سکتا ہوں۔

افادات:- اگر غسل کرنے والا ایسی جگہ غسل کر رہا ہے جو تنہائی کی ہے جیسے: غسل خانہ، تو کپڑے اتار کر بھی غسل کر سکتے ہیں۔ ہاں! اگر لوگوں کے سامنے ہو تو پھر ستر ڈھانپنا ہونا ضروری ہے۔

سونے کی ٹڈیاں جو گریں وہ یا تو باقاعدہ جاندار تھیں اور ان کا جسم اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے سونے کا بنا دیا تھا۔ یا یہ کہ وہ زندہ نہیں تھیں بلکہ ان کی شکل و صورت ٹڈیوں کی طرح بنی ہوئی تھی۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑوں میں سمیٹنے لگے، تو یہ عمل بظاہر لالچ معلوم ہوتا ہے، اس لیے باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو خطاب ہوا: اے ایوب! تم جو ٹڈیاں دیکھ رہے ہو، اس سے ہم نے آپ کو مستغنی نہیں کر رکھا ہے؟ یعنی ہم نے آپ کو پہلے سے بہت کچھ دے نہیں رکھا ہے، اس کے ہوتے ہوئے ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑے میں سمیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری اتنی نعمتیں تمہارے پاس موجود ہیں، پھر کیوں اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے جواب دیا: باری تعالیٰ! آپ کی عزت کی قسم! آپ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آسمان سے آئی ہوئی یہ چیز بھی تو آپ کی نعمت اور برکت کی ہے۔ میں آپ کی برکت سے کیسے مستغنی ہو سکتا ہوں؟ پہلے جو آپ نے دے رکھا ہے اس کا بھی محتاج ہوں اور یہ نئی نعمت آئی اس کا بھی محتاج ہوں؛ اس لیے میں اپنے آپ کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔

فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ

شکر گزار مالدار کی فضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنُسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنُتَوَكَّلُ عَلَیْهٖ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ
شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَحْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِیْهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضِلِّهٗ فَلَا هَادِیْ لَهٗو نَشْهَدُ اَنْ
لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ
وَ عَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا كَثِیْرًا۔ اُما بعد:-
قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:- «اِنْ تُبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَعِیْنَا هِیَ الْخ:

شکر گزار مالدار

ایک نیا عنوان قائم کر رہے ہیں: وہ مالدار جو شکر گزار ہو اس کی کیا فضیلت ہے؟
آگے خود ہی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ شکر گزار مالدار کسے کہتے ہیں: ”وَهُوَ مَنْ
اَخَذَ الْمَالَ مِنْ وَجْهِهِ“ وہ آدمی جو شریعت کے بتائے طریقہ کے مطابق مال حاصل
کرنے ”وَصَرَفَهُ فِيْ وُجُوْهِهِ الْمَاْمُوْرِ بِهَا“ اور جہاں اس کو خرچ کرنے کا شریعت
نے حکم دیا ہے وہیں خرچ کرے؛ ایسے صاحب مال کو شکر گزار مالدار کہا جاتا ہے۔

شکر کی حقیقت

شکر کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے، اگر وہ
غیر اختیاری ہے، یعنی اس کے حاصل کرنے میں ہماری کسی کوشش و محنت کو دخل نہیں
ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر ہماری کسی کمائی، محنت اور کوشش کے یہ نعمت عطا فرمائی ہے،
جیسے زندگی، جسم اور اس کے اندر لگے ہوئے سارے اعضاء، اور بھی بہت ساری نعمتیں
ہیں جو انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر محنت و کوشش حصول مل جاتی ہیں، ان کے
اوپر شکر کا تقاضہ یہ ہے کہ ان نعمتوں کی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے جو حقوق لازم کئے ہیں،

جو ذمہ داریاں اس صاحبِ نعمت کے اوپر ڈالی ہیں، اور ان نعمتوں کی نسبت سے جو احکام دیئے ہیں ان کو پورے طور پر ادا کرے؛ یہی اس نعمت کا شکر ہے، ورنہ ان نعمتوں کو جہاں استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے وہاں استعمال کرنا؛ اس نعمت کی ناشکری ہے۔ یہ تو غیر اختیاری نعمتیں ہوئیں۔

اور جو اختیاری نعمتیں ہیں یعنی جن کو کوشش اور محنت کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے ان میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ نہ دینا چاہیں؛ تو آدمی لاکھ کوشش کرے وہ نعمت حاصل ہی نہیں ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ان نعمتوں کے حصول میں اور ان نعمتوں کے انسان تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ اس کی محنت و کوشش کو بھی دخل ہوتا ہے، تو اس سلسلہ میں شکر یہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے شریعت نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی کو عمل میں لا کر حاصل کرے، اور اس کے نتیجہ میں جو بھی مل جائے، اس کو وہیں استعمال کرے جہاں شریعت کے اجازت دی ہے، اور اس سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو حقوق لازم کئے ہیں ان کو ادا کرے۔ اس میں کچھ حقوق واجبہ ہیں، کچھ حقوق مستحبات کے قبیل سے ہیں، تو جو بھی حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرے، اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرنے سے بچے؛ یہی اس کا شکر ہے۔

شکر کا پہلا درجہ

اب جو غیر اختیاری نعمتیں ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی، جسم عطا فرمایا اور جسم میں بے شمار اعضاء۔ آنکھیں، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، دل و دماغ وغیرہ۔ عطا فرمائے؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں ہیں جن میں ہمارے کسی اختیار کو دخل ہی نہیں، یہ سب نعمتیں ہمیں اللہ تعالیٰ نے بغیر محنت کے عطا فرما رکھی ہیں، تو ان کے حاصل کرنے کے لیے تو ظاہر ہے کہ کوئی غلط طریقہ اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ اور جب یہ حاصل ہو چکی ہیں تو اب ان کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے، اور ان سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیے؟

تو پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی ان تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال ہونے سے بچائے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں تو ان کو جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، جیسے کہا گیا ہے کہ نامحرم کو مت دیکھو، بے ریش لڑکوں کو مت دیکھو، ناجائز تصویروں کو مت دیکھو؛ تو ان جگہوں پر استعمال نہ کرنا۔

اسی طرح زبان ہے؛ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے بولنے کی نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے، تو اب اس زبان سے جتنی بھی نافرمانی کے کام ہو سکتے ہیں ان تمام کاموں سے آدمی اپنے آپ کو لازماً بچائے۔ یہی حال کانوں کا ہے؛ کانوں کی نعمت کے ذریعہ سے سننے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے، تو ہم کانوں کو ایسی تمام چیزوں کے سننے سے روکیں جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے۔

نیکی یا گناہ کے مراحل پر بھی اجرو زجر

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نامحرم کو دیکھنا ہے۔ کان زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا نامحرم کی بات سننا ہے۔ زبان گناہ کرتی ہے اس کا زنا کسی نامحرم کے ساتھ بات کرنا ہے۔ شرمگاہ تو اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے (صحیح مسلم، باب فُذِّرَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَقَّتْهُ مِنَ السُّرِّيِّ وَغَيْرِهِ)۔ یہ صرف ایک مثال دی گئی ہے کہ زنا ایک حرام کام ہے، اور اس کو تو آدمی اصلاً اپنی شرمگاہ کے ذریعہ انجام دیتا ہے جو اس کا آخری درجہ ہے جہاں پہنچ کر یہ کام وجود میں آتا ہے، یہ تو زنا کا آخری درجہ ہے، یہاں جا کر تو زنا کا فائز اور آخری نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن

نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعہ سے ہماری رہنمائی فرمائی کہ آپ زنا کو صرف شرمگاہ تک محدود نہ سمجھئے، شرمگاہ تو اس کا آخری مرحلہ طے کراتی ہے، لیکن پہلے کے مراحل جو طے ہوتے ہیں اور ان کے لیے جن اعضاء کو استعمال کیا جاتا ہے، ان کو بھی زنا ہی کہا جائے گا، اسی لیے آنکھ کا زنا، کان کا زنا، زبان کا زنا، ہاتھ کا زنا؛ یہ الفاظ استعمال کئے گئے اور ان کو بھی اعضاء کا زنا بتلایا ہے۔

یہی طریقہ ہر چیز میں ہے، جیسے آدمی نماز کے لیے مسجد میں چل کر آئے گا، تو اس کے واسطے پاؤں کو استعمال کرے گا۔ تو چل کر آنا کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں ضائع جائے گا؟ اور ثواب صرف مسجد میں آ کر نماز ادا کرنے پر ملے گا؟ حالاں کہ نماز تو مسجد میں آنے کے بعد ادا کی جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ نمازی جب غیر نماز والے ان کام کو انجام دے گا تب ہی تو نماز کو ادا کر پائے گا۔ ہم نے نماز کی ادائیگی کے لیے نماز سے پہلے جتنے بھی مراحل طے کئے، مثلاً غسل کیا، وضو کیا، کپڑے پہنے، گھر سے نکلے، چل کر مسجد میں آئے؛ یہ سب کام نماز کو ادا کرنے کے لیے ہی کئے، اور یہاں آ کر دیکھا کہ ابھی تو جماعت میں دیر ہے پھر نماز کے انتظار میں بیٹھے، حالاں کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنا ہمارے لیے بہت دشوار ہوتا ہے، اسی لیے تو شریعت نے انتظار کی فضیلت بتائی ہے کہ جب تک آدمی نماز کے انتظار میں رہتا ہے گویا نماز ہی میں رہتا ہے۔ حدیث پاک میں نماز کے انتظار کی اتنی بڑی فضیلت اسی لیے بتلائی کہ انتظار کوئی معمولی کام نہیں ہے، بڑی مشقت کا کام ہے، اور انتظار میں اپنی طبیعت کو لگانے کی وجہ سے جو مشقت ہوتی ہے اس کو برداشت کرنا بھی مجاہدہ کا کام ہے، تو اس مجاہدہ پر بھی اجر ملتا ہے، حالاں کہ ابھی باقاعدہ نماز میں لگا نہیں ہے؛ لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو نماز کا ثواب ملے گا، اس لیے کہ یہ کام عبادت کے لیے انجام دیا گیا ہے۔

تو شریعت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ عبادت کے لیے شروع میں آپ نے جو مراحل طے کئے اور تمہیدی طور پر جو کچھ بھی کیا، اس پر یوں نہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اجر نہیں ملے گا، آپ کا یہ عمل بے کار نہیں ہے، بلکہ اس پر بھی مستقل اجر ملتا ہے۔ نماز کا اجر و ثواب تو الگ ہے، اس سے پہلے آپ نے جو کچھ کیا اس کا مستقل ثواب اللہ تعالیٰ کے یہاں ملے گا۔ یہی قاعدہ ہر کام میں چلے گا۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں، تو اس کے لیے سحری کھاتے ہیں، حالاں کہ کھانا ایک طبعی عمل ہے لیکن سحری پر بھی حدیث پاک میں فضیلت موجود ہے، اس کو بابرکت کھانا کہا گیا ہے، حضور اکرم ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے، اس کھانے پر باقاعدہ ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے کہ یہ کھانا عبادت کا ذریعہ بن رہا ہے۔

یہ طرزِ عمل؛ شرافت کا جنازہ

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو ہمیں اپنی کسی کوشش اور محنت کے بغیر ملیں، ان کے سلسلہ میں نمبر اول پر یہ ذمہ داری اور فریضہ ہم پر عائد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک نعمت کو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کریں، ورنہ اس سے بڑی ناشکری اور کیا ہوگی؟ جیسے: آپ نے کسی کو کوئی چیز دی، وہ آدمی اس چیز کو آپ ہی کو ناراض کرنے میں استعمال کرتا ہے، اس کے ذریعہ سے آپ کو ہی تکلیف پہنچا رہا ہے، تو آپ ہی بتلائیے کہ اس سے بڑا خطرناک کام اور کیا ہو سکتا ہے؟ مثلاً: آپ نے سفارش کر کے کسی کو کوئی عہدہ دلوا لیا، وہ آدمی اس سے غلط فائدہ اٹھا کر آپ کو ہی نقصان پہنچا رہا ہے؛ تو دنیا کیا کہے گی؟ حالاں کہ ہماری نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ ہمیں تو بتلا دیا گیا کہ ساری دنیا مل کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر تل

جائے اور دنیا میں جو سب سے زیادہ نافرمان اور سرکش آدمی ہے، سب لوگ ایسے بن جائیں، تب بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے؛ لیکن ہماری شرافت اور مروت کا تو جنازہ نکل ہی گیا۔ ہمارا یہ طرز عمل شرافت کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لیے تو علماء لکھتے ہیں کہ نافرمانیاں اور گناہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہی نہیں ہیں، بلکہ شرافت اور مروت کے بھی خلاف ہیں۔ اس لیے تمام نعمتیں چپا ہے اختیاری ہوں یا غیر اختیاری؛ ان کے سلسلہ میں سب سے پہلا فریضہ ہم پر یہی عائد ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے دن، ہفتے، مہینے، ساعتیں اور گھڑیاں ہمیں عطا فرمائیں، تو اب زندگی کے ان اوقات کو ہم گناہوں میں استعمال نہ کریں۔ اگر ایک گھڑی کو بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کریں گے؛ تو یہ ناشکری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جوانی عطا فرمائی، تو جوانی کی صلاحیتوں کو کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہے، اپنی شہوت پوری کرتا ہے، جوانی کی قوت کو ظلم اور زیادتی میں استعمال کرتا ہے؛ تو یہ جوانی کی نعمت کی ناشکری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مال دیا، تو اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہے۔ ساری نعمتوں میں آدمی اول درجہ پر یہی سوچے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کو؛ چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اختیاری ہو یا غیر اختیاری؛ ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کروں گا۔ ورنہ یہ سب سے پہلی ناشکری ہوگی۔

شکر کا دوسرا درجہ

نمبر دو پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کے سلسلہ میں جو ذمہ داری و جوبی حیثیت سے ضروری قرار دی ہے اس کو انجام دے۔ مثلاً جسم عطا فرمایا، اسی کے ذریعہ سے نماز،

روزہ وغیرہ تمام جسمانی عبادتیں ادا کی جاتی ہیں، جسم سے متعلق یہ سب اہم فریضے ہیں۔ اسی طرح دیگر تمام نعمتوں سے متعلق جتنے بھی فرائض ہیں ان کو انجام دینا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا، یہ نعمت البتہ ایسی ہے کہ اس میں آدمی کے اختیار کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے، اور بعض دفعہ غیر اختیاری بھی ملتا ہے، جیسے: باپ یا کسی رشتہ دار کا انتقال ہو اور بیٹے یا وارث کو لاکھوں کروڑوں روپے مل گئے؛ یہ بغیر محنت کے ملے ہیں۔ یا کسی نے ہدیہ دیا تو یہ بھی بغیر محنت کے ملا۔ اور کبھی محنت کر کے کاروبار کے ذریعہ سے کماتا ہے۔ تو مال سے متعلق جو فرائض ہیں، ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ مال کا فریضہ کیا ہے؟ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، قربانی وغیرہ۔ یا صاحب مال ہونے کی حیثیت سے آپ پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد، بیوی، ماں باپ، بھائی بہن وغیرہ کا نفقہ واجب کیا، یا کبھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا و جوہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے؛ تو یہ سب مال سے تعلق رکھنے والے واجبات ہیں، ان سارے فرائض کو ادا کرے۔ پھر اس کے بعد اس نعمت سے تعلق رکھنے والے مستحبات کو بھی ادا کرنے کا اہتمام کرے، یعنی اللہ تعالیٰ جس کام سے راضی ہوتا ہے اس کا اہتمام کرے۔ چاہے کوئی بھی نعمت ہو، اس کی قدر دانی کا حق یہی ہے کہ وہ نعمت جس کام کے لیے دی گئی ہے، اور اس سے لوگوں کو جنت زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہو، اس کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا ہی اس نعمت کا سب سے بڑا شکر ہے۔

اور اگر اس نعمت کو حاصل کرنے میں ہماری کسی محنت و کوشش کو دخل ہے، تو پھر یہ بھی خیال رکھا جائے کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کے اندر کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہو۔ جیسے مال، مکان و جائیداد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی آدمی لوگوں کی جیب کاٹتا ہو، مال لوٹتا ہو، چوری کرتا ہو، ظلم و زیادتی کرتا ہو لوگوں کے حقوق مارتا ہو؛ تو یہ سب جائز نہیں۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے شریعت نے

جو طریقہ بتلایا ہے اسی کو اختیار کرے یعنی مزدوری کرے، کاروبار کرے۔ پھر اس کو اختیار کرنے کے ساتھ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسرا کوئی فرض چھوٹ جائے، جیسے: دکان پر بیٹھا تو کاروبار میں ایسا مشغول ہو گیا کہ فرض نمازیں چھوڑ دیں، ایسا کرنے کی وجہ سے کمائی کے حلال ہونے کے باوجود یہ دکانداری نماز چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ بنی، اگرچہ اس کمائی کو بہ حیثیت کمائی کے حرام نہیں کہیں گے، لیکن سائنڈ افیکٹ تو ہو رہی ہے، اور ہم ہر کام میں سائنڈ افیکٹ کو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی اپنی کمائی کو اس سے بچانے کا اہتمام کیجیے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پوچھ ہوگی۔

خلاصہ کلام

خلاصہ یہ ہوا کہ ان ساری چیزوں کو اگر ملحوظ رکھیں گے تو کہا جائے گا کہ اس نعمت کا حق ادا کیا۔ اسی لیے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے: **فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ**، ایسا مالدار جو شکر گزار ہو اس کی فضیلت کا بیان۔ اور شکر گزار آدمی کی خود ہی وضاحت کر دی کہ جس طریقہ سے مال حاصل کرنا چاہیے، اسی طریقہ سے حاصل کرے، یعنی مال حاصل کرنے کا جو جائز طریقہ ہے اسی کو اختیار کرے، اور جہاں اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہیں خرچ کرے۔ یہاں ”مامور بہا“ کی قید لگا کر ایک اور بات بتائی جا رہی ہے کہ جائز کام میں خرچ کرنے پر بھی فضیلت اسی وقت ملے گی جب کہ اسی جگہ خرچ کرے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جائز کام میں خرچ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ یہ الگ چیز ہے کہ فقہاء کرام کے یہاں جائز اور مباح کو بھی ”مامور بہا“ بتلایا گیا ہے، اور ”مامور بہا“ واجب کو بھی کہتے ہیں۔

خرچ کرنے میں یہ بھی بہتر اور وہ بھی!

اب اس سلسلہ میں آیتیں پیش کرتے ہیں۔ ایک آیت تو پہلے (باب التَّهَيُّعِ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ فِيهِ) آچکی ہے۔ دوسری آیت ہے: ﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعْمًا هِيَ﴾ اللہ کے راستہ میں جو خرچ کرتے ہو اس کو تم ظاہر کرو، یعنی کھل کر خرچ کرو کہ لوگوں کو پتہ چلے؛ تو یہ بہت اچھی بات ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہ مستقل مسئلہ ہے کہ خرچ کرنے میں اخفاء یعنی چھپانا اچھا ہے یا ظاہر کرنا؟ علماء نے لکھا ہے کہ جو فرائض کے قبیل سے ہو، اس کو تو ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاکہ دوسروں کو بھی ان فرائض کی ادائیگی کی ترغیب ہو، جیسے فرض نماز؛ کہ اس کو مسجد میں آ کر ہی ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح سے زکوٰۃ کو ادا کرنے میں بھی اظہار کرے تو کوئی حرج کی بات نہیں یعنی اس طرح زکوٰۃ دے کہ لوگوں کو پتہ چلے؛ تاکہ دوسروں کو بھی اس فریضہ کی ادائیگی کا اہتمام ہو۔ البتہ نوافل میں جیسا موقع ہو، اگر موقع کے مناسب اخفاء ہو تو اس کی فضیلت زیادہ ہوگی، اور اگر کوئی موقع ایسا ہے کہ لوگوں کو ترغیب کی ضرورت ہے تو اظہار میں بھی کوئی حرج نہیں۔

﴿وَإِنْ تُخْفُواهَا وَتُوتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ اگر اللہ کے راستہ میں خرچ کی جانے والی چیز کو چھپا کر فقراء کو دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہاری سیئات کو درگزر کرے گا اور جو تم کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ واقف اور باخبر ہے۔ اس آیت میں صدقات کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے، اور جیسا کہ بتایا کہ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا بھی شکر کا ایک حصہ ہے۔

نیکی کا اعلیٰ درجہ

﴿لَنْ تَعَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِنْ مَّا تَحِبُّونَ﴾ تم نیکی کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک پانہیں سکتے، جب تک کہ تم ان چیزوں کو خرچ کرو جو تمہارے نزدیک محبوب ہیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے معاملہ میں ہمارے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں سے وہی نکالا جاتا ہے جو رڈی ہو چکا ہو۔ جیسے: کپڑے پہنتے پہنتے پرانے ہو گئے، اور نئے آئے تو سوچتے ہیں کہ پرانے کپڑے اللہ کے راستہ میں کسی غریب کو دیدو۔ کھانا کھا چکے اور بیچ گیا، گھر میں کوئی کھانے والا باقی نہیں ہے، تو فقیر کو دے دو۔ زندگی گزر گئی، بڑھا پا آ گیا، اب گھر والے بھی دھکا دے کر گھر سے باہر نکال رہے ہیں ’نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت‘ والا معاملہ ہو گیا، تو اب مسجد میں جا کر تسبیح پڑھو۔ اگرچہ ایسے کاموں پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب ملتا ہے، لیکن نیکی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی ایسی چیز خرچ کرے جو اس کے نزدیک بھی قیمتی اور محبوب ہو، جس کی وجہ سے دینے کو بھی جی آمادہ نہ ہوتا ہو، لیکن مجاہدہ کر کے اور اپنے نفس کے تقاضوں کو روک کر اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر دے۔ جیسے جوانی کے زمانہ کو اللہ کی عبادت میں لگائے تو یہ اعلیٰ درجہ ہے اور اس کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ جو چیز آپ کو مرغوب اور محبوب ہو اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کیجئے ﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔ کیسے حالات میں خرچ کرتے ہو اور دل میں کیا ارادہ ہے: اس سے اللہ تعالیٰ واقف ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیے جاتے تھے ان پر عمل کرنے کا حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو فوراً حضرت

ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا، اور میرا باغ ”بیرحاء“ مجھے سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے، وہ آپ کی خدمت میں پیش ہے، اس کو آپ جہاں چاہیں خرچ کریں۔ ان کا یہ باغ جو مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا اور اس میں پانی بھی بڑا عمدہ تھا، نبی کریم ﷺ اس شیریں پانی کو نوش فرمانے کے لیے اس باغ میں تشریف بھی لے جاتے تھے۔ یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حال تھا۔

دو قابل رشک شخصیتیں

۵۷۱:- وعن عبد الله بن مسعودٍ رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: لا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا، فَسَلَّطَهُ عَلَىٰ هَلَكَاتِهِ فِي الْحَقِّ. وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ حِكْمَةً، فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ) و تقدم شرحه قريبا

۵۷۲:- عن ابن عمر رضي الله عنهما عن النبي ﷺ قال: لا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْقُرْآنَ، فَهُوَ يَقُومُ بِهِ آتَاءَ اللَّيْلِ وَآتَاءَ النَّهَارِ. وَرَجُلٌ آتَاهُ مَالًا، فَهُوَ يُنْفِقُهُ آتَاءَ اللَّيْلِ وَآتَاءَ النَّهَارِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو آدمیوں پر حسد کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور پھر اس مال کو حق (نیکی) کے کاموں میں خرچ کرنے پر اس کو مسلط کیا ہو۔ اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، وہ اس علم کے ذریعہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو بھی وہ علم سکھاتا ہے۔

افادات:- (اس روایت کی تفصیل باب الکریم والجد میں قریب ہی گزر چکی ہے)

حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت ملی ہو، اس نعمت کے متعلق دوسرا آدمی یہ سوچے کہ مجھے مل جائے اور اس سے یہ نعمت چھین جاوے۔

اس روایت میں حسد بول کر غبطہ مراد لیا ہے، جس کو اردو میں رشک کہتے ہیں، یعنی سامنے والے کے پاس نعمت باقی رہتے ہوئے اپنے لیے اس نعمت کی تمنا کرنا۔ گویا حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ دوہی آدمی اس لائق ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت ملی ہے اس کو دیکھ کر دوسرا آدمی تمنا کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی نعمت عطا فرمائے۔

پہلی شخصیت

ایک تو وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس مال پر مسلط کیا ہو یعنی اس کو اتنی قوت اور ہمت دی ہو کہ اس مال کو اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم فرمایا، وہاں برابر خرچ کرتا رہتا ہو۔ گویا اس کو اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے لیے مسلط کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ رات دن اس کو نیکی کے کاموں میں برابر خرچ کرتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کے پاس مال ہو اور نیکی کے کاموں میں اس کو خرچ کرتا ہو، وہ اس قابل ہے کہ اس پر رشک کیا جائے۔ اسی کو ”غنی شاکر“ سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شخصیت

دوسرا آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا، جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اس علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ علم کی نعمت اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا فرمائی ہو تو اس کا حق یہی ہے کہ وہ اس سے لوگوں کو

فائدہ پہنچائے۔ اگر اس کے پاس علم ہے اور شریعت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے، تو اس کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو علم سکھائے اور حق کے مطابق فیصلے کرے۔ بلکہ ایسی کوئی چیز اس کو معلوم ہے اور جس کا جاننا دوسرے کے لیے بھی ضروری ہے، تو اس کا بتانا اس پر فرض ہے، اگر چھپائے گا اور نہیں بتائے گا؛ تو اس پر بڑی سخت وعید ہے۔ کسی آدمی سے کوئی بات پوچھی گئی اور وہ اس کو جانتا ہے، لیکن اس نے اس کو چھپایا تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز اس کو جہنم کی آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ (ابن ماجہ، باب مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمِهِ فَكْتَمَهُ)

ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا

اس حدیث کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ اس میں صراحت ہے کہ اس سے ایسی چیز پوچھی گئی ہو جس کا جاننا ضروری تھا اور اس نے چھپایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لایعنی اور بے کار سوال کا جواب اگر نہ دے تو اس پر یہ وعید نہیں ہے۔ ہم دارالافتاء میں بیٹھتے ہیں تو لوگ بے کار اور لایعنی چیزیں بھی بہت پوچھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا، اس لیے کہ ایسی چیزوں کا بتانا ضروری نہیں ہے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ اس کا جواب دیا ہی نہ جائے۔ یہاں تو وہ علم مراد ہے کہ جو لوگوں کے لیے سیکھنا ضروری ہے، جیسے ایک آدمی کو نماز کا طریقہ معلوم نہیں ہے، نماز کے منرائض اور واجبات معلوم نہیں ہیں، وہ آپ کے پاس آیا اور درخواست کرتا ہے کہ مجھے نماز کا طریقہ بتا دیجئے، لیکن آپ منع کرتے ہیں اور نہیں سکھاتے؛ تو یہ اس وعید میں داخل ہے۔ آپ کو زکوٰۃ کا مسئلہ معلوم ہے، ایک آدمی صاحبِ نصاب ہے، وہ آپ کے پاس مسئلہ معلوم کرنے کے لیے آیا اور آپ سے پوچھا اور جاننے کے باوجود آپ

نے نہیں بتایا تو اس وعید میں داخل ہو جائیں گے۔ تو ہر وہ چیز جس کا جاننا شرعی طور پر ضروری ہے اور آپ کو وہ معلوم بھی ہے؛ تو اس کا بتانا ضروری ہے۔

دو باتیں

دیکھو! یہاں دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ مال تھا تو جیسے مال میں سے خرچ کرنا واجب ہے، اصحابِ حقوق کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے۔ اولاد کا ماں باپ کے اوپر حق ہے، اور ماں باپ کا اولاد پر حق ہے، اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا حق ادا نہیں کرے گا؛ تو گنہگار ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے تو جو لوگ جاہل ہیں ان کا حق ادا کرو، اگر وہ آپ سے پوچھتے ہیں اور آپ جانتے ہوئے بھی ان کو نہیں بتاتے، تو آپ کے لیے یہی وعید ہے۔ علم والی نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اس کا شکر یہی ہے کہ لوگوں کو سکھاؤ، خود تو عمل کرنا ہی ہے، لیکن اوروں کو بھی سکھایا جائے۔

حفظِ قرآن کا حق

دوسری روایت میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے: ”رُجِّلَ اِنَّهٗ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهَوَّ يَقْوَمُ بِهِ اِنَاءَ اللَّيْلِ وَاِنَاءَ النَّهَارِ“ اور تو مطلق علم کے بارے میں بتلایا تھا، یہاں بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو قرآن کریم کی نعمت عطا فرمائی یعنی حفظِ قرآن کی دولت سے مالا مال کیا، وہ اس کو لے کر رات دن کے مختلف اوقات میں نماز میں کھڑا رہ کر پڑھتا رہتا ہے۔ گویا اس کا حق ادا کر رہا ہے؛ تو یہ اس کا شکر ہے۔ اگر کسی کو قرآن کریم کی دولت دی گئی، اس کا شکر یہی ہے کہ رات اور دن میں اس کو نمازوں کے اندر پڑھے، اگر نہیں پڑھتا ہے اور سویا رہتا ہے تو اس پر حدیث میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔

فقراءِ مہاجرین کی کڑھن

۵۷۳:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه: أَنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِينَ أَتَوْا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالُوا: ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالْدَّرَجَاتِ الْعُلَى، وَالنَّعِيمِ الْمُقِيمِ، فَقَالَ: وَمَا ذَاكَ؟ فَقَالُوا: يُصَلُّونَ كَمَا نَصَلِّي، وَيُصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَيَتَصَدَّقُونَ وَلَا نَتَصَدَّقُ وَيَعْتَقُونَ وَلَا نَعْتَقُ. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَفَلَا أُعَلِّمُكُمْ شَيْئاً تُدْرِكُونَ بِهِ مَنْ سَبَقَكُمْ، وَتَسْبِقُونَ بِهِ مَنْ بَعَدَكُمْ، وَلَا يَكُونُ أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنْكُمْ إِلَّا أَمَّنْ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُمْ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ. قَالَ: تَسْبِيحُونَ وَتُكَبِّرُونَ وَتُحْمَدُونَ ذُبْرُ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ مَرَّةً. فَرَجَعَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَالُوا: سَمِعَ إِخْوَانُنَا أَهْلَ الْأَمْوَالِ مَا فَعَلْنَا، فَفَعَلُوا مِثْلَهُ؛ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ. (متفقٌ عَلَيْهِ. وَهَذَا لَفْظُ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ)

((الدُّثُورُ)): الْأَمْوَالُ الْكَثِيرَةُ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: غریب مہاجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مال دار لوگ جنت کے اونچے درجات اور جنت کی ہمیشہ کی نعمتوں کو لے اڑے (سارے درجات انہوں نے حاصل کر لیے) آپ ﷺ نے سوال کیا: وہ کیسے؟ فقراءِ مہاجرین نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں؛ وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، ہم روزہ رکھتے ہیں؛ وہ بھی روزہ رکھتے ہیں، لیکن ان کے پاس مال ہے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں، اور ہم خرچ نہیں کر سکتے۔ وہ عسلاموں کو خرید کر آزاد کرتے ہیں اور ہم آزاد نہیں کر سکتے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم کو ایسی چیز نہ سکھاؤں کہ اس کے ذریعہ تم ان لوگوں کو پالو جو تم سے آگے بڑھ گئے ہیں، اور جو لوگ بعد میں آئیں ان سے بھی آگے بڑھ جاؤ، اور تم سے افضل اور بہتر کوئی نہیں ہو سکتا مگر وہی جو اس عمل کو کرے جس کو تم

کرتے ہو۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، اور ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر کہا کرو (مالدار حضرات نے سنا تو انہوں نے بھی وہ عمل شروع کر دیا) وہی فقراء پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: ہم نے جو عمل شروع کیا، ہمارے مالدار بھائیوں نے سنا تو انہوں نے بھی شروع کر دیا (وہ تو پھر برابر ہو گئے) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ“ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔

افسادات: دیکھو! ان کو یہ فکر لاحق تھی، اور ہم کو تو یہ فکر لاحق ہے کہ اس نے بنگلہ بنایا اور ہم بنگلہ بنانے میں اس سے پیچھے رہ گئے۔ اس نے دو بلڈنگ تعمیر کر لیں اور ہماری ایک ہی ہے۔ اس نے دو فیکٹریاں بنالیں، ہماری نہیں ہے۔ ان چیزوں میں تو ہم بہت چوکنے رہتے ہیں، لیکن آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے میں کبھی ہمارا ذہن جاتا ہی نہیں کہ فلاں آگے بڑھ رہا ہے، تو میں بھی آگے بڑھوں۔ ہم میں ان چیزوں کا اہتمام نہیں رہا۔ حضرات صحابہ کرام کے متعلق کسی بھی روایت میں یہ بات آئی ہو تو مجھے بتاؤ کہ فلاں صحابی یہ شکایت لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں گئے ہوں کہ اے اللہ کے رسول! فلاں صاحب تجارت میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں، آپ دعا کیجئے کہ میری تجارت میں بھی کچھ برکت ہو جائے، بلکہ صرف دعا کی درخواست ہی لے کر آئے ہوں ایسا بھی کسی روایت میں آیا ہو تو بتاؤ۔ خیر! ان لوگوں نے اس نسخہ پر عمل شروع کر دیا، پھر مالداروں کو بھی پتہ چل گیا کہ ایک نیا نسخہ حاصل ہو گیا ہے۔ وہ حضرات ہمارے زمانہ کی طرح نیکیوں سے بے رغبت نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے، آج تو کسی کو نیکی کے کام کی اگر رغبت دی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ جاؤ! دوسروں سے کہو، ہم نے تو بہت نیکیاں کمائی ہیں۔ ایسے جملے زبان سے نکالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔

بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ

الْأَمَلِ

موت کے یاد کرنے

اور

تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

﴿مجلس ۱﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنُسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ
 مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ
 لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
 وَرَسُولُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلَىٰ اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا - أما بعد :-
 كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَالْمَمَاتُ تَوْفِقُونَ اُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ رُحِزَ عَنِ
 الثَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْعُرُورِ (آل عمران: ۱۸۵)
 وقال تعالى: وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ
 بِأَيِّ اَرْضٍ تَمُوتُ. (لقمان: ۳۲)

قال تعالى: فَاِذَا جَاءَ اَجْلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (النحل: ۶۱)
 قال تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ اُمُورُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنِ
 ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ وَاَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ
 اَنْ يَأْتِيْكُمْ اَحَدُكُمْ بِالْمَوْتِ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا اُخَّرْتَنِيْ اِلَىٰ اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصْلَحَ وَاَكُنْ مِنَ
 الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَاءَ اَجْلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ. (المنافقون: ۱۱-۱۰)
 وقال تعالى: حَتّٰى اِذَا جَاءَ اَحَدُهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعْوْنِيْ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ
 صٰلِحًا فَيَمَا تَرَ كُنْتَ كَلٰٓمًا مَّكِيْمَةً هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَآئِهِمْ بَرَزَخٌ اِلَىٰ يَوْمٍ يَبْعَثُوْنَ
 فَاِذَا نْفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاوُنَ لَوْ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
 فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ
 فِيْ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ تَلْفَحُ وُجُوْهُهُمْ الثَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كَالْحِجُوْنِ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُنْفَلِيْ
 عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ فِيْهَا تَكْدِيْبُوْنَ اِلَىٰ قَوْلِهِ تَعَالٰى: كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدًا

سِينِينَ قَالُوا لَبِئْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْتَلِ الْعَادِيْنَ قَالَ اِنْ لَبِئْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَفْحَسِبْتُمْ اَنْمَّا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَاَنْكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ. (المؤمنون: ۱۱۵ تا ۱۱۶)

وقال تعالى: اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَفَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِنْهُمْ فٰسِقُوْنَ. (الحديد: ۱۶)

وَالآيَاتِ فِي الْبَابِ كَثِيْرَةٌ مَّعْلُوْمَةٌ.

گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ

نیاعنوان قائم کیا ہے: موت کو یاد کرنے، اور تمناؤں امیدوں کو مختصر کرنے کا بیان۔ یہ بہت اہم اور ضروری چیز ہے۔ عام طور پر آدمی گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے اور نافرمانیوں کی نوبت آتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ موت کی طرف سے غفلت رہتی ہے۔ اگر آدمی کو موت پیش نظر رہے، اور ہر وقت اس کا احساس اور اس کی یاد رہے تو گناہوں اور اللہ کے احکام کو توڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسی لیے قرآن پاک میں کئی جگہوں پر موت کو یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی نبی کریم ﷺ نے اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ فرمایا: ”اَكْبَرُ وَاذْكُرْهَا ذِمْرَ اللّٰمَاتِ يَعْنِي الْمَوْتِ. (سنن ترمذی)“

لذتوں کو کاٹنے اور ختم کرنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔

ناقابل انکار حقیقت

موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں بے شمار

چیزیں اور حقائق ایسے ہیں کہ ان کو تسلیم کرنے سے لوگوں نے انکار کیا، یا اس میں شک و شبہ کا اظہار کیا۔ خود اللہ تعالیٰ کے وجود کا بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں، اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ قیامت کو نہیں مانتے۔ لیکن صرف موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرتا، چاہے مسلمان ہو، کافر و دہریہ ہو؛ سب کو یہ حقیقت تسلیم ہے کہ موت آنے والی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موت کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ ابھی آج، پانچ منٹ کے بعد آجائے، ایک گھنٹہ کے بعد آجائے، ایک دن کے بعد آجائے، ہفتہ کے بعد، مہینہ کے بعد، سال بھر کے بعد آجائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات طے ہے کہ آنے والی ہے لیکن کب آئے گی اس کا وقت معلوم نہیں۔ جب اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تو پھر ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اور اس کی تیاری بھی کرتے رہنا چاہیے، اس کی طرف سے اگر غفلت برتی جائے گی تو یہ آدمی کے لیے بہت زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے۔ شیطان آدمی کو یہ سمجھاتا اور بہکاتا ہے کہ ابھی تو جوانی ہے، اللہ تعالیٰ نے قوت دی ہے، پیسہ اور سارے اسباب ہیں؛ جو کرنا ہے ابھی کر لو، بعد میں توبہ کر لیں گے؛ حالاں کہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ بعد میں توبہ کا موقع بھی ملے گا یا نہیں عام طور پر جو نافرمانیاں ہوتی ہیں وہ اسی دھوکہ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آدمی یہ سوچ لے کہ موت کسی بھی وقت آسکتی ہے، اس کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے، اور اس کی تیاری بھی کرتے رہنا چاہیے؛ تو پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے باز رکھ سکے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے کی کوشش کرے۔

مختصر سفر کی تیاری اور لمبے سفر سے غفلت!

دنیا کے اندر آدمی کا چھوٹا موٹا سفر ہوتا ہے، تو اس کے لیے کتنی تیاریاں کی جاتی

ہیں، مثلاً دو روز کے لیے دہلی جانا ہے؛ لیکن اس کے لیے پہلے سے ٹکٹ بک کراتے ہیں، ریزرویشن کراتے ہیں، دہلی میں بھی فون کر دیتے ہیں کہ فلاں ہوٹل میں جگہ بک کرالو، وہاں جو دوست احباب ہیں ان کو اطلاع کی جاتی ہے کہ فلاں اسٹیشن پر اترنے والا ہوں، وہاں میرے استقبال کے لیے موجود رہیں۔ صرف دو دن کا معاملہ ہوتا ہے اس کے باوجود یہ ساری تیاریاں کی جاتی ہیں۔ اور آخرت کا اتنا لمبا سفر ہے، جہاں سے دوبارہ واپس بھی نہیں آنا ہے، اس کے باوجود اس کی تیاری کے معاملہ میں ہم غفلت برتتے ہیں۔

آپ سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں، ان کا ہارون الرشید کے یہاں آنا جانا تھا۔ بادشاہ بھی ان کے ساتھ دل لگی کیا کرتے تھے۔ اپنے دربانوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ جب بھی آئیں؛ روکا نہ جائے۔ وہ آتے تھے اور یہ دل لگی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آئے تو ہارون الرشید نے ان کو ایک چھڑی دی اور کہا کہ: یہ میں آپ کو بطور امانت دیتا ہوں، جب آپ کو اپنے سے زیادہ بیوقوف شخص دنیا میں نظر آئے، اس کو دے دینا۔ انہوں نے برا نہیں مانا، چھڑی لے لی اور اپنے پاس حفاظت سے رکھ لی۔ ایک مدت کے بعد ایک مرتبہ ان کو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت بیمار ہیں، اور ان کی زندگی کی امید کم ہے؛ تو وہ اس چھڑی کو لے کر حاضر ہوئے اور پوچھا:

امیر المؤمنین! کیا حال ہے، کیسی طبیعت ہے؟

کہا: بس اب جانے کا وقت آ گیا ہے۔

پوچھا: کہاں کے سفر کا ارادہ ہے؟

کہا: آخرت کا سفر درپیش ہے۔

پوچھا: واپسی کب ہے؟

کہا: کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا وہاں جانے والا کبھی واپس آیا کرتا ہے؟

پوچھا: پھر آپ نے اس کے لیے کیا تیاریاں کی ہیں؟

کہا: افسوس اسی کا ہے کہ اس کے لیے جو تیاریاں کی جانی چاہیے تھیں؛ وہ نہیں ہوئیں۔

انہوں نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ کا دنیا میں تو یہ حال تھا کہ اگر کہیں دو تین

روز کے لیے جانا ہوتا تھا تو لشکر کی ایک ٹکڑی پہلے بھیج دیا کرتے تھے جو خیمے لگا دیا کرتی

تھی، کھانے پینے کا سامان اور عیش و عشرت کی چیزیں لے کر وہاں پہنچ جاتی تھی، آپ کے

لیے وہاں خیمے لگا دیئے جاتے تھے، اور ہر طرح کے سامان مہیا کئے جاتے تھے۔ دو تین

دن کے سفر کے لیے تو آپ اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے، اور اتنا لمبا سفر جہاں سے (آپ

خود ہی کہہ رہے ہیں) واپس کوئی نہیں آیا کرتا، اس کے لیے آپ نے کوئی تیاری نہیں کی؟

پھر کہا: آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے جو آپ نے ایک وقت یہ کہہ کر

میرے حوالہ کی تھی کہ کوئی مجھ سے زیادہ بیوقوف ملے اس کو دیدوں۔ آج میں سمجھا ہوں

کہ آپ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہے کہ آپ دنیا کے معمولی معمولی سفر کے لیے

بڑی زبردست تیاریاں کیا کرتے تھے، اور اتنے طویل سفر کے لیے آپ نے کوئی

تیاری ہی نہیں کی! یہ کہہ کر وہ چھڑی ہارون الرشید کے حوالہ کی اور چل دیئے۔

سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

یہ کوئی ہنسنے ہنسانے کی بات نہیں ہے؛ بلکہ درحقیقت یہی معاملہ ہمارا اور آپ

سب کا ہے، ہم سب اسی میں مبتلا ہیں۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے اتنی تیاریاں

کرتے ہیں، بہتر سے بہتر مکانات تعمیر کرتے ہیں اور ان کے اندر ہر طرح کے عیش و

عشرت، راحت و آرام کے اسباب کی بھرپور کوششیں کرتے ہیں، اور آخرت کے

متعلق ہم اپنی زبان سے یوں تو کہتے ہیں کہ ہمیں وہاں جانا اور ہمیشہ رہنا ہے، لیکن اس کے واسطے ہماری طرف سے کوئی تیاری نہیں ہے۔ گویا کہ اس حماقت اور بے وقوفی میں ہم میں سے ہر شخص مبتلا ہے۔ اسی لیے اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلافِ عظام کے حالات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زندگیوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ ہر وقت موت کو پیش نظر رکھتے تھے، انہوں نے اپنے نفس کو کبھی اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ طویل امیدیں قائم کرے کہ جس کی وجہ سے موت سے غفلت ہو جائے۔ ہم جو بڑی بڑی امیدیں باندھتے ہیں اور اس کے لیے دس بیس سال کے لمبے لمبے پروگرام بناتے ہیں، حالاں کہ کہنے والے نے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

ع سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

ہمیں پتہ نہیں ہے کہ ایک منٹ کے بعد، پانچ منٹ کے بعد اور ایک گھنٹے کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ تو یہ لمبی تمنائیں ہی ہیں جنہوں نے ہمیں غفلت میں ڈال رکھا ہے۔

اسی لیے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے کہ موت کو یاد کیا جائے اور امیدوں، تمنائوں کو کم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ذکر کی ہیں۔

حقیقی کامیابی

پہلی آیت لائے ہیں: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اپنے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ ہم پر موت نہیں آنے والی ہے۔ جب موت آئے گی اور ہم وہاں پہنچیں گے ﴿وَأَنَّمَا تُوقَفُونَ أَجُوزَ كَمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ قیامت کے روز تم کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وہاں کا معاملہ کیا ہے؟ ﴿فَمَنْ رُحِزَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ جو آدمی جہنم سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہ کامیاب ہے، اور حقیقی

کامیابی اسی کا نام ہے۔ ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ فیکٹری بنالی تو کامیاب ہو گئے، ایک سے دو کر دی تو کامیاب ہو گئے بلڈنگ بنالی تو کامیاب ہو گئے، تجارت خوب چل رہی ہے تو کامیاب ہو گئے، دنیا کے اعتبار سے جو آدمی جتنا زیادہ پیسہ کماتا ہے، لوگ اسی کو کامیاب سمجھتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں کہا گیا کہ جو آدمی اپنے آپ کو جہنم سے بچالے اور جنت کا حقدار ہو جائے وہ کامیاب ہے ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ اِلَّا لَمَتَاعُ الْعٰوٰرِ﴾ دنیوی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے، اس کے اندر پھنسنے کی اور اس سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حیثیت سے آدمی سوچتا رہے کہ دنیوی زندگی دھوکہ کی چیز ہے، ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے، قبرستان کی زیارت کرتا رہے، پہلے لوگوں کے حالات پر غور کرتا رہے، بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے فاتح دنیا میں آئے؛ لیکن وہ سب دنیا سے رخصت ہو گئے، کوئی بھی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گیا۔

اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں

آگے ایک اور آیت پیش کی ہے: ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ اَرْضٍ يَّمُوتُ﴾ کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ آدمی گناہ کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ کل توبہ کر لیں گے، پھر توبہ کر لیں گے، لیکن بتلا دیا گیا کہ کل کیا ہونے والا ہے اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ کل کی توبہ کے خیال سے آج گناہ میں مبتلا ہونے سے بڑی کوئی حماقت نہیں ہو سکتی۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ توبہ کی وجہ سے گناہ معاف بھی ہو جائیں، تب بھی ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس اچھے سے اچھا مرہم ہے جس کے متعلق مرہم کے ایجاد کرنے والوں نے گارنٹی دے رکھی ہو کہ کیسا ہی زخم کیوں نہ ہو، آپ لگائیں گے تو فوراً اچھا ہو جائے گا۔ تو کیا کوئی آدمی اس وجہ سے کہ اس کے پاس ایسا مرہم ہے کہ اس

کے لگانے سے زخم فوراً اچھا ہو جاتا ہے، اپنی انگلیاں کاٹ لیتا ہے؟ کیا اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے؟ جب ہم اپنے جسم کے معاملہ میں ان سارے معالجات اور تدبیریں ہونے کے باوجود اس کا خطرہ مول نہیں لیتے، تو آخرت کے معاملہ میں ایسا کیوں کیا جائے؟ آگے فرمایا: اور کسی کو معلوم نہیں ہے کہ کس جگہ اس کی موت آنے والی ہے، تو پھر آدمی کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

نہ جلدی، نہ دیر

آگے ایک اور ارشاد نقل کیا: ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ اس آیت سے پہلے یہی مضمون بتلایا گیا ہے کہ جو لوگ گناہ کرتے ہیں اور نافرمانیوں میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ اگر ہر ایک نافرمانی پر گرفت کرنے لگے تو پھر کوئی جاندار دنیا کے اندر باقی نہیں رہ سکتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ اب وہ وقت کتنا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے، باقی مقررہ وقت سے پہلے اس کو موت نہیں آئے گی۔ لیکن جب وقت مقررہ آجائے گا تو موت ٹھیک اسی وقت آ کر رہے گی، ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہو سکتا، نہ وقت مقررہ سے پہلے آ سکتی ہے اور نہ وقت مقررہ سے مؤخر ہو سکتی ہے۔

وہی گھائے میں ہیں

آگے ایک اور ارشاد نقل کیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غفلت میں نہ ڈالیں۔ عام طور پر آدمی مال اور اولاد کی وجہ سے غفلت کا شکار ہوتا ہے، خاص یہی دو اسباب ہوتے ہیں تو ان دونوں کے باب میں چونکہ کر دیا گیا کہ ان کی وجہ سے اللہ کی یاد، اس کے احکام

کی بجائے اوری، اور اس کی اطاعت سے غفلت میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر فرمایا: جو آدمی ایسا کرے گا یعنی مال و اولاد کی محبت میں آ کر غفلت کا شکار ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائے گا تو یہی لوگ خسارے اور گھاٹے والے ہیں، ان کو آخرت کا نقصان اٹھانا پڑے گا ﴿وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَّ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقْتُ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آ جائے، پھر وہ یوں کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے قریب کے وقت کے لیے مہلت کیوں نہ دی؟ یعنی موت جب آئے گی اور مال خرچ نہیں کیا تو وہ تمنا کرے گا کہ مجھے کچھ وقت مل جائے؛ تاکہ یہ مال جو میرے پاس ہے، میں وہ خرچ کر دوں اور نیکو کار بن جاؤں، نیک اعمال کرنے لگوں۔ آدمی کو جب تک کہ موت نہیں آ جاتی وہاں تک غفلت میں رہتا ہے، اور جیسے ہی موت بالکل سر پر آ جاتی ہے تو ایسی تمنائیں کرتا ہے لیکن ان تمنائوں سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے ﴿وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ اور جب کسی کا مقررہ وقت آ جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو ذرہ برابر بھی مہلت نہیں دیں گے، اس وقت تو اس کی جان قبض کر ہی لی جائے گی۔ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

وہی پرانی روش

دوسری آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کا دھوکہ ہے؛ بلکہ آخرت میں جانے کے بعد کفار یہ تمنا کریں گے کہ ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیجا جائے؛ تاکہ ہم ایمان لے آئیں اور اعمالِ صالحہ کر لیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر دوبارہ بھی جائیں گے تب بھی غفلت ہی کا شکار ہونے والے ہیں۔ اور دنیا ہے ہی ایسی کہ آدمی دھوکہ میں

پڑ جاتا ہے، اور اس میں ایسا مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر آدمی ایسی باتیں صرف وقت آنے پر ہی کرتا ہے۔ آپ دنیا میں دیکھ لیجئے کہ بہت سے لوگ جب کسی مہلک اور خطرناک بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جس میں بچنے کی امید نہیں رہتی، اس وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں کہ اے اللہ! اگر میں زندہ رہا تو کبھی نافرمانی نہیں کروں گا، اور اپنے اعمالِ بد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ طے کرتے ہیں کہ پھر کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کروں گا، لیکن پھر جب اچھے ہو جاتے ہیں تو پہلے جیسے تھے ویسے ہی ہو جاتے ہیں، ان کی پرانی روش میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔

حساب کتاب کا منظر

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا﴾ یہاں تک کہ جب ان کے پاس موت کا وقت آئے گا تو یوں کہیں گے: باری تعالیٰ! مجھے واپس بھیج دیجئے تاکہ میں نیک اعمال کروں اور پیچھے جو مال چھوڑ آیا ہوں اس میں سے صدقہ و خیرات کروں (باری تعالیٰ فرماتے ہیں) ہرگز نہیں! یہ ایک ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے نکال رہا ہے، جس پر عمل ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہ تو صرف ایسی ہی باتیں ہیں، اگر دوبارہ بھیجا جائے تب بھی وہ اپنی حرکتوں پر ہی رہے گا ﴿وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ اور (موت کے بعد) ان کے دوبارہ زندہ کئے جانے تک ایک پردہ ہے یعنی دنیا سے جانے کے بعد برزخ کی زندگی آتی ہے، جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور لوگ دوبارہ پیدا کیے جائیں گے وہاں تک اس کو وہیں رہنا ہے ﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْتَسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ﴾ پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ زندہ

کیے جائیں گے، اس وقت آپس میں کوئی رشتہ دار یاں نہیں رہیں گی۔ دنیا میں تو رشتہ دار یوں اور تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ آڑے وقت میں ایک دوسرے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ ہوتا تھا، لیکن جب آخرت میں پہنچیں گے تو کسی طرح کی کوئی رشتہ داری باقی نہیں رہے گی، ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا عمل ہوگا، اور نہ ایک دوسرے کے پاس کچھ مانگا سکیں گے ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ، وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ﴾ وہاں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر نیک اعمال کے ذریعہ اس کا ترازو بھاری ہو جائے گا تو وہ کامیاب ہے، اور اگر اعمال صالحہ سے اس کا ترازو ہلکا رہے گا تو پھر یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو نقصان اور گھائے میں ڈالا، اور وہ جہنم کے اندر ہمیشہ رہیں گے ﴿تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ﴾ جہنم کی آگ ان کے چہروں کو جھلسا دے گی اور وہ اس کے اندر بھی بالکل بد صورت ہو جائیں گے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جہنمی کے اوپر کا ہونٹ پیشانی تک چڑھ جائے گا، اور نیچے کا ہونٹ ناف تک لٹک جائے گا۔ (ترمذی)، اور زبان باہر نکل کر اتنی لمبی ہو جائے گی کہ جہنمی لوگ اس کو روندیں گے (ترمذی۔ باب مَا جَاءَ فِي عِظْمِ أَهْلِ النَّارِ) یعنی جہنمی کا جہنم کے اندر یہ حال ہوگا کہ چہرا بگڑ جائے گا، شکل و صورت بگڑ جائے گی۔

﴿أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهِ تَاكِذِبُونَ﴾ وہاں ان کو جہنم کے داروغہ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہماری نشانیاں اور پیغام تمہارے پاس نہیں آئے تھے کہ جب تمہارے سامنے پڑھے جاتے تھے، تو تم اس کو جھٹلاتے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ نصیحت قبول کرنے کا جو وقت تھا اس سے تم نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر پوچھا جائے گا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ﴾ دنیا میں کتنے سال رہے؟ دنیا کی پچاس، ساٹھ، سو، ایک سو پچاس سال کی اتنی طویل زندگی جو ملی تھی اس کے باوجود یہ حال ہوگا

کہ وہ کہیں گے ﴿لَبِئْسَ أَيَوْمًا أُوبِعُضُ يَوْمٍ﴾ ہم تو ایک دن رہے یعنی وہاں آخرت میں پہنچنے کے بعد دنیا کی یہ طویل زندگی بھی مختصر معلوم ہوگی۔ دنیا میں اگر اس بات کا کچھ احساس ہوتا تو کچھ کارآمد بھی ہوتا۔ اور بعض لوگ تو کہیں گے کہ ہم پورا ایک دن بھی نہیں رہے، بلکہ ایک دن کا بھی کچھ حصہ دنیا میں رہے۔ ان سے کہا جائے گا: ﴿فَسَدَلِ الْعَاذِينَ﴾ فرشتے جو سب کچھ شمار کرنے کے لیے مقرر تھے انہی سے پوچھو ﴿قَالَ إِنَّ لَبِئْسَ ثَمًّا إِلَّا قَلِيلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اور کہا جائے گا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی بہت تھوڑی ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اگر تم جانتے ہو ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ پھر کہا جائے گا کہ کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا؟ یعنی وہاں تمہارے اعمال کے متعلق کوئی پوچھ نہیں ہوگی؛ بلکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سب پوچھا جائے گا اور حساب کتاب ہوگا۔ اور کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص کام کے لیے پیدا کیا ہے، اور پھر لوٹ کر وہاں جانا ہے جہاں اس کے متعلق سوال ہوگا۔

کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا؟

﴿الَّذِينَ آمَنُوا أَن تَحْشَع قُلُوبُهُمْ لِيذْكُرَ اللَّهُ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے واسطے، اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو حق اتارا اس کے سامنے جھکیں یعنی ایمان والوں کے دل تو ایسے ہونے چاہئیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی آیتیں اور احکام ان کے سامنے پیش کئے جائیں تو ان کے دل جھک جائیں اور ان کو قبول کر لیں اور اللہ کی یاد کے لیے آمادہ ہو جائیں ﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ﴾ اور وہ ایسے نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی۔ یعنی امت محمدیہ سے پہلے جن امتوں کو کتابیں دی گئیں (جیسے یہود

اور نصاریٰ) ان کو ایسا نہیں بنا چاہیے ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمْ هُمُ الْأَمَدُ﴾ زمانہ ان کے اوپر طویل ہو گیا یعنی نبیوں کی صحبت سے وہ دور ہو گئے، تو نتیجہ یہ ہوا ﴿فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ ان کے دل سخت ہو گئے ﴿وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ اور ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں۔

اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔ آدمی اللہ تعالیٰ کی ان آیات کی کثرت سے تلاوت کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کو مدنظر رکھے؛ تب ہی غفلت دور ہو سکتی ہے۔ یہاں تو نمونے کے طور پر چند آیتیں پیش کی گئیں جن میں خاص طور پر متوجہ کیا گیا کہ موت آنے والی ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور جواب دینا ہے، وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ دنیوی زندگی کی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کی زندگی بہت قلیل ہے، اس تھوڑے سے وقت کو آدمی سنبھال لے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اہتمام کر لے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچالے، نفس اور شیطان کے دھوکے میں نہ آئے؛ تو اس کے لیے کامیابی ہے۔

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

۵۷۴:- عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَتَكِّيًّا فَقَالَ:

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِدٌ سَبِيلٍ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرا

کندھا پکڑ کر فرمایا: دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ پردہ بسی (پردیس میں) یا راستہ چلتا ہوا آدمی رہتا ہے
افادات:- آپ کسی جگہ سفر کر کے جائیں تو وہاں کوئی مکان بناتے ہیں؟
نہیں بناتے۔ پردیس میں آدمی سوچتا ہے کہ مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہے، دودن کا
مسئلہ ہے، جس طرح بھی وقت گزر جائے۔ میں جس کام کے لیے آیا ہوں اس کو پورا

کر لوں، پھر جلدی سے لوٹ جاؤں گا۔ دنیا میں آدمی کو اسی طرح رہنا چاہیے، اس لیے کہ ہمارا اصل گھر تو آخرت میں ہے، دنیا میں جو آنا ہوا ہے وہ آخرت کی تیاری کے لیے ہی ہے، اسی لیے یہاں کے گھر کو آباد کرنے کی اور دنیا کے عیش و آرام کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

﴿اَوْعَابِ سَبِيلٍ﴾ بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرمایا کہ یا جیسے راستہ چلتا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ یعنی پردہ سی کا تو کسی جگہ دودن ٹھہرنا بھی ہوتا ہے، وہ تو گیٹ ہاؤس یا ہوٹل میں قیام بھی کرتا ہے، لیکن جو آدمی راستہ کاٹ رہا ہے اور چل رہا ہے، وہ تو چل ہی رہا ہے، کہیں ٹھہرتا نہیں ہے۔ اس کا حال تو اس سے بھی آگے ہوتا ہے کہ وہ تو اتنا بھی نہیں سوچتا، جتنا دودن قیام کرنے والا آدمی سوچتا ہے۔ کوئی آدمی راستہ میں چل رہا ہو تو کتنا ہی اچھا منظر آئے، وہ اس منظر کی طرف توجہ نہیں دیتا کہ میں تو مسافر ہوں، یہاں سے گزر رہا ہوں، ایسے مناظر تو آیا ہی کریں گے، اگر میں ان کی طرف توجہ کروں گا تو میرا سفر رہ جائے گا۔

وقت آنے سے پہلے تیاری کر لو

آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقولہ نقل کیا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے: ﴿إِذَا أُمْسِدْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ﴾ جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ یعنی جب صبح ہو تو یہ نہ سوچو کہ شام ہونے والی ہے، بس آدمی اسی وقت تیاری کر لے، اور ہر وقت موت کے واسطے تیار اور ریڈی (Ready) رہے، یہ نہ سوچے کہ کل کر لیں گے۔ آج کا کام کل پر چھوڑا نہیں جاتا؛ بلکہ ہر وقت اپنے آپ کو موت کے واسطے تیار رکھے۔ صبح ہو تو شام کا انتظار نہیں، اور شام ہو تو صبح کا انتظار نہیں۔ اپنی تندرستی کے اندر ہی بیماری کے لیے

تیاریاں کرلو، اور اپنی زندگی میں موت کی تیاری کرلو۔

دنیوی اعتبار سے آدمی تندرستی کے زمانہ میں سوچتا ہے کہ یہ تندرستی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، کبھی بیماری بھی آسکتی ہے، تو تندرستی کے زمانہ میں وہ اتنا کچھ کمالیتا ہے کہ کبھی بیماری آئے تو تندرستی کے زمانہ کا کمایا ہوا کام دے۔ ٹھیک اسی طرح آخرت کے معاملہ میں بھی آدمی کو سوچنا چاہیے کہ تندرستی کے زمانہ میں اعمال کا اتنا زیادہ اہتمام کرو کہ اگر کبھی درمیان میں بیماری آگئی، اور اس کی وجہ سے اس طرح کے اعمال انجام نہ دے سکو، تو تندرستی میں کیا ہوا عمل کارآمد ہو۔ جیسے آدمی تندرستی کے زمانہ کی کمائی سے بیماری میں فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طریقے سے اعمال کے معاملہ میں بھی ہونا چاہئے۔ ویسے فرائض تو ادا کرنے ہی ہیں؛ لیکن نوافل کے لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی اپنی تندرستی کے زمانہ میں جن نوافل کا اہتمام کرتا ہے، بیماری کی وجہ سے اگر ان کو انجام نہ دے سکے، تب بھی اللہ تعالیٰ اس کا ثواب اس کو عطا فرمائیں گے۔ اور اپنی زندگی سے موت کے لیے توشہ حاصل کرلو۔ موت تو آنے ہی والی ہے، اس کے لیے اپنی زندگی ہی میں تیاری کر لینی چاہئے، آخرت کی تیاری کے معاملہ میں آدمی غفلت نہ برتے۔

وصیت لکھنے کا حکم اور طریقہ

۵۷۵:- وعنه: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: مَا حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ، يَبِيْتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ. هَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ).

وفی روایةٍ لِمُسْلِمٍ: يَبِيْتُ ثَلَاثَ لَيَالٍ.

قال ابن عمر: مَا مَرَّتْ عَلَيَّ لَيْلَةٌ مُنْذُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ ذَلِكُ إِلَّا وَعِنْدِي وَصِيَّتِي.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ دو راتیں نہ گزارے مگر اس حال میں کہ کوئی ایسی چیز جو اس کے پاس قابلِ وصیت ہو جس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔

افادات:- یعنی ایسی وصیت جو ضروری ہے وہ اپنے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہئے، مثلاً ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ یا بندوں کا کوئی حق باقی ہے، تو اس سلسلہ میں وصیت کرنا لازم ہے، اگر آدمی بغیر وصیت کے مرے گا تو اس حق کے ضائع ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی۔ جیسے: ایک آدمی کی نمازیں فوت ہوئی ہیں، وہ ان کی قضا کر رہا ہے؛ تو قضا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو وصیت بھی لکھ دینی چاہیے کہ میں اپنی نمازیں۔ جو مجھ پر اتنی باقی ہیں۔ روزانہ اتنی قضا کر رہا ہوں، اور فلاں تاریخ سے میں نے شروع کر رکھی ہیں، اگر اس کی قضا مکمل ہونے سے پہلے میری موت آ جائے تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مال میں سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کیا جائے۔ یہی حال روزوں کا ہے۔ اگر وصیت لکھی ہوئی ہے تو وارثوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مال کے تہائی میں سے فدیہ ادا کریں۔ لیکن اگر وصیت نہیں کی ہے تو ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر وارث ادا کریں گے تو ان کا تبرع اور احسان ہے؛ لیکن ان کے اوپر ضروری نہیں ہے؛ چاہے وہ لاکھوں کی دولت چھوڑ کر گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق باقی ہوں تو ان کے حق میں وصیت کرنا بھی ضروری ہے، اور بندوں کے جو حقوق ہیں وہ بھی آدمی ہر وقت لکھے ہوئے تیار رکھے کہ فلاں کا میرے اوپر اتنا قرض باقی ہے، اگر اس کی ادائیگی سے پہلے میری موت آ جائے تو میرے مال میں سے اس کو ادا کیا جائے۔ اسی طرح امانتوں کے متعلق بھی لکھ لینا ضروری ہے۔ ہر امانت پر باقاعدہ نام کے ساتھ لکھے کہ یہ فلاں کی امانت ہے۔ جتنے بھی حقوق یا امانتیں

ہیں ان کے متعلق وصیت لکھی ہوئی ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ خود کو یاد ہے، لیکن اس پر لکھا ہوا نہیں ہے اور ایسی حالت میں موت آگئی، تو ظاہر ہے کہ ورثاء اس کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے جس کی امانت ہے اس تک پہنچا نہیں سکیں گے، تو اس صورت میں ذمہ داری مرنے والے کی ہوگی۔ لیکن اگر وصیت کے طور پر لکھا ہوا ہے اور پھر ورثاء کی طرف سے کوتاہی ہوئی؛ تو وہ گنہ گار ہوں گے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ یا بندوں کے حقوق میں سے جو چیز بھی قابلِ وصیت ہو، اس کو لکھ کر تیار رکھنا چاہئے۔ وصیت کا تیار رکھنا گویا اپنے آپ کو موت کے لیے تیار رکھنے کی علامت ہے، اس لیے کہ موت کب آئے گی کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے۔

زندگی، موت اور امیدیں

۵۷۶:- وعن أنس رضي الله عنه قال: خَطَّ النَّبِيُّ ﷺ حُطُوطًا، فَقَالَ: هَذَا لِلْإِنْسَانِ وَهَذَا أَجَلُهُ، فَبَيَّنَّا هُوَ كَذَلِكَ إِذْ جَاءَ الْحُطُّ الْأَقْرَبُ. (رواه البخاری)

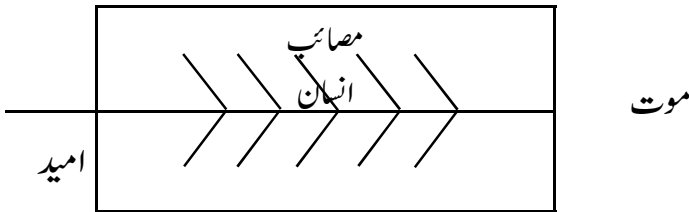
۵۷۷:- وعن ابن مسعود رضي الله عنه قال: خَطَّ النَّبِيُّ ﷺ حُطُوطًا مَرْتَبَعًا، وَخَطَّ حُطُوطًا فِي الْوَسْطِ خَارِجًا مِنْهُ، وَخَطَّ حُطُوطًا صِغَارًا إِلَى هَذَا الَّذِي فِي الْوَسْطِ مِنْ جَانِبِهِ الَّذِي فِي الْوَسْطِ، فَقَالَ: هَذَا لِلْإِنْسَانِ، وَهَذَا أَجَلُهُ مُحِيطًا بِهِ - أَوْ قَدْ أَحَاطَ بِهِ - وَهَذَا الَّذِي هُوَ خَارِجٌ أَمَلُهُ، وَهَذِهِ الْحُطُوطُ الصِّغَارُ الْأَعْرَاضُ، فَإِنْ أَخْطَأَ هَذَا، نَهَشَهُ هَذَا، وَإِنْ أَخْطَأَ هَذَا، نَهَشَهُ هَذَا. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کچھ خط (کلیں)

کھینچیں، پھر فرمایا: یہ انسان ہے، اور یہ اس کی موت ہے۔ ابھی وہ امیدوں کی بھول بھلیوں ہی میں ہوتا ہے کہ قریب والا خط اسے آدبوچتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مربع (چوکور) نشان بنایا، اس کے اندر سے ایک لمبا خط کھینچا جو پورے چوکھے کے اندر سے گزر کر پار ہو گیا۔ پھر اس بیچ والے لمبے خط کے دونوں طرف لکیریں کھینچیں اور فرمایا: چوکھا موت ہے جو آدمی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، آدمی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اندر کا جو لمبا خط ہے وہ انسان ہے۔ اور باہر جو خط نکالا گیا ہے وہ اس کی امیدیں اور تمنائیں ہیں جو آدمی موت سے بھی آگے کی کیا کرتا ہے۔ اور جو چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچی تھیں ان کے متعلق فرمایا: یہ اس کے اوپر آنے والے مصائب، آلام و آفات ہیں۔ اب اگر ایک سے چھوٹا ہے تو دوسری میں مبتلا ہوتا ہے۔ دوسری سے چھوٹا ہے تو تیسری کی گرفت میں آتا ہے۔ (نقشہ لکھ کر ملاحظہ ہو۔)

افسادات: - مطلب یہ ہے کہ آدمی کی تمنائیں اپنی زندگی سے بھی آگے کی ہو کرتی ہیں، انسان بہت آگے کی سوچتا ہے، اور چاروں طرف جو خط لگائے گئے ہیں وہ مصیبتیں ہیں جو ہر وقت اس پر آتی رہتی ہیں۔ کونسی مصیبت اس کا قصہ ختم کر دے نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ سلسلہ برابر پوری زندگی چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں موت آکر پکڑ لیتی ہے۔



بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَقَصْرِ الْأَمَلِ

موت کے یاد کرنے

اور

تمناؤں کو مختصر کرنے

کا بیان

﴿ مجلس ۲ ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بیان چل رہا تھا کہ موت کو یاد رکھنا چاہیے اور امیدوں کو مختصر کرنا چاہیے۔ اسی سلسلہ میں روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو

۵۷۸:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: **بَادِرُوا بِالْاَعْمَالِ سَبْعًا، هَلْ تَنْتَظِرُونَ إِلَّا فَقْرًا مُّذْسِيًّا، أَوْ غِنًى مُّطْغِيًّا، أَوْ مَرَضًا مُّفْسِدًا، أَوْ هَرَمًا مُّفْنِدًا أَوْ مَوْتًا مُّجْهِزًا، أَوِ الدَّجَالَ، فَشَرُّ غَايِبٍ يُنْتَظَرُ، أَوِ اللّٰهَ اَعْتَهُ وَاللّٰهَ اَعْتَهُ اُدْهَىٰ وَأَمْرٌ؟!** (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو (کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سات چیزوں کا تذکرہ آ رہا ہے ان میں سے کچھ چیزیں پیش آ جانے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو جائے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اعمال خیر کے معاملہ میں کل کا انتظار نہ کرے) کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بھلا دینے والا ہو؟ یا ایسی مالداری کا جو سرکشی میں مبتلا کر دینے والی ہو؟ یا ایسی بیماری کا جو تمہاری صحت کو خراب اور قوی کو ختم کرنے والی ہو؟ یا ایسے بڑھاپے کا جو سٹھیا دینے والا ہو؟ یا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟ یا دجال کا انتظار ہے کہ ان دیکھی چیزوں میں سب سے بدتر چیز ہے جس کا انتظار کیا جاتا ہے؟ یا پھر قیامت کا انتظار ہے؟ حالاں کہ قیامت تو بہت ڈرانے والی اور کڑوی حقیقت ہے۔

امروز و فردا

افادات:- عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے

دل میں کسی نیک عمل، یا کسی بھلائی، یا کسی عملِ خیر کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہوتا ہے، تو ایسے موقع پر نفس اور شیطان اس نیک عمل سے روکنے کے لیے اس کو دھوکہ دیتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ کل کر لیں گے۔ شیطان کا معاملہ ایسا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب فریب اختیار کرتا ہے۔ کسی مؤمن کے متعلق یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی نیکی کے کام کے متعلق وہ یہ کہے کہ یہ کام کرنا ہی نہیں ہے، اس لیے جب اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا تو اس کو روکنے کے لیے شیطان یہ تدبیر اختیار کرتا ہے کہ اس کو کل پر ٹالنے کی کوشش کرتا ہے کہ کل اس کام کو کریں گے۔ یا کوئی آدمی جوانی کی عمر میں ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے، جب ادھیڑ عمر آئے گی، تب اعمالِ خیر کا اہتمام کریں گے۔ تو شیطان اور نفس اعمالِ خیر اور نیکی کے کام سے روکنے کے لیے کل پر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے نبی کریم ﷺ تاکید فرماتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ میں سبقت کرو، یعنی جب دل میں اس کام کا داعیہ پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا شدہ اس داعیہ کی قدر کرتے ہوئے جلدی سے اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرو۔

نیکی کے داعیہ کی قدر کرو

بزرگوں نے لکھا ہے کہ نیک کام کا داعیہ جب کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مہمان ہے۔ جیسے کسی کے گھر مہمان آئے، تو اس کی قدر کی جاتی ہے، اکرام کیا جاتا ہے، اور مہمان کے مناسب عزت و احترام کا معاملہ کیا جاتا ہے اگر آنے والے مہمان کا احترام نہ کیا جائے اور قدر نہ ہو، اور وہ مہمان اگر شریف الطبع ہے تو دوسری مرتبہ آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ اسی طریقہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک کام کا داعیہ آدمی کے دل میں ڈالا جاتا ہے، تو یہ وارِدِ روحانی ہوتا ہے،

یہ داعیہ باری تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا مہمان ہوتا ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے، اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس داعیہ پر فوری طور پر عمل کا اہتمام کر لے۔ اگر اس وقت ٹال دیا، فوری طور پر اس پر عمل نہیں کیا، تو ہو سکتا ہے کہ دوبارہ دل میں داعیہ پیدا ہی نہ ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ داعیہ تو دل میں پیدا ہو، لیکن اس وقت عمل کا موقع نہ ہو؛ اس لیے نبی کریم ﷺ تاکید فرماتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ انجام دینے کے معاملہ میں سبقت اور جلدی کرو۔

بھلا دینے والا فقر

”هَلْ تَنْتَظِرُونَ إِلَّا فَقْرًا مُّؤَسِّيًا“ کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بھلا دینے والا ہو؟ مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی نیک کام کرنے کے معاملہ میں تاخیر کیوں کر رہے ہیں؟ کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ یہ کام کل انجام دیا جاسکے گا؟ ہو سکتا ہے کہ آج اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیک کام کرنے کے لیے اسباب عطا فرما رکھے ہیں، آج آپ کے پاس وسائل موجود ہیں، جتنا مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے اتنا مال بھی دے رکھا ہے، اب اگر آپ نے اس کام کو انجام نہیں دیا، تو ہو سکتا ہے کہ وہ مال آپ کے ہاتھ سے نکل جائے، اور ایسا فقر آجائے جو بھلا دینے والا ہو، تو کیا تم اس بات کا انتظار کرتے ہو؟ یعنی آج جب اپنی خوشحالی کے وقت، عیش و آرام کی حالت میں نیکی کے کام کو انجام نہیں دے رہے ہو، تو کیا جب فقر و فاقہ آجائے گا جس کے اندر آدمی مصیبت کی وجہ سے اپنی ضرورت کی چیز بھی بھول جایا کرتا ہے، اس وقت تم نیکی کا کام کرو گے؟ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب فقر کی مصیبت آتی ہے تو بہت سے اپنے کام بھی آدمی بھول جایا کرتا ہے۔ خدا نہ کرے ایسا وقت آئے، اس سے پہلے پہلے نیکی کے کام انجام دے دو۔

سرکش بنانے والی مالداری

”أَوْغَيْتِ مُطْغِيًّا“، یا تمہیں انتظار ہے ایسی مالداری کا جو سرکشی میں مبتلا کر دینے والی ہو؟ بعض مرتبہ آدمی سوچتا ہے کہ ذرا حالت ٹھیک ہو جائے، ابھی مال کم ہے، ذرا مال آجائے۔ یا مال ہے لیکن کچھ زیادہ ہو جائے، تو اس وقت ہر نیک کام کو انجام دیں گے۔ اس وقت ہم کو فراغت کا موقع بھی مل جائے گا۔ نبی کریم ﷺ متوجہ فرماتے ہیں کہ مال بڑھ جانے اور دولت کی زیادتی کی صورت میں تم بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور نیکی کے کام کرو، ہو سکتا ہے کہ مالداری تم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ کر دے۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مال کی جب فراوانی ہوتی ہے، دولت کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھتا ہے، اس کے احکام کو توڑتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ایسی مالداری کا انتظار ہے جو تم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی میں مبتلا کر دینے والی ہو؟

مہلک بیماری

”أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا“، یا تمہیں ایسی بیماری کا انتظار ہے جو تمہاری صحت کو خراب کرنے والی اور تمہارے قویٰ کو ختم کرنے والی ہو؟ یعنی آدمی سوچتا ہے کہ کل اس نیکی کے کام کو انجام دیں گے، حالاں کہ آج بدن میں تندرستی ہے، قویٰ کام کر رہے ہیں، آدمی اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور نیکی کے کاموں میں ان صلاحیتوں کو استعمال کر سکتا ہے، پھر بھی اگر آج اس کام کو انجام نہیں دیتا اور سوچتا ہے کہ کل کریں گے، آئندہ دیکھا جائے گا، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کل ہو سکتا ہے کہ تم پر ایسی

بیماری حملہ کر دے، کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ جو تمہاری صلاحیتوں کو فاسد اور خراب کر دے، تمہاری صحت اور قوی ایسے بگاڑ کر رکھ دے کہ جن اعضاء سے تم نیکی کے کام کر سکتے تھے وہ صلاحیت ہی تمہارے اندر باقی نہ رہے۔ تو کیا ایسی بیماری کا انتظار ہے؟ اس کے آنے سے پہلے پہلے صحت و تندرستی کو اور اپنی صلاحیت و سلامتی کو غنیمت سمجھ لو اور نیکی کا کام کر لو۔

سٹھیا دینے والا بڑھاپا

”أَوْ هَرَمًا مَّفْنِدًا“ یا بڑھاپے کا انتظار ہے؟ بعض مرتبہ آدمی سوچتا ہے کہ ابھی جوان ہوں، ابھی عمر ہی کیا ہے، ابھی تو دنیا کے اندر بہت رہنا ہے، ادھیڑ عمر ہوگی، اس کے بعد بڑھاپا آئے گا، اس وقت نیکی کے اعمال کا اہتمام کریں گے۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ بڑھاپے کے اندر ہی آدمی کو موت آئے، دنیا کے اندر جوان بھی مرا کرتے ہیں، اس لیے بڑھاپے کی کوئی گارنٹی نہیں اور موت کا کوئی مقرر نہیں۔ پھر یہ ہے کہ بڑھاپا آ گیا تو ہو سکتا ہے کہ بڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے آپ کے اعضاء کام ہی نہ کر سکیں۔ سٹھیا دینے والا بڑھاپا آ جائے، جس کے نتیجے میں عقل بھی ماؤف ہو جاتی ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے، قوی بھی جواب دینے لگتے ہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کیا ایسے بڑھاپے کا انتظار ہے؟ اس سے پہلے پہلے نیکی کا کام کر لو۔

اچانک کی موت

”أَوْ مَوْتًا مُّجْهَزًا“ یا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟ آدمی سوچتا ہے کہ پھر کر لیں گے۔ ظاہر ہے کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے بڑے سے بڑے

ملحد اور دہریوں کو بھی انکار نہیں۔ ہر ایک کو یہ بات تسلیم ہے کہ موت آنے والی ہے۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں تو مقرر ہے لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کون سے وقت آجائے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کیا اچانک کی موت کا انتظار ہے؟ اس لیے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جوانی کے بعد ادھیڑ عمر آئے گی، پھر بڑھاپا اور پھر موت آئے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے بھی اچانک کی موت آ کر گرفتار کر لے۔ اگرچہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ موت سے پہلے موت کی علامتیں اور نشانیاں آدمی کے اوپر ظاہر ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی گویا اس کو نصیحت کی جاتی ہے۔

تم نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے

میں نے پہلے بھی واقعہ سنایا تھا جو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کسی کی ملاقات ملک الموت سے ہوگئی، انہوں نے کہا: دنیا کی حکومتوں کا دستور تو یہ ہے کہ کسی کو کوئی سزا دینی ہوتی ہے تو اس کو پہلے سے نوٹس دے کر آگاہ کیا جاتا ہے کہ آپ کو سزا دی جانی ہے؛ اور تمہارا معاملہ تو ایسا ہے کہ اچانک ہی آجاتے ہو اور روح قبض کر لیتے ہو۔ ملک الموت نے جواب میں کہا: میری طرف سے تو اتنی زیادہ نوٹس دی جاتی ہے کہ اتنی کسی اور کی طرف سے نہیں دی جاتی ہوگی۔ بخار کا آنا، بیماریوں کا آنا، قویٰ کا کمزور ہونا، بال کا سفید ہونا، اولاد کی اولاد کا ہو جانا؛ یہ سب میرے نوٹس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے: ﴿أُولَٰئِكَ نُنَبِّئُكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرُ وَجَاءَ كُمْ النَّذِيرُ﴾ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ کوئی آدمی اپنی اصلاح کرنا چاہتا اور نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا ہوتا۔

یہاں ڈرانے والے سے مراد بعض مفسرین نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ آپ ﷺ نے آکر آگاہ کر دیا کہ موت آنے والی ہے اور آپ نے لوگوں کو ڈرایا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب دینا ہے، اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی ہے۔ بعضوں نے کہا: اس سے مراد اولاد کی اولاد کا ہونا ہے۔ یعنی بیٹوں کے یہاں اولاد کا ہو جانا گویا اس بات کی علامت ہے کہ اب آپ کی رخصتی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ آپ کو دنیا سے جانے کی تیاری کر لینی چاہئے۔ بالوں کا سفید ہو جانا، نگاہوں کا کمزور ہو جانا، شنوائی کی صفت کا متاثر ہو جانا؛ یہ ساری علامتیں ہیں۔ تو ملک الموت نے کہا: دیکھو! اتنے سارے نوٹس بھیجتا ہوں کہ کوئی بھی حکومت اتنے نوٹس نہیں بھیجتی ہوگی؛ لیکن کیا کریں کہ ہمارے اتنے سارے نوٹس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا۔ (۱) (التذکرہ: جلد ۱، ص: ۳۶)

دجال

”أَوَلَدَّجَالٍ، فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ“ یا پھر دجال کا انتظار ہے؟ ظاہر ہے کہ آدمی ابھی نیک اعمال نہیں کرتا، یوں سوچ رہا ہے کہ آئندہ زمانہ میں کریں گے، لیکن آنے والا زمانہ کیسا ہوگا اس کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ سخت سے سخت حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ معلوم نہیں آدمی کن مصائب کا شکار ہو جائے اور کیسے ماحول سے اس کو واسطہ پڑے۔ آج نیکی کا کام نہیں کرتا تو کیا دجال آئے گا تب نیکی کا کام کرے گا؟ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ان دیکھی چیزوں میں سب سے بدتر چیز جس کا انتظار کیا جاتا ہے وہ دجال ہے۔ یعنی دجال ایک ایسی حقیقت ہے جو ابھی تک وجود میں نہیں آئی، لیکن جو چیزیں ہم نے نہیں دیکھی ہیں، آئندہ زمانہ میں آنے والی ہیں، اور

(۱) نوٹ: - اس موضوع پر نہایت عمدہ تفصیل، حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد سوم، صفحہ ۵۰ تا ۵۷ پر ہے۔ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

جس کا انتظار کیا جاتا ہے، ان میں سب سے بدتر چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ دجال ہے۔ تو کیا اس کا انتظار ہے کہ وہ آئے گا تو ہم نیک اعمال کریں گے؟ حالاں کہ جب ابھی نیک کام کی طرف قدم نہیں بڑھتے، نیکی کی طرف طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، تو جب دجال دنیا میں آجائے گا اس وقت تو گمراہی کے دروازے زیادہ کھلے ہوئے ہوں گے: اس وقت نیکی کیا کر سکیں گے؟

قیامت

”أَوِ السَّاعَةِ وَاللَّهَ اَعُوْذُ وَ اَمْرٌ“ یا پھر قیامت کا انتظار ہے کہ جب قیامت قائم ہو جائے گی تب نیکی کے کام کریں گے؟ ظاہر ہے کہ قیامت بڑی سخت مصیبت لے کر آئے گی، اس کے بعد تو پھر نیکی کے موقع کا سوال ہی نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خاص طور سے متوجہ کیا کہ آدمی کے دل میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا ہو، اور اعمال خیر کے لیے طبیعت آمادہ ہو، اس وقت تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور کسی بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس داعیہ کی قدر کرتے ہوئے فوری طور پر نیک عمل میں لگ جانا چاہیے۔

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے

۵۷۹:- وعنه قال قال رسول الله ﷺ: أَكْثَرُ وَاذِكْرُهُ أَذِي اللِّذَاتِ

(رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن) یَعْنِي المَوْتَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے

ارشاد فرمایا: لذتوں کو توڑنے والی چیز موت کو کثرت سے یاد کرو۔

افادات:- موت زندگی کی ہر لذت کو ختم کر دینے والی ہے، اور جب

موت آجائے گی تو آدمی دنیا کے اندر کیسے ہی عیش و آرام میں رہتا ہو، کیسی ہی لذت میں ہو؛ ساری لذتیں ختم ہو جائیں گی۔ نبی کریم ﷺ اس چیز کو کثرت سے یاد کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ لیکن ہم اور آپ چوبیس گھنٹوں میں اس کو کتنی مرتبہ یاد کرتے ہیں؟ رات کو سونے کے لیے جاتے ہیں اس وقت کیا کیا خیالات ہمارے دل و دماغ میں آتے ہیں؟ اپنے معاش کے متعلق بہت ساری چیزیں ہم سوچتے ہیں، اپنے کاروبار کے متعلق بہت ساری تدبیریں کرتے ہیں، اپنی تجارت و دکان کے متعلق اور اپنی دوسری چیزوں کے متعلق بہت کچھ غور و فکر کرتے ہیں، اور بہت ساری چیزوں کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہے؛ لیکن کبھی ہمیں موت کا خیال نہیں آتا۔ آدمی اپنی آنکھوں سے اپنے رشتہ داروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، اپنے ہاتھ سے ان کو غسل دیتا ہے، اپنے ہاتھ سے اپنے رشتہ داروں کو قبر میں اتارتا اور دفن کرتا ہے۔ کل جو زمین کے اوپر ہمارے سامنے چلتے پھرتے تھے آج وہ قبروں کے اندر ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہم دیکھتے ہیں اس کے باوجود ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے۔ ہماری سب سے بڑی بیماری ہی آخرت سے غفلت ہے۔ اگر آدمی موت کو اکثر یاد کرتا رہے، ہر وقت اس بات کا استحضار اور تصور ہو کہ موت آنے والی ہے، مجھے اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے، اپنے کئے کا جواب دینا ہے، تو غفلت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی جو نافرمانیاں ہوتی ہیں، یا اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں، ان کی نوبت ہی نہیں آسکتی، آخرت کا دھیان اور فکر ہی اصل چیز ہے۔ آدمی اگر موت کو یاد کرتا رہے تو پھر ایسی غفلت طاری نہیں ہو سکتی جس کے نتیجہ میں نافرمانی ہو۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے موت کو کثرت سے یاد کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اب ہم اپنی حالت پر غور کریں کہ کیا ہم پورے چوبیس گھنٹوں میں کبھی ایک دو

مرتبہ بھی موت کو یاد کرتے ہیں؟ اس کی بھی ہمیں توفیق نہیں ملتی۔ اس لیے یہ خاص اور اہم چیز ہے جس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جو آدمی دن میں پچیس مرتبہ یہ دعا پڑھتا ہے: **اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِيْ فِي الْمَوْتِ وَفِيَّ اَبْعَدَ الْمَوْتِ**، پھر اگر اس کو اسی دن میں موت آجائے تو شہداء کا درجہ ملے گا۔ (مؤطا: باب ما يكون من الموت شهادة: الحزب الاعظم، منزل الخامس، يوم الاربعاء، دعاء رقم: ۲۵) دیکھو! موت کو یاد کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت کے مقام کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہیے۔

موت کا مراقبہ

بزرگوں نے ایک مراقبہ کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ آدمی سونے سے پہلے تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے یہ سوچے: میری موت کا وقت قریب ہے، روح نکل رہی ہے، اب گھر والے میری آنکھیں بند کر رہے ہیں، اب لوگوں میں اعلان ہو رہا ہے کہ فلاں کا انتقال ہو گیا، اب غسل کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، میرے کپڑے اتارے جا رہے ہیں، اب تخت پر لٹایا گیا اور غسل دیا جا رہا ہے، اس کے بعد کفن پہنایا جا رہا ہے، اب جنازہ میں رکھا جا رہا ہے، لوگ کندھوں پر اٹھا رہے ہیں، نمازِ جنازہ پڑھی جا رہی ہے۔ قبر میں اتارا جا رہا ہے، اب مجھ پر مٹی ڈالی جا رہی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ کم سے کم سوتے وقت اس پورے منظر کا استحضار کرے: اسی کو ”مراقبہ موت“ کہا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں آخرت کی فکر لاحق ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچنے کی توفیق ہوگی۔

درد و شریف کا فائدہ

۵۸۰:- وعن أبي بن كعبٍ رضي الله عنه كان رسول الله ﷺ إذا ذهب ثلث

اللَّيْلِ قَامَ، فَقَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ الْأَسْ! اذْكُرُوا اللَّهَ، جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ، تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ، جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيهِ، جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيهِ، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أُكْثِرُ الصَّلَاةَ عَلَيْكَ، فَكَمْ أَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلَاتِي؟ فَقَالَ: مَا شِئْتِ، قُلْتُ: الرَّبُوعُ؟ قَالَ: مَا شِئْتِ، فَإِنْ زِدْتِ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ، قُلْتُ: فَالْبَيْضُ؟ قَالَ: مَا شِئْتِ، فَإِنْ زِدْتِ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ، قُلْتُ: فَالْثُلُثَيْنِ؟ قَالَ: مَا شِئْتِ، فَإِنْ زِدْتِ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ، قُلْتُ: أَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِي كُلَّهَا؟ قَالَ: إِذَا تَكْفَى هَمَّكَ، وَيُغْفَرَ لَكَ ذَنْبَكَ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن.)

ترجمہ:- حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ گزر جاتا تھا تو اٹھتے اور فرماتے: اے لوگو! اللہ کو یاد کرو (ہمیں بھی اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ رات کے اخیری حصہ میں اٹھ کر اللہ کو یاد کریں) لرزہ دینے والی آگئی، اس کے بعد میں آنے والی آجائے گی (جب پہلا صور پھونکا جائے گا اس کے چالیس سال کے بعد دوسرا صور پھونکا جائے گا) موت اپنے تمام لوازمات کے ساتھ آگئی (مطلب یہ ہے کہ موت کب آجائے، یہ کہا نہیں جاسکتا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ پر کثرت سے درود بھیجتا رہتا ہوں، دعاؤں کا میرا جو وقت ہے اس میں سے میں آپ پر درود بھیجنے کے لیے کتنا وقت تجویز کروں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جتنا تمہارا جی چاہے۔ میں نے کہا: چوتھائی حصہ آپ پر درود بھیجنے کے لیے الگ کر لوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! تمہیں اختیار ہے، اگر اور زیادہ کر لو؛ تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے کہا: کیا آدھا تجویز کر لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں اختیار ہے، اگر اس میں اور اضافہ کرو؛ تو تمہارے لیے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: دو تہائی حصوں کو فارغ کر لوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں اختیار ہے، اگر اس میں اور زیادہ کر لو؛ تو

تمہارے لیے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنے پورے وقت کو آپ پر درود پڑھنے کے لیے فارغ کر لوں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تب تو تمہاری تمام ضرورتیں پوری کی جائیں گی، اور تمہارے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

افادات:- درود شریف کی کثرت کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہاری تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور تمہاری تمام ضرورتوں کی اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

بَابُ اسْتِحْبَابِ زِيَارَةِ الْقُبُورِ

لِلرِّجَالِ وَمَا يَقُولُهُ الزَّائِرُ

مردوں کے لیے قبرستان جانے کا

استحباب اور

وہاں کے مسنون اعمال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قبرستان جانا اور اس کے فائدے

نیاعنوان قائم کیا ہے: مردوں کے لیے قبروں کی زیارت کا مستحب ہونا۔ جو آدمی قبروں کی زیارت کے لیے جائے تو وہ وہاں جا کر کیا کہے؟ کیوں کہ اس سے پہلے باب میں موت کی یاد کو ذکر کیا تھا، اور قبروں کی زیارت بھی موت کو یاد کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اسی مناسبت سے یہ باب لائے ہیں۔

۵۸۱:- عن بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: كُنْتُ بِمَهَيِّتِكُمْ

عن زِيَارَةِ الْقُبُورِ؛ فزُورُوهَا. (رواه مسلم)

وفي رواية: فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَزُورَ الْقُبُورَ فَلْيُزِرْ؛ فَإِنَّهَا تُدَكِّرُنَا الْآخِرَةَ.

ترجمہ:- حضرت بریدہ اُسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ نے

ارشاد فرمایا: میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا؛ لیکن اب تم قبروں کی زیارت کرو۔

دوسری روایت میں بھی ترغیب آئی ہے: جو آدمی قبروں کی زیارت کرنا چاہے تو کرے،

اس لیے کہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

افادات:- زیارتِ قبور کی پہلے ممانعت کر دی گئی تھی لیکن پھر نبی کریم

ﷺ نے اجازت دے دی۔ اسی لیے بعض حضرات نے زیارتِ قبور کو مستحب کہا ہے۔

آدمی اگر قبروں کی زیارت کرتا رہے تو اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ موت یاد رہتی ہے اور

اس کے نتیجہ میں آدمی کو تین فائدے حاصل ہوتے ہیں:-

[۱] توبہ کی توفیق ہوتی ہے۔

[۲] اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی عطا فرما رکھا ہے اس پر قناعت نصیب ہوتی ہے۔

﴿۳﴾ عبادات میں اطمینان اور دلجمعی حاصل ہوتی ہے۔

اور اگر آدمی موت کو یاد نہیں کرتا تو اس کے نتیجے میں اس کے برعکس اس کو نہ تو توبہ کی توفیق ہوتی ہے، اور نہ اس کو اللہ کے دیئے ہوئے پرفقاعت ہوتی ہے، بلکہ حرص پیدا ہو جاتی ہے کہ جو ملتا ہے اس سے اور زیادہ ملے اور زیادہ ملے۔ اس کی تمنا میں، امیدیں اور آرزوئیں بڑھتی رہتی ہیں، عبادات میں بھی اطمینان اور دلجمعی نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے قبروں کی زیارت کے مستحب ہونے کو بیان فرما رہے ہیں۔ قبرستان جانا موت کو یاد دلانے کا ایک ذریعہ ہے۔

کیا عورتیں قبرستان جا سکتی ہیں؟

باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس میں ’لِلرِّجَالِ‘ یعنی ’مردوں کے واسطے‘ کی قید لگائی۔ اس سے بتانا چاہتے ہیں کہ مردوں کے واسطے قبروں کی زیارت مستحب ہے، اس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ لیکن ایک سوال ہے کہ کیا عورتوں کے لیے بھی قبروں کی زیارت جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ مردوں ہی کے لیے مستحب ہے، عورتوں کے لیے نہیں، اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کا ایک ارشاد ہے جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے: لَعَنَ اللَّهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُورِ (مسند ابویعلیٰ: ۵۹۰/۱ السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۰۵۵) قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔

اور کچھ حضرات عورتوں کے لیے بھی قبروں کی زیارت کو مستحب تو نہیں کہتے، البتہ چند شرطوں کے ساتھ جائز کہتے ہیں۔ وہاں جا کر اپنے غم کو تازہ نہ کرے۔ بدعات کا ارتکاب نہ کرے۔

قبر کی زیارت کر کے مقصد تو فقط موت کو یاد کرنا اور آخرت کا استحضار ہے، پھر بھی علماء احناف میں سے متاخرین نے علی الاطلاق عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کو ممنوع لکھا ہے، چاہے کوئی بھی عورت ہو، اور کسی بھی نیت سے جانا چاہتی ہو۔ چاہے وہ اہل اللہ کی قبریں ہوں یا اپنے رشتہ دار کی قبریں ہوں۔

بعض حضرات نے عورتوں کے لیے حرام ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کی قبروں پر عورتیں جائیں گی تو وہاں پر رونا دھونا ہوگا اور غم کو تازہ کرنا ہوگا۔ اور بزرگوں اور نیک بندوں کی قبروں پر جائیں گی تو وہاں بدعات کا ارتکاب کریں گی، شریعت کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کریں گی۔ اور مشاہدہ بھی ہے کہ عام طور پر وہاں یہی سب ہوتا ہے، اور حکم جو لگتا ہے وہ اسی بنیاد پر لگا کرتا ہے، اب اگر کوئی عورت ایسی چیزوں سے مستثنیٰ ہو، تو اس کی وجہ سے اس کو اجازت نہیں مل سکتی۔ بہر حال! متاخرین کا فتویٰ یہی ہے کہ عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت درست نہیں ہے

قبرستان جانے کی دعا اور آداب

۵۸۲:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: کان رسول اللہ ﷺ کلما کان لیلتہا من رسول اللہ ﷺ یخرج من آخر اللیلۃ الی البقیع، فیقول: السلام علیکم دار قوم مؤمنین، وأتاکم ما توعدون، غداً مؤجّلون، وإنا إن شاء اللہ بکم لأحقون، اللهم اغفر لأهل بقیع العرقَد. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی میری باری کی رات ہوتی تو

نبی کریم ﷺ رات کے آخری حصہ میں بقیع (جو مدینہ منورہ کا قبرستان ہے) تشریف لے جاتے، اور ان الفاظ و کلمات سے ان کو سلام کرتے تھے: اے مسلمانوں کی آبادی والو! تم پر سلام

ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس چیز کا وعدہ کیا جاتا تھا وہ چیز تم تک پہنچ چکی، اور قیامت تک کے لیے مہلت ہے۔ اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ اے اللہ تو بقیعِ غروت یعنی اس قبرستان والوں کی مغفرت فرما۔

قبرستان کس دن جائے؟ مقاصدِ زیارت

افادات:- قبرستان کی زیارت کے سلسلہ میں علماء نے لکھا ہے کہ جمعہ کا دن اور اس میں بھی صبح کا وقت سب سے اچھا ہے۔ اس لیے آدمی جمعہ کے دن صبح کے وقت قبرستان کی زیارت کے لیے جائے۔ ویسے جمعہ سے ایک دن پہلے یعنی جمعرات، ایک دن بعد یعنی سنپچر، اسی طرح پیر؛ اس طرح کل چار دنوں۔ جمعرات، جمعہ، سنپچر اور پیر۔ میں قبروں کی زیارت کے لیے قبرستان جانے کو مستحب لکھا ہے، اور اس میں سب سے اچھا جمعہ کا دن ہے اور وقت صبح کا ہو تو زیادہ مناسب ہے، ورنہ جو وقت میسر آ جائے۔ زیارتِ قبور ایک تو موت کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہوتی ہے، اس لیے جن قبروں کی زیارت کی جا رہی ہیں ان کا پہچانا بھی ضروری نہیں ہے، قبروں کا دیکھنا ہی آدمی کے لیے موت کی یاد کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

دوسرے یہ کہ زیارت؛ قبرستان میں جو مدفون ہیں ان کے لیے دعا کرنے کے واسطے ہوتی ہے، اس کے لیے بھی پہچانا ضروری نہیں ہے، قبرستان حبا کروہاں والوں کے لیے دعائے مغفرت کرے، جیسے: نبی کریم ﷺ نے جنت البقیع میں جو لوگ مدفون تھے ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔

تیسرے یہ کہ زیارت؛ اپنے مرحوم رشتہ داروں، ماں باپ وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہوتی ہے، یہ ان کا ہم پر حق ہے اور اس کی ادائیگی کے مختلف طریقے

ہیں، ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آدمی ان کے لیے دعائے مغفرت کرے، ایصالِ ثواب کرے۔ تو قبرستان جا کر ان کی قبر کی زیارت کرنا بھی انہیں حقوق کی ادائیگی میں داخل ہے۔ بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر اپنے ماں باپ کی قبروں میں سے کسی ایک کی زیارت جمعہ کے دن کرتا ہے تو اس کے لیے حج کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ (نوادر الاصول فی احادیث الرسول ۱۲۶/۱ فیض القدیر شرح جامع الصغیر ۶/۱۸۳)

اور اللہ والوں کی قبر کی بھی زیارت کی جاتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کی برکتوں میں سے کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب فرمائے۔ مگر وہاں زیارت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب قبرستان میں قدم رکھے تو دعا اور سلام کے الفاظ پڑھے، جو آگے والی روایت میں بھی آنے والے ہیں، نبی کریم ﷺ نے اس کی باقاعدہ تعلیم دی ہے۔

زیارتِ قبور کی تعلیم

۵۸۳:- وعن بریدۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: کان النبی ﷺ یعلّمہم إذا خرّجوا إلی المقابر أن یقولوا قائلہم: السلام علیکم أهل الدیار من المؤمنین والمسلمین، وإثنا إن شاء اللہ بکم للآحقون، أسأل اللہ لنا ولکم العافیۃ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کو باقاعدہ سکھاتے تھے کہ کوئی آدمی جب قبرستان جائے تو یوں کہے: تم پر سلامتی ہو اے مؤمنین اور مسلمین کی آبادی والو! اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے آ کر ملنے والے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں (اور اس کا بھی اضافہ کرے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔)

زیارت کی دعا میں ”ان شاء اللہ“ کیوں؟

افادات:- یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ موت کا آنا تو یقینی ہے، پھر جو ”ان شاء اللہ“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے؛ وہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ موت یقینی ہے؛ لیکن موت ایمان ہی پر آئے، اس کی کیا گارنٹی ہے؟ اور یہاں سلام مسلمانوں اور ایمان والوں کو کیا جا رہا ہے، اور ”ان شاء اللہ“ کا اضافہ اس لیے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہمیں بھی ایمان کے اوپر موت نصیب فرما کر تمہارے اندر شامل کرے گا۔

حسن خاتمہ اور سوء خاتمہ کے اسباب

ایمان کے اوپر موت نہ آنے کے جو اسباب ذکر کیے ہیں، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ آدمی نماز چھوڑے۔ دوسرا: شراب کا عادی ہو۔ تیسرا: ماں باپ کا نافرمان ہو۔ اور چوتھا: ایمان والوں کو تکلیف و ایذا پہنچاتا ہو۔ کتا بوں میں خاص طور پر ان چار کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ان کاموں کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے برے خاتمہ کا اندیشہ رہتا ہے۔

اور اگر کوئی آدمی مسواک کا اہتمام کرے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ امید ہے کہ اس کو ایمان کے اوپر موت نصیب ہوگی۔ اس لیے ہمیں ہر اس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے متعلق کتابوں میں لکھا ہو کہ اس کے نتیجے میں ایمان کے اوپر موت نصیب ہوتی ہے اور خاتمہ اچھا ہوتا ہے۔ اور ہر اس چیز سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کے نتیجے میں خاتمہ برا ہو سکتا ہے۔

قبرستان میں داخلہ کے وقت سلام

بہر حال! قبرستان میں داخل ہوتے وقت سلام کرے۔ پھر صاحبِ قبر کو بھی خصوصیت کے ساتھ ”السلام علیکم“ کہہ کر سلام کر سکتا ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی مؤمن جب اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے اوپر سے گزرتا ہے جس کو وہ پہچانتا تھا، اور اس کو سلام کرتا ہے، تو صاحبِ قبر اس کو محبت سے دیکھتا ہے، اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کسی صاحبِ قبر کو بھی خاص طور سے اگر سلام کیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی روح کو لوٹاتے ہیں، پھر وہ سلام کا جواب دیتا ہے اور خوش ہوتا ہے (مشکوٰۃ المصابیح مع شرحہ رماعة الفاتح، و ذکرہ ابن القیم فی کتاب الروح تحت المسئلة الاولى وہی بل تعرف الاموات زیارة الاحیاء و سلامہم أم لا؟) اس لیے ایک تو قبرستان میں داخل ہوتے وقت عمومی کلمات سے سلام کرے، پھر جس کی قبر پر جا رہا ہے اس کو بھی خصوصیت سے کلماتِ سلام کہے۔ جیسے کسی مجمع میں داخل ہوتے ہیں تو ”السلام علیکم“ کہتے ہیں، پھر کسی خاص آدمی سے ملتے ہیں تو الگ سے سلام کیا جاتا ہے۔

ایصالِ ثواب کا طریقہ

پھر قبرستان میں داخل ہوتے ہی عمومی انداز میں پورے قبرستان والوں کے لیے ایصالِ ثواب کا اہتمام کرے۔ اس سلسلہ میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ آدمی قبرستان میں داخل ہونے کے بعد سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بقرہ کا اول؛ الم سے مفلحون تک۔ آیۃ الکرسی۔ سورۃ بقرہ کا آخر یعنی آمن الرسول سے لے کر سورت

آدمیوں کو بخشنا، تو ان دسوں کو دس دس مرتبہ ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ کا ثواب ملے گا، اور ان کے برابر آپ کو سو ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ کا ثواب ملے گا، اور آپ نے دس مرتبہ پڑھی ہے اس کا الگ یعنی ایک سو دس ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی چیز بعید نہیں ہے، آدمی اگر امیر رکھے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ”أَنَا عَبْدُ ظَنِّ عَبْدِ مَنِيٍّ“ بندہ میرے ساتھ جیسا گمان رکھتا ہے، ویسا ہی معاملہ میں اس کے ساتھ کرتا ہوں۔ اس لیے ہر ایک کو اس بات کی عادت بنالینی چاہیے کہ جب مسلمانوں کے کسی قبرستان کے پاس سے گزر رہو رہا ہو، تو کم سے کم تین مرتبہ ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ پڑھ کر اس کا ثواب پورے قبرستان والوں کو پہنچا دے۔

زندوں کو بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟

اس موقع پر علماء نے اس پر بھی کلام کیا ہے کہ مردوں کی طرح زندوں کو بھی ثواب پہنچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ چوں کہ مردے محتاج ہیں وہ خود کوئی نیک عمل نہیں کر سکتے، اس لیے ان کو تو پہنچایا جاسکتا ہے، جب کہ جو لوگ زندہ ہیں وہ نیک عمل کرنے پر قادر ہیں، ابھی ان کا اعمال نامہ بند نہیں ہوا ہے، اس لیے وہ خود اپنے لیے کریں۔ ان کو ثواب نہیں پہنچایا جاسکتا۔ لیکن دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح ثواب مردوں کو پہنچتا ہے، اسی طرح زندوں کو بھی پہنچتا ہے (شامی، جلد ۱/ص: ۶۶۶) اس لیے کہ ایصالِ ثواب کا حاصل اتنا ہی ہے کہ آپ نے جو نیک عمل کیا، اس پر آپ کو جو اجر و ثواب ملا، آپ اللہ تعالیٰ سے درخواست و دعا کر رہے ہیں کہ: اے اللہ! یہ ثواب جو مجھے ملا ہے، فلاں کو دیدے۔ جو ثواب آپ نے کمایا ہے اور آپ کے کھاتے میں جمع ہوا ہے، اب آپ اس کو دوسرے کے کھاتے میں ٹرانسفر کر رہے ہیں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

قبر کے پاس کس طرح کھڑا رہے؟

پھر آپ کسی مخصوص قبر کی زیارت کے لیے جائیں تو اس کے دائیں بازو پاؤں کی طرف کھڑے رہیں، اس طرح کہ آپ کی پشت قبلہ کی طرف ہو، اس لیے کہ مُردے کو قبر میں اُسی کروٹ لٹایا جاتا ہے۔ اگر آپ سر ہانے کی طرف کھڑے ہوں گے تو اس کو دیکھنے میں تکلیف ہوگی، جیسے کوئی پیچھے کھڑا ہو تو پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑتا ہے، اس میں دیکھنے والے کو زحمت ہوتی ہے، لیکن اگر سامنے کھڑے رہو تو اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ کتابوں میں یہی آداب لکھے ہیں۔ ہاں اگر وہاں ایسی جگہ نہیں ہے بلکہ قبریں اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ پاؤں کی طرف جانے کی صورت میں قبر پر پاؤں رکھنے پڑتے ہیں، یا راستہ سر ہانے کی طرف ہی ہے، تو پھر اس صورت میں مجبوری ہونے کی وجہ سے اجازت ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ آپ آرام سے پاؤں کی طرف سے جا سکتے ہیں تو پھر پاؤں ہی کی طرف اس طرح کھڑے رہیں کہ قبلہ کی طرف پیٹھ ہو اور مُردہ جو لیٹا ہوا ہے وہ لیٹے لیٹے آپ کو دیکھ رہا ہو۔ اور سلام بھی کیا جائے۔

دور کھڑا رہے یا قریب؟ تو لکھا ہے کہ اس کی زندگی میں جتنا دور اور قریب رہتے تھے، اسی طرح کا معاملہ کیا جائے۔ جیسے بڑا آدمی ہوتا ہے تو زندگی میں اس کی عظمت کی مناسبت سے ہم ایک دم قریب نہیں جاتے؛ بلکہ ادب کی وجہ سے تھوڑا سا دور ہٹ کر کھڑے رہتے ہیں، تو موت کے بعد بھی وہی مناسبت باقی رہے گی، اس لیے موت کے بعد بھی ہٹ کر کھڑے رہیں۔ اور اگر زندگی میں آپ بالکل قریب جاتے تھے تو قبر کے بھی بالکل قریب رہیں۔ اور ایصالِ ثواب کرنے کے بعد اس کے لیے دعائے مغفرت کا بھی اہتمام کیا جائے کہ ”دعائے مغفرت اہم ہے۔“

ثواب پہنچنے کے بارے میں مذاہبِ ائمہ

ایصالِ ثواب کے سلسلہ میں ایک چیز یاد رہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت معتزلہ کی ہے جو پہلے گزرے ہیں، وہ یوں کہتے ہیں کہ کسی بھی عمل کا ثواب نہیں پہنچتا، ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا مسلک اس سلسلہ میں یہ ہے کہ نیک عمل کا جو ثواب پہنچایا جاتا ہے وہ دو طرح کے ہیں: ایک مالی عبادتیں ہیں، اور دوسری جانی عبادتیں ہیں۔ تو مالی عبادتوں کا ثواب تو سب کے نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ اور جانی عبادتیں یعنی نماز پڑھ کر یا قرآن و تسبیح پڑھ کر جو ثواب ملتا ہے، وہ شوائع اور مالکیہ کے یہاں نہیں پہنچتا، اگرچہ شوائع کے متاخرین علماء نے فرمایا ہے کہ اس کا ثواب بھی پہنچ جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک دونوں قسم کی عبادتوں کا ثواب پہنچ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانی عبادتوں کے مقابلہ میں مالی عبادتوں کا اہتمام زیادہ کرنا چاہیے؛ تاکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک بالاتفاق وہ ثواب پہنچے۔

(شامی، جلد ۱/ص ۶۶۶)

دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب؟

اور دعائے مغفرت کے مفید ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے، اہل سنت والجماعت اور معتزلہ دونوں اس کو مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دعائے مغفرت مردہ کے حق میں مفید و کارآمد ہے، اس لیے اگر دعائے مغفرت کر لے تو ایک ایسی چیز ہو جائے گی جس کے میت کے حق میں مفید ہونے میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔ ویسے بھی علماء نے لکھا ہے کہ ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعائے مغفرت کا اہتمام زیادہ ہونا چاہئے۔ لیکن ہم لوگوں کا مزاج برعکس بنا ہوا ہے۔ ہم لوگ دعائے مغفرت کے مقابلہ میں

ایصالِ ثواب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں، حالاں کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ، انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ. صَدَقَةٌ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ» آدمی کا جب انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے؛ البتہ تین چیزیں باقی رہتی ہیں، یا تو اس نے کوئی ایسا نیکی کا کام کیا تھا جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، جیسے کہیں کنواں کھدو دیا، کہیں مسجد بنوادی، مدرسہ تعمیر کرا دیا، مسافر خانہ تعمیر کرا دیا، کوئی کتاب وقف کر دی، یا علم کا کوئی سلسلہ جاری کر دیا، کسی کو نماز سکھادی، اس نے دوسرے کو سکھائی، اس نے تیسرے کو سکھائی۔ یا کسی کو قرآن مجید پڑھنا سکھایا، اب وہ دوسروں کو سکھا رہا ہے؛ یہ سارے سلسلے ایسے ہیں کہ ان سے مرنے کے بعد بھی فائدہ ہوتا رہتا ہے، اس لیے ان کا ثواب بھی ملتا رہتا ہے۔

دعائے مغفرت زیادہ مفید ہے

یا اولاد نیک ہے جو ماں باپ کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔ یہ دعائے مغفرت بہت مفید چیز ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی ہتھانوی نور اللہ مرقدہ دعا کے مفید اور کارآمد ہونے کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! کسی کا کوئی عزیز یا رشتہ دار جیل میں ہو، اب ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی آدمی کوشش کر کے اس تک دو وقت کھانے کا ٹفن پہنچاتا ہے۔ اور دوسرا آدمی ٹفن تو نہیں پہنچاتا، مگر مذمہ داروں سے مل کر کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح یہ جیل سے باہر نکلے، اس کے لیے کیس تیار کراتا ہے، یا سفارش کراتا ہے کہ کسی طرح جلدی سے جیل سے باہر آ جائے۔ تو اب آپ ہی بتاؤ کہ ٹفن پہنچانے والا زیادہ عمدہ کام کر رہا ہے یا جیل سے نکلنے کے لیے کوشش کرنے

والے کی کوشش بڑھ کر ہے؟ یہ بات اور ہے کہ دونوں کی کوشش اپنی جگہ پر عمدہ ہے، اور دونوں کا کام محبت ہی کی وجہ سے ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ چھڑانے کی کوشش کرنے والا زیادہ اہم کام انجام دے رہا ہے۔ اسی طرح سے ایصالِ ثواب کے مفت بلہ میں دعائے مغفرت کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔ ویسے دونوں کام اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔

اگر کوئی یوں کہے کہ جب اس کی مغفرت ہوگئی ہے، یا وہ اللہ کے نیک بندے ہیں جو بخشے بخشتائے ہیں؛ اب ان کے لیے دعائے مغفرت کے کیا معنی؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ دعائے مغفرت کی خاصیت ہے کہ کوئی آدمی کسی کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے، اگر اس کے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو یہی دعائے مغفرت اس کے لیے ترقی درجات کا سبب بنتی ہے۔ معلوم ہوا کہ دعا ایک بہت ہی مفید اور کارآمد چیز ہے۔

تو قبروں کی زیارت کے سلسلہ میں جو باتیں اہم ہیں، وہ سب تفصیل سے ذکر کر دی گئیں۔

ایک مراقبہ

۵۸۴: وعن ابن عباسٍ رضي الله عنهما قال: مرَّ رسول الله ﷺ بقبورٍ بالمدينة، فأقبلَ عليهم بوجهه، فقال: السَّلامُ عليكم يا أهل القبور، يغفرُ اللهُ لنا ولكم، أنتم سألتمنا ونحن بالأنثَرِ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کا گزر مدینہ منورہ میں چند قبروں کے پاس سے ہوا، آپ ان کی طرف اپنے چہرے سے متوجہ ہوئے (یعنی ان کے قریب گئے) اور آپ نے کہا: اے قبر والو! تم پر سلام ہو، اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے (دیکھو! آپ ﷺ نے دعائے مغفرت فرمائی) تم ہم سے پہلے دنیا سے رخصت ہوئے، ہم تمہارے بعد میں آرہے ہیں۔

افادات:- ظاہر ہے جانے والے حیلے گئے، اب ہماری باری ہے۔ آدمی قبرستان میں جا کر یہ بھی سوچے، اور قبر والا جیسا آدمی تھا ویسا منظر سامنے لائے۔ بہت سی قبریں ایسے لوگوں کی ہوں گی جن کو آپ نے ان کی زندگی میں دیکھا تھا کہ کیسے حالات تھے، بعض کروڑ پتی تھے، بڑے رعب و دبدبے والے تھے، بڑے ثروت و دولت والے، بڑے عہدے و منصب والے ایسے بھی ہوں گے جن سے آپ واقف تھے، ان کی قبر پر جب نظر پڑے تو آدمی کو سوچنا چاہیے کہ زندگی میں اس آدمی کا کیا حال تھا، اور آج قبر کے اندر پڑا ہوا ہے، کوئی پرسیاں حال نہیں۔ اس غور و فکر کے نتیجہ میں آدمی کا دل دنیا کی طرف سے سرد ہوتا ہے، اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے، دنیا کی محبت کم ہوتی ہے، اور قبروں کی زیارت کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔

غفلت کا انتہائی درجہ، اس کا علاج

ورنہ آج کل ہم لوگوں کا مزاج تو ایسا بنا ہوا ہے اور غفلت اتنی زیادہ طاری ہے کہ قبرستان میں ایک طرف میت کو دفن کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف لوگ ٹولیاں بنا بنا کر دنیا کی باتوں میں لگے ہوئے ہیں، اتنی دیر کے لیے بھی ہم سے خاموش رہا نہیں جاتا۔ بعض لوگ تو وہیں بیڑی سیگریٹ پینے لگتے ہیں۔ قبرستان سے ہمیں جو عبرت حاصل کرنی چاہیے وہ ختم ہو گئی۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے: اب تو قبرستان سے عبرت حاصل کرنے کی ہماری صلاحیت بھی باقی نہیں رہی۔ ہاں! اتنا ہے کہ ہسپتال جاتے ہیں تو تھوڑا بہت اثر ہو جاتا ہے؛ لیکن اب تو دھیرے دھیرے وہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے، ہسپتال جا کر بھی اثر قبول کرنے والے پہلے کے مقابلہ میں کم لوگ رہ گئے ہیں۔ ہاں! کوئی اگر شدید مریض ہو جس کی کیفیت دیکھنے کے قابل نہ ہو، تو کچھ اثر ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ

کے یہ سارے حالات ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارا مزاج جو ایسا بنتا جا رہا ہے وہ غفلت کا انتہائی درجہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے غفلت کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بتلایا ہے، اور اس کے ذریعہ عبرت حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس لیے اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر وہاں جانے کے بعد بھی ہمارے دلوں پر اثر نہیں ہوتا؛ تو پھر ہماری اس قساوت، دل کی سختی اور غفلت کو دور کرنے کا کیا علاج کیا جائے۔ اس لیے آدمی کو کثرت سے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پہلے روزانہ وہاں جائے اور زیادہ وقت وہاں گزارے، یہاں تک کہ یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ جیسے: ایک آدمی کوئی میٹھی چیز کھا رہا ہے اور وہ اس کو ٹروی لگ رہی ہے، تو پھر اس آدمی کو سوچنا چاہیے کہ یہ میری بیماری ہے، مجھے اس کا علاج کرنا چاہیے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آدمی قبروں کی زیارت کا اہتمام کرے۔ ہم لوگ اس سلسلہ میں بڑی غفلت برتتے ہیں، بہت گنے چنے ہوتے ہیں جو اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ کم سے کم جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے سیدھے قبرستان جائیں، پھر گھر میں قدم رکھیں۔ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ورنہ آج کل ایسا ہو گیا ہے کہ ایک صاحب کہنے لگے: اب تو مرنے والوں کو اتنا جلدی بھلا دیا جاتا ہے کہ موت کے بعد تیسرے چوتھے دن تو کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ ویسے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ دفن کرنے کے بعد دفن کرنے والے قبر سے واپس رخصت ہونے لگتے ہیں تو ایک فرشتہ مٹھی میں مٹی اٹھا کر ان کے چہروں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ جاؤ! اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ اور اس کو بھول جاؤ (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور، باب دفن العبر فی الأرض التي خلق منها) اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ اس فرشتہ کی بات کا اثر ہم

بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔

خیر! یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے اتنے سارے واقعات پیش آتے ہیں ان کے بعد تو ہمارا جی کسی چیز میں لگنا ہی نہیں چاہیے۔ مرنے والوں کو دیکھ رہے ہیں اور دفن کر رہے ہیں، لیکن ہم پر انتہائی درجہ کی غفلت طاری ہو چکی ہے۔ حالاں کہ مزاج میں اعتدال ہونا چاہیے، اور ان باتوں کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

كَرَاهَةً تَمَيُّبِ الْمَوْتِ بِسَبَبِ ضُرِّ نَزَلٍ بِهِ

وَلَا بَأْسَ بِهِ لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ فِي الدِّينِ

کسی مصیبت کے سبب موت کی تمنا

کانا پسندیدہ ہونا

اور دینی فتنہ میں مبتلا ہونے کے ڈر سے

موت کی دعا کرنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پچھلے ابواب میں چند باتیں گزریں، پہلے موت کو یاد کرنے کا تذکرہ تھا، اس کے بعد والے باب میں قبروں کی زیارت کا طریقہ بتلایا تھا، ان ابواب کی وجہ سے شاید کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ موت کی دعا بھی کی جاسکتی ہے، موت مانگی بھی جاسکتی ہے؛ تو موت مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق تفصیل ہے جو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کے تحت بتا رہے ہیں کہ کسی مصیبت کے نازل ہونے کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا منع ہے، البتہ اگر دین میں فتنہ کا ڈر اور خطرہ ہو، تو موت کی تمنا کی جاسکتی ہے۔

مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیماری میں گرفتار ہوتا ہے، ایک مدت تک علاج و معالجہ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، لیکن وہ بیماری ٹھیک نہیں ہوتی، وہ آدمی اس بیماری کی وجہ سے پریشان ہو کر عاجز آ کر موت کی دعا و تمنا کرتا ہے۔ یا مالی و اقتصادی اعتبار سے مصیبت آئی، کھانے پینے کی تکلیف ہے، ادھر ادھر بہت کچھ ہاتھ پیر مارے، محنت بھی کی؛ لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا، طویل مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا، گھر والے بھی تقاضے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ یا اولاد پریشان کرتی ہے، یا بیوی نافرمان ہے جس کی وجہ سے ٹینشن رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی دنیوی مصیبت کی وجہ سے، چاہے وہ بیماری کی شکل میں ہو، یا کسی اور شکل میں ہو، آدمی یہ سوچتا ہے کہ موت بھی نہیں آتی؟ اگر موت آجائے تو اچھا ہے۔ لیکن ایسے حالات کی وجہ سے موت کی تمنا اور دعا کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر موت مانگنی ہی ہے تو؟

اگر ایسے حالات آگئے کہ پریشانی کی وجہ سے طبیعت موت کی دعا کرنے

کے لیے آمادہ ہی ہے، تو اس کا ایک طریقہ بتایا گیا کہ آدمی یوں دعا کرے: ”اللَّهُمَّ أَحْيِيْ مَا كَانَتْ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ، وَتَوَفَّيْنِيْ إِذَا كَانَتْ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ“ اے اللہ! مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لیے زندگی میں بھلائی اور خیر ہے، اور مجھے موت دے اگر میرے لیے موت میں خیر اور بھلائی ہو۔ اس لیے کہ آدمی کا یقینی اور قطعی طور پر اپنے لیے موت کا سوال کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنے لیے گویا یہی سمجھتا ہے اور اس نے اپنے لیے فیصلہ کر لیا ہے کہ موت ہی میرے حق میں بہتر ہے، حالاں کہ ظاہر ہے اس کو آئندہ کے حالات معلوم نہیں کہ مستقبل اپنے اندر کیا چھپائے ہوئے ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ اس لیے آدمی اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کرے؛ بلکہ جب حالات ایسے ہوں تو یہ دعا کر سکتا ہے جو ابھی بتلائی، لیکن صراحتاً موت کی دعا مانگنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

دینی آزمائش کی وجہ سے موت مانگنا

البتہ اگر آزمائش اور حالات ایسے پیش آئے کہ دینی اعتبار سے نقصان کا اندیشہ اور خطرہ ہے کہ کہیں ایمان ہاتھ سے نہ چلا جائے، یا بد عملی میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ یقین کے درجہ میں ہو، یا غالب گمان ہو۔ صرف وہم کی بنیاد پر نہیں۔ تو اپنے آپ کو دینی ضرر اور نقصان سے بچانے کے لیے اگر وہ موت کی دعا کرتا ہے تو اس کی اجازت دی گئی ہے؛ ورنہ اجازت نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اخیر حجاج کیا جس کے بعد ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، اس حج میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دعا کی تھی: اے اللہ! سلطنت کے حدود بہت پھیل چکے ہیں اور میرے قومی کمزور ہو رہے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ تیرے بندوں

میں سے کسی بندے کا حق میرے ہاتھوں کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ایسا ہو اس سے پہلے تو مجھے موت عطا فرما۔ وہاں سے واپس لوٹ کر جب مدینہ منورہ پہنچے اور ایک دو نمازیں ہی پڑھانے کی نوبت آئی تھی کہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ (بخاری/اسد الغابہ/سیرۃ ابن الخطاب)

موت کی تمنا کرنے کی کوئی وجہ نہیں

۵۸۵:- عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله ﷺ قال: لا يَتَمَنَّأ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ، إِلَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهُ يَزِدَّ أَجْرًا، وَإِلَّا مُسِيئًا فَلَعَلَّاهُ يُكْتَسَبُ عِتْبٌ.

(متفق عَلَيَّهِ، وَهَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ)

وفی روایة لمسلم: عن أبي هريرة رضي الله عنه عن رسول الله ﷺ قال: لا يَتَمَنَّأ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ، وَلَا يَدْعُ بِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُ؛ إِنَّهُ إِذَا مَاتَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ وَإِنَّهُ لَا يَزِيدُ الْمُؤْمِنَ عُمْرًا إِلَّا خَيْرًا.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم

ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے (کیوں؟ نبی کریم ﷺ نے آگے خود ہی اس کی توضیح فرمائی ہے۔ اس لیے کہ موت کی تمنا کرنے والا دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ نیکو کار ہے، یا بدکار ہے۔ اعمالِ صالحہ پر مدد و امت کرنے والا ہے، یا برائیوں اور گناہوں میں مبتلا رہتا ہے) اگر وہ نیکو کار ہے تو (موت کی تمنا کیوں کرتا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے اسے نیک کام کرنے کی توفیق دے رکھی ہے، تو آئندہ کی زندگی میں مزید نیک کام اس کے ہاتھوں وجود میں آئیں گے) اس کی نیکیوں میں اضافہ ہوگا (اور یہی چیز آخرت کے اعتبار سے درجات کی ترقی کا ذریعہ بنے گی۔ تو ایسے آدمی کے لیے تو زندگی میں فائدہ ہے، پھر کیوں موت مانگتا ہے؟) اور اگر وہ بدکار ہے (اس لیے موت کی

تمنا کرتا ہے تاکہ جلدی سے اس کو بدکاری سے نجات ملے) تو ہو سکتا ہے کہ آئندہ زندگی میں اس کو توبہ نصیب ہو جائے (نیکی کی توفیق مل جائے، اور وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے۔ اگر ابھی اسی حالت میں موت آجائے گی تو دنیا سے بغیر توبہ کے جائے گا، حالاں کہ اس کے لیے آئندہ امید اور توقع ہے کہ اعمالِ صالحہ اور توبہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے۔ اس لیے ایسا آدمی بھی کیوں موت کی تمنا کرتا ہے؟)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہی روایت مسلم شریف میں دوسرے الفاظ سے آئی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے، اور موت آنے سے پہلے اس کی دعا بھی نہ کرے۔ اس لیے کہ جب وہ مر جائے گا تو عمل کا سلسلہ ختم ہو جائے گا (اس لیے کیوں ایسی چیز کی تمنا کر رہا ہے کہ جس کے نتیجے میں اعمال کا سلسلہ ختم ہوتا ہے) اور مؤمن کی عمر اس کے لیے خیر ہی لے کر آتی ہے (اگر نیکو کار ہے تو اس کے لیے خیر ہونا ظاہر ہے، اور اگر بدکار ہے تو جیسا کہ اوپر آ گیا کہ امید ہے اس کو توبہ نصیب ہو جائے، تو یہ زندگی اس کے لیے بھی خیر کا ذریعہ بنے گی)

موت کی قطعی دعا نہ کرے

۵۸۶:- وعن أنسٍ رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ لِيُصَبِّرَ أَصَابَهُ، فَإِنْ كَانَ لِأَبَدِّ فَأَعْلًا، فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتْ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِي، وَتَوَفَّنِي إِذَا كَانَتْ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِي. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی کسی تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے۔ جو اس کو پہنچی ہے۔ موت کی تمنا نہ کرے۔ اور اگر دعا کرنی ہی ہے تو (پھر قطعی طور پر دعا نہ کرے کہ اے اللہ! مجھے موت دے ہی

دے، بلکہ) یہ دعا کرے: اے اللہ! اگر میرے لیے میری زندگی میں خیر و بھلائی ہے، تو مجھے زندہ رکھ۔ اور اگر میرے لیے موت کے اندر بھلائی ہے، تو مجھے موت نصیب کر۔

افادات:- دنیوی مصیبت چاہے جسمانی ہو، چاہے مالی ہو، چاہے کسی اور طریقہ کی ہو؛ بہر حال مصیبت، تکلیف اور بیماری کی وجہ سے آدمی موت کی تمنا نہ کرے، اور اگر کسی وجہ سے ایسی دعا کرنی ہی ہو، اس کی طبیعت موت کی دعا کرنے کے لیے بے چین ہو، تو پھر قطعی طور پر دعا نہ کرے، بلکہ یہ دعا کرے: اے اللہ! میرے لیے میری زندگی میں اگر خیر اور بھلائی ہے تو مجھے زندہ رکھ، اور اگر میرے لیے موت کے اندر بھلائی ہے تو مجھے موت عطا کر۔ اس لیے کہ وہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے لیے کس چیز میں خیر و بھلائی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لیے آدمی کو مستقبل سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں میں قطعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جب بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرے تو اسی انداز سے کرے۔

مانگی تھی تلے کو، ملی اوپر کو

پہلے بھی میں نے قصہ سنایا تھا، حضرت شیخ رحمہ اللہ سنایا کرتے تھے کہ ایک آدمی سفر کر رہا تھا، سواری کے لیے کوئی جانور نہیں تھا اس لیے پیدل سفر کر رہا تھا۔ جب چلتے چلتے تھک گیا تو دعا کرنے لگا: اے اللہ! سواری دیدے، گھوڑا دیدے، گھوڑی دیدے بار بار یہی دعا کرتا رہا۔ جب دیکھا کہ نہ گھوڑا مل رہا اور نہ گھوڑی مل رہی ہے، تو کہنے لگا: اے اللہ! گھوڑی کا بچہ ہی دیدے۔ خیر! پھر وہ تھکا ہوا راحت و آرام حاصل کرنے اور کچھ سستانے کے لیے ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اس کے قریب سے ایک سپاہی ایک گھوڑی پر سوار جا رہا تھا، اس کی گھوڑی حاملہ تھی۔ اتفاق کی بات کہ وہیں اس کی

گھوڑی کو بچہ پیدا ہوا۔ نیا پیدا شدہ بچہ تھا، اس کو چلانا تو مناسب نہیں تھا، اس لیے اس سپاہی نے اس آدمی کو ایک ڈنڈا مار کر کہا: چل اٹھ! اور اُس کے کندھے پر اس بچہ کو ڈالا اور کہا: اس کو لے کر میرے ساتھ آگے آگے چل۔ اب یہ کہنے لگا کہ: اے اللہ! مانگی تھی تلے کو، بل گئی اوپر کو۔

عمورتوں کی عادت

اس لیے جب اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگی جائے تو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ ہماری بہت سی ایسی دعائیں قبول نہیں کرتے ورنہ بہت سی مرتبہ آدمی اپنے مال اور اولاد سے ناراض ہو کر بددعا کرتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر عمورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ تھوڑی تکلیف پہنچی تو کہتی ہیں کہ: یہ بچہ مر بھی نہیں جاتا، تکلیف دیتا رہتا ہے، مر جائے تو اچھا۔ پھر جب وہ دعا قبول ہو جاتی ہے تو زندگی بھر روتی پھرتی ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی بہت سی دعاؤں کو قبول نہیں کرتے۔ قرآن پاک میں بھی موجود ہے ﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتَعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ﴾ (یونس: ۱۱) اس کی تفسیر بخاری شریف میں حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ یہی فرماتے ہیں (۱) تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس چیز کے متعلق یقینی معلوم نہ ہو، اس کے متعلق آدمی یقینی طور پر اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا نہ کرے۔

بددعا کا خاصہ

ایک بات ضمنیاً یاد آگئی اس لیے بتلا دیتا ہوں۔ حضرت شیخ رضی اللہ عنہ نے آپ بیٹی میں لکھا ہے کہ بعض مرتبہ کسی کو کوئی نقصان و تکلیف پہنچتی ہے، اب یہ سمجھتا ہے کہ فلاں آدمی نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا،

بلکہ کسی دوسرے نے کیا ہے۔ اب وہ تو یہی سمجھ رہا ہے کہ فلاں نے میرے ساتھ ایسا کیا ہے، اس لیے اس کا نام لے کر اس کے لیے بددعا کرتا ہے کہ اے اللہ! اس کو موت آجائے، اس کا ایسا نقصان ہو جائے، وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ تو اس کے لیے بددعا اس لیے کر رہا ہے کہ یہی سمجھ رہا ہے کہ اسی آدمی نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور میرا نقصان کیا ہے، میرے گھر کو آگ اسی نے لگائی ہے، حالاں کہ اس نے اس کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا نہیں ہے، کسی نے اس کے ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے، اور اس کے دل و دماغ میں ایسا بھر دیا ہے۔

اور یاد رکھنا بددعا کا ایک خاصہ ہے۔ جو لوگ بددعا میں کرتے رہتے ہیں وہ بھی ذرا سنبھلیں، اس لیے کہ بددعا ایک طرح کی لعنت ہے۔ اور لعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دور کر دینے کی دعا۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ آدمی جب کسی کے لیے بددعا کرتا ہے تو یہ بددعا آسمان پر جاتی ہے، لیکن آسمان کے دروازے اس کے لیے بند کر دیئے جاتے ہیں، پھر نیچے آتی ہے اور جس کے لیے بددعا کی گئی ہے اس کے پاس جاتی ہے، اب اگر وہ اس بددعا کا حقدار ہوتا ہے، یعنی جس کے لیے بددعا کی گئی ہے، واقعتاً اس کی حرکتیں ایسی ہیں کہ اس نے ظلم و زیادتی کا معاملہ بددعا کرنے والے کے ساتھ کیا ہے؛ تب تو وہ اس کو لگ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ بلا وجہ اس کے لیے بددعا کی گئی ہے؛ تو پھر وہ اس کو نہیں لگتی، بلکہ بددعا کرنے والے پر ہی واپس لوٹ آتی ہے، اور اسی کو نقصان پہنچاتی ہے۔

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مثال

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے تھے کہ

بددعا تو ایک گیند کی طرح ہے، اگر آپ نے گیند پھینکی تو جہاں پھینکی گئی ہے وہ جگہ نرم ہے اور اس گیند کو اپنے اندر سمونے کی اس میں صلاحیت ہے تو وہ گیند اندر چلی جائے گی، اور اگر وہ جگہ اس قابل نہیں ہے، بلکہ سخت ہے، تو جس نے گیند پھینکی ہے اسی کے پاس واپس آ جائے گی۔ بددعا کا بھی یہی حال ہے۔

احتیاط والی بات

اس لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی کسی کے لیے بددعا کیوں کرے؟ اور اگر اپنے کسی نقصان کی وجہ سے ایسی نوبت آ ہی گئی ہے تو حضرت شیخ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کسی کا نام نہ لے؛ بلکہ یوں کہے: اے اللہ! جس نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے، میرے گھر میں جس نے آگ لگائی ہے، اس کے ساتھ تو ایسا کر۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے جس کا نام لیا ہے اس نے نہ کیا ہو، کسی دوسرے نے کیا ہو۔ جب آپ یہی کہیں گے کہ جس نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے، تو پھر وہ اپنی جگہ پر درست ہے۔ اب اگر آپ جس کے متعلق سمجھ رہے ہیں، اسی نے کیا ہے تو اس کو لگے گی۔ اور اگر اس نے نہیں کیا ہے بلکہ کسی دوسرے نے کیا ہے تو جس نے کیا ہے اس کو لگے گی۔ اس لیے بددعا کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اگر منع نہ ہوتا تو میں موت کی دعا کرتا

۵۸۷:- وعن قیس بن اَبی حازمٍ، قَالَ: دَخَلْنَا عَلٰی خَبَّابِ بْنِ الْاَرْتِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ نَعُوذُهُ وَقَدِ اُكْتُوِي سَبْعَ كَيِّمَاتٍ، فَقَالَ: اِنَّ اَصْحَابَنَا الَّذِيْنَ سَلَفُوا مَضَوْا، وَلَمْ تَنْقُضْهُمْ الدُّنْيَا، وَاِنَّا اَصْبْنَا مَا لَا نَجِدْ لَهُ مُوَضِعًا اِلَّا التُّرَابَ وَلَوْلَا اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَانَا اَنْ نَدْعُو بِالْمَوْتِ لَدَعَوْتُ بِهٖ. ثُمَّ اتَيْنَا هَآءِهِ اُخْرٰى

وَهُوَ يَبْنِي حَائِطًا لَهُ، فَقَالَ: إِنَّ الْمُسْلِمَ لَيُؤْجَرُ فِي كُلِّ شَيْءٍ يُنْفِقُهُ إِلَّا فِي شَيْءٍ يَجْعَلُهُ فِي هَذَا التُّرَابِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: - حضرت قیس بن ابی حازم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھے، ہم لوگ ان کے پاس عیادت و خبر گیری کے لیے حاضر ہوئے (حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان حضرات صحابہ میں سے ہیں جو شروع میں اسلام لائے تھے، اور جن کو بڑی تکلیفیں پہنچائی گئیں تھیں) انہوں نے اس بیماری میں سات مرتبہ داغ لگوائے تھے (لکھا ہے کہ ان کو بوا سیر کی تکلیف تھی، کسی طرح سے ٹھیک نہیں ہو رہی تھی، کسی نے یہ علاج بتلایا تو انہوں نے داغ لگوائے۔ جب ہم لوگ حاضر ہوئے تو) انہوں نے فرمایا: ہمارے وہ ساتھی جو انتقال کر گئے، انہوں نے دنیا کو ایسی حالت میں چھوڑا کہ دنیا نے ان کی آخرت کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور ہم دنیا میں زندہ رہے تو ہمارے ہاتھ میں اتنی دولت آئی کہ اس کو رکھنے کے لیے مٹی کے علاوہ اور کوئی جگہ ہمارے پاس نہیں ہے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی دعا سے ہم کو منع نہ کیا ہوتا تو میں موت کی دعا کرتا (اس سے معلوم ہوا کہ موت کی دعا کرنے سے منع کیا گیا ہے) قیس بن حازم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر دوبارہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت وہ اپنی ایک دیوار درست کر رہے تھے (یعنی تعمیر کر رہے تھے، جب ہم نے یہ دیکھا تو اس پر) انہوں نے کہا: مسلمانوں کو ان کے ہر اس کام میں جس میں وہ مال خرچ کرتے ہیں؛ ثواب ملتا ہے، مگر جو مال مٹی میں ڈالیں (یعنی تعمیر پر خرچ کرے) اس میں ثواب نہیں ملتا۔

افادات: - جب آدمی کو دنیا کے اندر کوئی بھی نعمت اور راحت پہنچتی ہے تو اس میں اس کے اعمال خیر کا دخل ہوتا ہے، اور جو تکلیف و مصیبت آتی ہے اس میں اس

کے اعمالِ بد کا دخل ہوتا ہے ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے وہ ساتھی جو ایمان لائے اور اس کے واسطے انہوں نے تکلیفیں اٹھائیں، ان تکلیفوں پر بڑے بڑے ثواب کے مستحق بنے، لیکن دنیا کی نعمتیں ان کو ہاتھ لگے اس سے پہلے ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس لیے کہ بعد میں فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا، بڑے بڑے ملک فتح ہوئے، اور مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں بے شمار دولت آئی۔ اگر وہ لوگ بھی یہ زمانہ پاتے تو ان کے پاس بھی یہ ساری چیزیں آتیں اور دنیا میں کچھ نعمتیں، مال و دولت اور ثروت ان کو بھی ملتیں، اور ان کو آخرت میں ان کے اعمال کا جو بدلہ ملنے والا ہے اس کے اندر کمی کا ذریعہ بنتیں، لیکن وہ تو ان سب میں سے کچھ بھی نہیں لے گئے؛ اس لیے ان کو آخرت میں پورا پورا بدلہ ملے گا۔ گویا دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ دنیا کی نعمتوں نے ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں ہونے دی، دنیا سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جتنے بھی اعمال کیے تھے ان کا پورا پورا بدلہ وہیں ملے گا۔ اور ہم دنیا میں زندہ رہے تو ہمارے ہاتھ میں اتنی دولت آئی کہ اس کو رکھنے کے لیے مٹی کے علاوہ اور کوئی جگہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ ایک وقت وہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں صدقہ کرنے کے لیے درہم موجود نہیں تھتا اور آج میرے گھر پر تیس چالیس ہزار درہم پڑے ہوئے رہتے ہیں۔

تعمیر میں خرچ ناپسندیدہ ہے

مسلمانوں کو ان کے ہر اس کام میں جس میں وہ مال خرچ کرتے ہیں۔ چاہے اولاد اور گھروالوں پر ہو یا دوست احباب پر۔ ثواب ملتا ہے، مگر جو مال مٹی میں ڈالیں یعنی

تعمیر کے اندر خرچ کریں، اس پر ثواب نہیں ملے گا۔ تعمیر پر مال خرچ کرنے کی حدیث پاک میں ممانعت آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کا گزر ہمارے پاس سے ہوا، اور ہمارا ایک جھونپڑا تھا جس کو ہم مٹی سے لپ رہے تھے، تو حضور اکرم ﷺ نے تعمیر سے متعلق یہی ارشاد فرمایا جو اوپر گزرا۔ اس پر ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ جھونپڑا ہی تو ہے جس کو لپ کر ذرا ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: موت تو اس سے بھی جلدی آنے والی ہے (ترمذی: باب ماجاء فی قصر الأمل / ابوداؤد: باب ما جاء فی البتاء) یعنی جھونپڑا لپ کر ٹھیک ٹھاک کرو گے تو اس ٹھیک کتے ہوئے جھونپڑے سے پورا فائدہ اٹھانے کی نوبت بھی نہیں آئے گی، اس لیے کہ یہ جھونپڑا سال دو سال، چار سال تو ٹکے گا، اس سے پہلے تو موت آ جائے گی۔ معلوم ہوا کہ تعمیر میں مال خرچ کرنے کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مساجد کو مزین کرنے سے حدیث پاک میں ممانعت آئی ہے اور مساجد کو مسزین کرنے کو قیامت کی نشانی بتلایا گیا ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں اس کی ممانعت کے باوجود آج تعمیر کا یہ حال ہے کہ عمارتیں آسمان کو چھو رہی ہیں؛ تو اگر ذرا سی ترغیب آئی ہوتی تو ہمارا کیا حال ہوتا!!!۔

بَابُ الْوَرَعِ وَتَرْكِ الشُّبُهَاتِ

احتیاط سے کام لینا اور مشتبہ سے بچنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مُحَمَّدًا وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ
بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مِنْ بِيْدِ اللّٰهِ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ
يُّضِلُّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُوْ نَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا
وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدًا وَرَسُوْلُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ نَسْلِيْمًا
كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ:-

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَتَحْسَبُوْنَہٗ
هَيِّئْنَا وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ۔

ورع کا مطلب

امام نووی رحمہ اللہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے: ورع کا بیان۔

ورع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی احتیاط اور بچاؤ سے کام لے۔ جس چیز سے شریعت نے منع کیا ہے اس سے بچنا تو ضروری ہے ہی، اگر کوئی آدمی اس کا ارتکاب کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ لیکن شریعت کی منع کی ہوئی کچھ چیزوں سے بچنے کے لیے آدمی ایسی چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن سے شریعت نے منع نہیں کیا ہے؛ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ”ورع“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً: آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بعض ایسے کاموں سے بھی اپنے آپ کو بچائے جو فی نفسہ جائز ہیں، لیکن ان کے کرنے کی صورت میں یہ خطرہ ہے کہ یہی کام کسی ناجائز کام تک لے جانے کا ذریعہ بنیں گے؛ اسی کا نام ”ورع“ ہے۔

تو ورع کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی ناجائز کام میں پھنس جانے اور مبتلا ہو جانے

اور ناجائز چیز کا ارتکاب ہو جانے کے ڈر سے جائز کام کو بھی چھوڑ دے۔

شبه والی چیز کو چھوڑنا

عنوان کا دوسرا جزو تھا ”تَرْكُ الشُّبُهَاتِ“ جس کام کے متعلق آدمی کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ جس کو مشتبہ کہتے ہیں۔ ان چیزوں کو بھی چھوڑ دینا۔ کبھی کسی کام میں دونوں طرح کے پہلو ہوا کرتے ہیں، آدمی کسی ایک پہلو کو دیکھتا ہے تو اس کو وہ کام ناجائز معلوم ہوتا ہے، دوسرے پہلو سے اس کو دیکھتا ہے تو وہ کام ناجائز معلوم ہوتا ہے، گویا اس کام کے سلسلہ میں اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز؛ تو اس کو بھی چھوڑ دے۔

تم اس کو معمولی سمجھتے ہو

باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا: ﴿وَتَحْسَبُوْنَ نَهْ هَيْبَةً وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ تم اس کو معمولی سمجھتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بہت بڑی چیز ہے۔ بعض مرتبہ کوئی معمولی اور چھوٹا سا کام ہوتا ہے، جس کو آدمی ہلکا سمجھ کر کر ڈالتا ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا اور قابلِ مواخذہ ہوتا ہے، اور اسی پر پکڑ دھکڑ ہو جاتی ہے۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حکایات صحابہ میں ایک قصہ ذکر کیا ہے۔ ایک بزرگ تھے، انہوں نے خط لکھا۔ اس زمانہ میں قلم سے لکھا جاتا تھا، اس کی روشنائی کو سکھانے اور خشک کرنے کے لیے مٹی استعمال کی جاتی تھی۔ خط لکھنے کے بعد اس خط پر مٹی ڈال دیتے تھے، وہ مٹی روشنائی کو چوس لیا کرتی تھی، پھر اس مٹی کو جھاڑ دیا کرتے تھے۔ تو خط لکھنے کے بعد اس پر ڈالنے کے لیے مٹی نہیں تھی۔ جس مکان میں رہتے تھے وہ کراہیہ کا کچا مکان تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اس کی دیوار پر سے کچھ مٹی کھرچ کر اس پر ڈال لوں اور روشنائی کو خشک کر لوں، پھر خیال آیا کہ یہ مکان کراہیہ کا ہے،

میں مالک تو ہوں نہیں۔ پھر سوچا کہ معمولی سی مٹی ہی تو ہے، اس لیے کھرچ کر ڈال دی، رات کو خواب میں دیکھا، کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے: کل قیامت میں پتہ چلے گا کہ یہ مٹی معمولی ہے یا نہیں!۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی مرتبہ آدمی کسی کام کو اپنے خیال سے چھوٹا سمجھتا ہے؛ لیکن یہی چھوٹا کام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بن کر اس کی قسمت کا فیصلہ کر ڈالتا ہے، اس لیے ایسی کسی بھی چیز کو معمولی نہ سمجھا جائے۔

اور گناہوں کا مسئلہ ایسا ہی ہے۔ گناہ کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی۔ علماء نے قرآن پاک کی آیتوں اور احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے گناہوں کی تقسیم صغیرہ اور کبیرہ کی ہے یعنی چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ۔ اس کے باوجود بعض اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ کوئی گناہ چھوٹا نہیں، سب گناہ بڑے ہی ہیں، انہوں نے اس پہلو سے دیکھا کہ گناہ کے ذریعہ نافرمانی کس کی ہو رہی ہے؟ اللہ تعالیٰ شانہ کی نافرمانی ہو رہی ہے۔ اور اللہ کی عظمت، اس کی کبریائی، اس کی بڑائی اور اس کی شان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو کوئی معمولی نافرمانی بھی معمولی نہیں ہے۔ کوئی آدمی کسی بڑے آدمی کی شان میں کوئی معمولی چیز کر لیتا ہے، تو وہ بھی بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔

یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے بدنگاہی کے متعلق پوچھا کہ: حضرت! بدنگاہی اور نامحرم کو دیکھ لینا؛ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ حضرت نے جواب میں لکھا کہ: چنگاری چھوٹی ہو یا بڑی؛ آگ لگانے کا کام تو دونوں ہی کرتی ہیں۔ ہمارے ایمان کو برباد کرنے کے لیے ایک بدنگاہی بھی کافی ہے۔ آدمی چھوٹی سی چنگاری اور جلتی ہوئی سگریٹ کو اپنے کپڑے کی پیٹی میں یہ سمجھ کر نہیں رکھتا کہ یہ چھوٹی سی تو ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پیٹی

کو جلانے کے لیے ایک سگریٹ بھی کافی ہے۔ اس لیے آدمی کو گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کہیں رفتار کو قابو میں لانا پڑتا ہے

اور گناہوں سے بچنے کے لیے بہت سے ایسے کام جو فی نفسہ گناہ نہیں ہیں، لیکن ان کے کرنے کے نتیجے میں ہو سکتا ہے کہ آدمی کی طبیعت گناہوں تک پہنچ جائے، ان جائز کاموں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ جیسے: بیمار آدمی کو بہت سی چیزوں سے بچایا جاتا ہے، ان میں بعض چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جو واقعہً اس کے لیے مضر ہوتی ہیں اور بعض چیزیں مضر تو نہیں ہوتیں لیکن اس کے باوجود گھروالے اس کے سامنے نہیں لاتے کہ اگر یہ کھائے گا تو ہو سکتا ہے کہ پھر معاملہ آگے بڑھے۔

ہم اپنے دنیوی معاملات میں ہر جگہ یہ سب باتیں سوچتے ہیں، جیسے کاروباری سلسلہ میں بھی سرکاری قانون کی رو سے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو ممنوع ہیں، اور بہت سے کام ممنوع تو نہیں ہوتے لیکن پھر بھی آدمی سوچتا ہے کہ اگر یہ کر لیں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پکڑ ہو جائے، اس لیے جو کام ممنوع نہیں ہیں ان سے بھی بچنے کا اہتمام کرتا ہے۔

یا جیسے آپ ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ تو ڈرائیونگ کے دوران بھی بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے، تو احتیاط کی خاطر وہاں اپنی رفتار کو قابو میں لے آتے ہیں۔ دین کی راہ پر چلنے والے آدمی کو بھی بہت سی مرتبہ اپنی رفتار کم کر دینی پڑتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ جب ہم اپنے دنیوی معاملات میں ہر جگہ اس چیز کا خیال

کرتے ہیں کہ پکڑ دھکڑ نہ ہو جائے، اگرچہ وہ چیز اپنی ذات کے اعتبار سے کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس کے باوجود اپنے آپ کو اس سے بچاتے ہیں؛ تو پھر دین کے معاملہ میں ایسا کیوں نہیں سوچتے؟

مشتبہ سے بچا تو دین و عزت محفوظ

اب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کچھ احادیث پیش کرتے ہیں۔ آگے جو روایت لائی جا رہی ہے وہ دین کے معاملہ میں بڑی اہم روایت ہے۔ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں، اپنے زمانہ کے بہت بڑے صاحب تقویٰ و طہارت بزرگ تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں جمع کیں، پھر ان میں سے انتخاب کر کے ایک کتاب تصنیف کی تو ان پانچ لاکھ میں سے چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) روایتیں اس کتاب میں ذکر کیں، اسی کتاب کا نام ”سنن ابو داؤد“ ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ان چار ہزار آٹھ سو روایتوں کا خلاصہ صرف چار حدیثیں ہیں جن میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے جو ابھی آرہی ہے۔

۵۸۸:- وَعَنِ النَّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

يَقُولُ: إِنَّ الْحَلَالَ بَيْنَ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيْنَ، وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ دِينَهُ وَعَرْضَهُ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْغَى حَوْلَ الْحِمَى، يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ فِيهِ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا وَإِنَّ حِمَى اللَّهِ فَحَارِمُهُ. أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ.

(متفق علیہ، ورواہ من طرقٍ بألفاظٍ متقاربة.)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: حلال بھی واضح ہے، اور حرام بھی واضح ہے (یعنی شریعت نے بتلا دیا ہے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے) اور اس حلال و حرام کے بیچ بیچ میں بعض چیزیں مشتبہ ہیں جن کو بہت سے لوگ جانتے بھی نہیں (اور ان کے متعلق وہ آسانی سے فیصلہ بھی نہیں کر پاتے۔ اب جو آدمی اپنے دین کی حفاظت کرنا چاہتا ہو اور اپنے آپ کو دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچنا چاہتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ان مشتبہ چیزوں سے بچالے) اب اگر اس نے مشتبہ سے اپنے آپ کو بچا لیا تو اپنے دین اور اپنی عزت و آبرو دونوں کی حفاظت کر لی۔ اور جو شبہ والی چیز کے اندر پڑا تو وہ حرام کے اندر مبتلا ہو جائے گا (اور اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مثال دے کر سمجھاتے ہیں) جیسے ایک چرواہا کسی چراگاہ کے قریب اپنے جانوروں کو چراہا ہو، تو ہو سکتا ہے کہ وہ ادھر منہ ڈال دے اور اندر چلا جائے۔ اور جان لو کہ ہر بادشاہ و حکمران کی کچھ چراگاہیں (باڑے) مقرر ہیں۔ خبردار! اللہ تعالیٰ کی چراگاہیں اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ اور دیکھو! ہر آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے، اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑتا ہے۔ اور سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔

افادات:- ”اِسْتَبْرَأْ لِدِينِهِ وَعَرْضِهِ“ مشتبہ چیزوں سے اگر بچ جائے گا تو دین بھی محفوظ رہے گا، یہ تو صاف بات ہے۔ اس لیے کہ اگر اس سے نہیں بچا تو آگے جا کر یہی چیز حرام میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بنے گی، اور جب حرام میں مبتلا ہوگا تو دین کہاں محفوظ رہا؟ تو مشتبہ سے بچنے میں گویا دین کی حفاظت ہوئی۔ اور عزت کی حفاظت اس طرح ہوتی ہے کہ جب آدمی کوئی مشتبہ کام کرتا ہے تو لوگ طعنہ دیتے ہیں اور بطور تعجب کہتے ہیں کہ فلاں نے ایسا کام کیا؟ گویا اس کی عزت پر آنچ آئی اور یہی

چیز اس کے لیے باعثِ عیب ہوئی۔ خاص کر دین دار طبقہ، جن کو دین سے کوئی تعلق ہوتا ہے، دینی معاملات میں کوئی مخصوص حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہ جب کبھی کوئی ایسا کام کر لیتے ہیں جو فی نفسہ تو جائز ہوتا ہے؛ لیکن کچھ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، تو لوگ اسی کو موضوعِ بحث بنا لیتے ہیں کہ دیکھو! فلاں صاحب نے ایسا کیا۔ اب اگر کہا بھی جائے کہ وہ کام جائز تھا اس لیے کیا، اس میں کیا اشکال ہے؟ تب بھی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تو دیکھو! اگر یہ آدمی اپنے آپ کو اس کام سے بچاتا؛ تو اس کی عزت کی بھی حفاظت ہوتی۔

شاہی چراگاہ

پہلے زمانہ میں بادشاہ، حکمران اور نواب ہوتے تھے، ان کے یہاں زمین کا ایک بڑا حصہ شاہی چراگاہ کے طور پر مخصوص کر لیا جاتا تھا، وہاں کسی اور کو جانور چرانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ گویا ان کے جانوروں کے چرانے کے لیے ایک مخصوص باڑا ہوتا تھا اور اس کے متعلق اعلان کر دیا جاتا تھا کہ یہ سرکاری چراگاہ ہے، اس کے اندر کوئی دوسرا اپنے جانور نہ چرائے۔ اب اگر اس میں کوئی آدمی اپنے جانور چراتا تو وہ مجرم قرار دیا جاتا، اور اس کو سزا کا حقدار سمجھا جاتا۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک چرواہا اپنے جانوروں کو کسی مخصوص باڑے اور سرکاری چراگاہ کے قریب چراہا ہو، تو اگر چہ جانوروں کو اندر نہیں لے گیا، بلکہ اس باڑے کے باہر کا جو حصہ ممنوع نہیں ہے، اور جہاں چرانے کی اجازت ہے؛ لیکن اس سرکاری باڑے کے بالکل قریب لگا ہوا حصہ ہے، تو ہو سکتا ہے کہ کبھی اس کی غفلت کی وجہ سے کوئی جانور سرکاری چراگاہ میں منہ ڈال دے، یا اندر گھس جائے؛ تو اس پر پکڑ دھکڑ ہو جائے۔ بس! ہمارے نفس کا بھی یہی حال ہے، اگر ہم اپنے نفس کو دور دور سے نہیں بچائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ نفس اندر ہی مبتلا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں، سب حکمرانوں کے اوپر حکمران ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی قانون سے تعلق رکھنے والا کچھ حصہ ایسا ہے جس کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے کہ کوئی اس کام کو نہ کرے۔ اسی کو حرام کہتے ہیں اور نبی کریم ﷺ نے اس کو سرکاری باڑے اور چراگاہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جس کے متعلق حاکم کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی نہ جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کاموں کا کوئی ارتکاب نہ کرے، یہ سرکاری چراگاہ ہے، کسی کو اس میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اب کوئی آدمی مشتبہ کام کرے گا تو مشتبہ چیز تو حرام کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس وہ مشتبہ کام کرتے کرتے اندر پہنچ جائے اور حرام کا ارتکاب کر لے۔

اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آ گیا تو.....

پھر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ جیسے جسمانی نظام کے اعتبار سے دل صحیح ہو تو سب اعضاء صحیح رہتے ہیں، اور دل پر ذرا سی آنج آگئی تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے، اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آ گیا تو سارا دین گڑبڑ میں آ جائے گا، اور دل ٹھیک رہا تو سارا دین ٹھیک رہے گا۔ جسم کے اندر جتنے اعضاء ہیں وہ سب دل کے تابع ہیں۔ آنکھ دیکھے گی نہیں جب تک کہ دل نہیں چاہے گا، جب دل حکم دے گا کہ یہ دیکھو، تو آنکھ دیکھے گی۔ دل حکم دے گا کہ سنو تو کان سنے گا۔ دل حکم دے گا کہ یہ بولو، تو زبان بولے گی۔ دل حکم دے گا فلاں چیسز پکڑو، تو ہاتھ آگے بڑھیں گے۔ دل حکم دے گا کہ فلاں جگہ جاؤ، تو قدم اٹھیں گے۔ اگر دل نہیں چاہے گا تو

پھر وہ کام نہیں ہوگا۔ جیسے کوئی کہے کہ یہ چیز کھاؤ، تو سامنے والا کہتا ہے کہ دل نہیں چاہتا، جب تک کہ آدمی کا دل نہیں چاہے گا وہاں تک وہ کوئی کام نہیں کرے گا۔ یہ پورا جسم ظاہری اعتبار سے بھی دل کے تابع ہے۔

نیت پر بنیاد کیوں؟

اسی لیے نیت کے اوپر بنیاد رکھی گئی ہے۔ نیت کیا ہے؟ دل کا چاہنا اور نہ چاہنا؛ اسی کا نام نیت ہے۔ اور یہ نیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ آپ کو اس کام پر آمادہ کرنے والا جذبہ کون سا تھا۔ وہ اگر ٹھیک ہے تو آپ کا کام بھی ٹھیک ہے، اور اگر وہ گڑبڑ ہے تو اس کام میں بھی گڑبڑ ہوگی۔

اس بات کا ڈر رہے گا

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو پیش کر کے خاص طور پر ”ورع“ ہی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! سرکاری چراگاہ کے اندر جانے کی ممانعت ہے، لیکن جو حصہ چراگاہ سے بالکل لگا ہوا ہے، وہ ممنوع حصہ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی چرواہا اپنے جانوروں کو لے کر اس حصہ میں چرائے گا تو اس بات کا ڈر رہے گا کہ کوئی جانور ممنوع حصہ کے اندر چلا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے، ان کے قریب قریب کی کئی چیزیں ایسی ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو حلال اور درست ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان سے بچنے کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی چیزیں آگے بڑھ کر گناہ میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بن جائیں۔

ایک نمونہ

احکام میں بھی بہت مرتبہ اس کی رعایت کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی

نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! روزہ کی حالت میں میں اپنی بیوی کو بوسہ دے سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ دوسرا آدمی آیا اور یہی سوال کیا تو حضور ﷺ نے اسے اجازت دیدی۔ دراصل پہلا سوال کرنے والا نوجوان تھا، اور ظاہر ہے کہ نوجوان کو اگر بوسہ کی اجازت دی جاتی، تو معاملہ جماع تک پہنچ سکتا تھا، اور دوسرا بوڑھا تھا اس میں وہ خطرہ نہیں تھا (ابوداؤد، باب كَرَاهِيَتِهِ لِلشَّاتِ، حدیث نمبر: ۲۳۸۹) ویسے فقہاء نے تو یہ قید کے ساتھ ہی بتا دیا کہ جس کو اپنے اوپر یہ اندیشہ ہو کہ اس کے نتیجے میں معاملہ آگے پہنچ سکتا ہے تو اس کو اجازت نہیں ہے، ورنہ گنجائش ہے۔ بوسہ فی نفسہ مفسدِ صوم نہیں ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔ یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے۔

امام صاحب کا ورع

ہمارے اسلاف کا معاملہ دین کے بارے میں یہی تھا۔ وہ حضرات تو گناہوں سے بچنے کے معاملہ میں بہت زیادہ پختہ اور محتاط تھے، پھر بھی اپنے آپ کو معمولی معمولی چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ دوپہر کے وقت جا رہے تھے، گرمی کا زمانہ تھا۔ گرمی کے موسم میں آدمی کوشش کرتا ہے کہ سایہ کے اندر ذرا آرام سے چلے۔ تو وہاں دیواروں کا سایہ تھا اسی میں چلتے ہوئے جا رہے تھے، چلتے چلتے اچانک سایہ میں سے باہر نکل آئے۔ کسی نے کہا: آپ باہر کیوں آگئے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس مکان کی دیوار کا یہ سایہ ہے، اس صاحب مکان کو میں نے کچھ قرض دے رکھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آدمی یوں سمجھے کہ میں نے جو قرض دیا ہے اس کی وجہ سے اس کی چیز سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ اور جس کو قرض دیا جائے، پھر اس قرض کے بدلہ میں اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے، تو وہ سود ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کوفہ کے قریب ایک قافلہ لوٹا گیا، اور اس لوٹ کی کچھ بکریاں کوفہ کے مارکیٹ میں بکیں، کس نے بیچی اور کس نے خریدی، اس کا کچھ پتہ نہیں چلا، لیکن اتنا طے تھا کہ لوٹ کا مال مارکیٹ میں بکا ہے، اور اس میں بکریاں بھی تھیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کسی سے پوچھا: بکری کی عمر کتنی ہوا کرتی ہے؟ بتایا گیا: چھ سال۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چھ سال تک بکری کا گوشت نہیں کھایا۔ حالاں کہ آپ کسی بھی مفتی سے پوچھئے تو وہ یہی کہے گا کہ آپ کے لیے بکری کا گوشت کھانا ممنوع نہیں ہے؛ لیکن وہاں صرف اس بات کا ڈر تھا کہ میں بکری کا گوشت کھا لوں، تو کہیں وہی بکری نہ ہو جو لوٹی گئی تھی۔ وہ حضرات اس معاملہ کے اندر اتنا زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ ہمارے اکابرین اور بزرگوں کے اور بھی بہت واقعات ہیں جو اس سلسلہ میں بہت زیادہ محتاط تھے۔

ناظم مطبخ کا ورع

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ سنایا تھا کہ مظاہر علوم میں ایک استاذ مولانا ظہور الحق صاحب تھے جو ناظم مطبخ تھے۔ اور مطبخ میں جو کھانا پکتا ہے وہاں کا جو ذمہ دار ہوتا ہے اس کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ نمک اور مزہ کے اعتبار سے کھانا برابر ہے یا نہیں، اور یہ کام چکھ کر ہی ہو سکتا ہے، لیکن وہ اتنی زیادہ احتیاط کرتے تھے کہ خود کبھی نہیں چکھتے تھے، بلکہ کسی طالب علم کو بلا کر چکھواتے تھے، حالاں کہ اگر خود بھی چکھتے تو یہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی ہوتی اور شرعاً اس کی اجازت تھی؛ لیکن اپنے آپ کو اس سے بچاتے تھے۔

مہتمم صاحب کا ورع

حضرت مولانا عنایت الہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مظاہر علوم کے مہتمم تھے، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب جلسہ ہوتا تھا تو پورے جلسہ کا انتظام کرتے تھے، شام کو گھر سے ان کا جو کھانا آتا تھا، وہ ایک کونہ میں رکھ دیتے تھے اور رات کو سب کام نمٹا کر، مہمانوں کو فارغ کر کے اپنا وہی کھانا جو بالکل ٹھنڈا ہو چکا ہوتا تھا، ایک کونہ میں بیٹھ کر کے کھا لیتے تھے۔ اتنی زیادہ احتیاط فرماتے تھے۔

مشتی بخاری کا ورع

حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جن کا حاشیہ بخاری شریف کے اوپر ہے۔ ان کے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مظاہر کے چندہ کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ کلکتہ ہی میں کسی جگہ ملاقات کے لیے تشریف لے گئے (جیسے یہاں نشاط سوسائٹی سے کوئی آدمی کسی کی ملاقات کے لیے چوک بازار جائے تو اس میں کرایہ خرچ ہوتا ہے) لیکن انہوں نے اس جگہ جانے کے لیے مدرسہ سے کرایہ وصول نہیں کیا، اور لکھا کہ اگرچہ میں وہاں گیا تو سب سے زیادہ چندہ ہوا؛ لیکن وہاں جانے میں میری نیت چندہ کرنے کی نہیں تھی؛ بلکہ اپنے ذاتی کام کے لیے ایک شخص سے ملاقات کی نیت تھی، اگر چندہ کی نیت سے جاتا تو مجھے حق تھا کہ مدرسہ سے کرایہ وصول کروں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رجسٹر کے اندر یہ نوٹ لکھا تھا، میں نے خود وہ نوٹ لکھا ہوا دیکھا ہے۔

طالب علمی کے زمانہ میں احتیاط

حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اکابر میں گزرے

ہیں۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ دہلی میں پڑھتے تھے، وہ طالب علمی کے زمانہ میں صرف روٹی کھاتے تھے، کبھی روٹی سالن کے ساتھ نہیں کھائی۔ کسی نے کہا: آپ صرف روٹی کھاتے ہیں؟ تو کہا: دہلی میں جتنے بھی سالن بنتے ہیں، ان میں اچھور ڈالا جاتا ہے (اچھور یعنی کچے آم کو سکھا کر رکھ لیا جاتا ہے، اور سالن کے اندر کھٹائی پیدا کرنے کے لیے ڈالتے ہیں۔ دلی والوں کے یہاں ہر سالن میں ڈالا جاتا ہے) اور ہمارے علاقہ کے اندر آموں کے باغات کی بیج صحیح نہیں ہوتی؛ اس لیے یہ سالن نہیں کھاتا۔ اتنا زیادہ احتیاط فرماتے تھے!۔

..... پھر ایک خط نہ لیتے

حضرت مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے بارے میں لکھا ہے کہ دہلی سے کاندھلہ جاتے تو بہلی والوں سے پہلے سے معاملہ کر لیا کرتے تھے اور اپنا پورا سامان بتلا دیتے تھے کہ میں سوار ہوؤں گا اور یہ میرا سامان ہے، اور اتنا کرایہ ہوگا۔ یہ سب طے ہو چکنے کے بعد اگر کوئی آدمی آتا اور کہتا کہ حضرت! آپ کاندھلہ تشریف لے جا رہے ہیں، میرا یہ ایک خط لے جائیے، تو حضرت فرماتے: دیکھو! میں اس سے معاملہ کر چکا ہوں اور اپنا سارا سامان بتلا چکا ہوں جس میں یہ خط نہیں تھا، اب تم اس سے پوچھ لو، اگر وہ اجازت دے، تو میں یہ خط لوں گا، ورنہ نہیں۔ حالاں کہ ایک خط لینے میں کون سا وزن بڑھ جاتا؛ لیکن نہیں لیتے۔ یہ ان کے تقویٰ اور ورع کی بات تھی۔

پرہیزگاری برتنا ہر ایک کا کام نہیں

ایک مرتبہ بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے کاندھلہ جا رہے تھے۔ اور بزرگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر ایک سے اس کے مزاج کے مطابق بات کرتے ہیں۔ راستہ میں

بیل گاڑی چلانے والے سے پوچھا: تم بیل کو کتنا چارہ دیتے ہو اور تمہاری تنخواہ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ دوران گفتگو اس نے کہا: یہ گاڑی تو ہماری نہیں ہے، یہ تو ہماری مالکہ کی ہے۔ پوچھا: کون ہے؟ پتہ چلا کہ یہ بیل گاڑی کسی طوائف اور رنڈی کی ہے۔ یہ سن کر حضرت کو ایک دم جھٹکا سا لگا، لیکن فوراً نہیں اترے بلکہ تھوڑی دیر چلنے دیا، پھر کہا: گاڑی ذرا ٹھہراؤ، مجھے استنجہ کا تقاضہ ہے، اور فارغ ہو جانے کے بعد اپنا ڈھیلا سکھانے کے لیے پیدل چلتے رہے، گاڑی چل رہی ہے اور حضرت بھی ساتھ چل رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا: حضرت! بیٹھ جائیے، تو حضرت نے کہا: ذرا پاؤں کی رگیں پھول گئی ہیں، اس لیے پاؤں چھوٹے کر رہا ہوں اور چلتے رہے۔ چلتے چلتے جب کافی دیر ہو گئی تو وہ بھی سمجھ گیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پتہ چل گیا کہ یہ طوائف کی ہے، اس لیے نہیں بیٹھیں گے۔ تو اس نے کہا کہ: حضرت! اگر ایسا ہو کہ آپ بیٹھنے والے نہ ہوں تو میں واپس چلا جاؤں۔ حضرت نے کہا کہ: یہ بات تو صحیح ہے کہ میں نہیں بیٹھوں گا؛ لیکن تم کو میرے ساتھ وہاں تک چلنا ہوگا، اس لیے کہ میرے ساتھ معاملہ کیا ہے اور میری وجہ سے دوسرے گاہوں کو منع کیا ہوگا، تو اس کا نقصان ہوگا اور مجھے یہ گوارہ نہیں ہے۔ پھر خالی گاڑی وہاں تک لے گئے، اور پورا کرایہ ادا کیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر حاشیہ لکھا ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری برتنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ خالی گاڑی اس لیے ساتھ لے گئے کہ بعض لوگوں کو کام کیے بغیر کرایہ لینا اچھا معلوم نہیں ہوتا، تو اس پر بھی بوجھ نہ پڑے کہ حضرت تو بیٹھے نہیں، اب میں اس کا کرایہ کیوں لوں؟

میں نے بات سمجھنے کے لیے یہ چند نمونے بتلائے کہ اگر مسئلہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کام جائز ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ لوگ احتیاط کرتے تھے۔ جیسے بعض

لوگ کہتے ہیں کہ فتویٰ کے اعتبار سے جائز ہے اور تقویٰ کے اعتبار سے ناجائز ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی گناہ میں پھنس جانے کے ڈر سے جائز کام کو بھی آدمی چھوڑ دے؛ اسی کا نام ورع ہے، اور اس کی حدیث پاک میں تاکید آئی ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ورع

۵۸۹:- وعن أنس بن مالك قال: سألت النبي ﷺ وَجَدَ تَمْرَةً فِي الظَّرِيقِ، فَقَالَ:

لَوْلَا أَنِّي أَخَافُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَأَكَلْتُهَا. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو راستہ میں ایک

کھجور کا دانہ ملا تو آپ نے فرمایا: اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ دانہ صدقہ کا ہوگا، تو میں اس کو کھا لیتا۔

افادات:- یعنی ایک طرف امت کو اس بات کی تعلیم بھی دیدی کہ کھانے

کی ایک چیز پڑی ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، ضائع نہیں ہونی چاہیے، لیکن اپنے

آپ کو اس کو کھانے سے اس لیے بچا رہے ہیں کہ ہو سکتا ہے کھجور کا یہ دانہ صدقہ کا ہو، اور

حضور پاک ﷺ کے لیے صدقہ کھانا منع تھا، اس لیے آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔ تو

کھجور کا وہ دانہ صدقہ کا ہوگا صرف اس ڈر کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس کو استعمال

نہیں فرمایا؛ یہی ورع ہے۔ حالاں کہ یقینی طور پر اور گارنٹی کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا تھا

کہ یہ صدقہ ہی کا ہے۔

جس چیز پر دل کھٹکے.....

۵۹۰:- وعن الثَّوَالِيسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الْبُرْتُ، حُسْنُ

الْخُلُقِ. وَالْإِثْمُ؛ مَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يُظْلِعَ عَلَيْكَ النَّاسُ. (رواه مسلم)

((حَاكَ)) بِالْحَاءِ الْمَهْمَلَةِ وَالْكَافِ: أَيْ تَرَدَّدَ فِيهِ

ترجمہ:- حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نیکی یہ ہے کہ آدمی کے اخلاق اچھے ہوں۔ اور گناہ یہ ہے جو دل میں کھٹکے، اور اس سے لوگ واقف ہو جائیں اس کو تو ناپسند کرے۔

۵۹۱:- وعن وَاِبِصَةَ بْنِ مَعْبُدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: أَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ؟ قُلْتُ: نَعَمْ. فَقَالَ: اسْتَفْتِ قَلْبَكَ. الْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتَ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ. وَالْإِثْمُ: مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ، وَتَرَدَّدَ فِي الصُّدْرِ، وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتَوْكَ. (حدیث حسن، رواه أحمد والدارقطني مُسْنَدًا بِهَيَاةٍ).

ترجمہ:- حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اس سے پہلے کہ میں آپ ﷺ سے کچھ پوچھوں) آپ نے خود ہی فرمایا: نیکی کیا ہے، اس کے متعلق پوچھنے کے لیے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے دل سے فتویٰ لے لو۔ جس کام پر دل مطمئن ہو وہ نیکی ہے۔ اور جس کام کے متعلق دل میں کھٹکا اور تردد ہو (کہ کروں یا نہ کروں؛ تو سمجھ جاؤ کہ) یہی گناہ ہے، چاہے فتویٰ دینے والے تمہیں فتویٰ دے دیں۔

وہی ”دل“ کہلانے کے لائق ہے

افادات:- جس چیز کے متعلق دل میں کھٹکا ہو؛ اس کام کو نہیں کرنا چاہیے، احتیاط کا تقاضہ یہی ہے۔ اسی لیے لکھا ہے کہ وہ آدمی جس کا دل گناہوں سے پاک ہو؛ وہی دل ”دل“ کہلانے کے لائق ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کسی آدمی نے مسلسل گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کر کے اپنا قلب ہی خراب کر لیا ہے، اور اب زنا کر کے بھی اس کو کھٹکا پیدا نہ ہو، اور وہ یوں کہے کہ مجھے تو کوئی کھٹکا پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی

بات کا اعتبار نہیں کیا جاتا، بلکہ وہاں تو یوں کہا جائے گا کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو چکی ہے، اور مسخ شدہ فطرت معیار قرار نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً: کسی کی ٹانگ ہی ٹیڑھی ہو تو سیدھا جوتا اس کے اندر نہیں آسکتا۔

احتیاطاً بیوی کو الگ کر دیا

۵۹۲:- وعن أبي سمر وعَةَ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّهُ تَزَوَّجَ ابْنَةً لِأَبِي إِهَابِ بْنِ عَزِيزٍ، فَأَتَتْهُ أَمْرَأَةٌ، فَقَالَتْ: إِنِّي قَدْ أَرْضَعْتُ عُقْبَةَ وَالْأَبِي قَدْ تَزَوَّجَ بِهَا. فَقَالَ لَهَا عُقْبَةُ: مَا أَعْلَمُ أَنَّكَ أَرْضَعْتِنِي وَلَا أُحْبِرْتِنِي، فَرَكِبَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ بِالْمَدِينَةِ، فَسَأَلَهُ: فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: كَيْفَ؟ وَقَدِ قِيلَ: فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهُ. (رواه البخاري) ((إِهَابُ)) بكسر الهمزة و ((عَزِيزُ)) بفتح العين وبزاي مكررة.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوسمر وعہ عقبہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو اہاب بن عزیز کی بیٹی (جویریہ) سے نکاح کیا۔ ایک سیاہ فام عورت آئی اور اس نے کہا: میں نے عقبہ کو بھی دودھ پلایا ہے، اور اس لڑکی کو بھی دودھ پلایا ہے جس کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہے (گویا اس عورت کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں اس لیے ان کا نکاح آپس میں نہیں ہو سکتا) تو اس پر حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: مجھے معلوم نہیں ہے کہ تو نے مجھے دودھ پلایا ہو، اور اگر پلایا تھا تو میں جو ان اور بڑا ہو گیا، آج تک تم نے مجھے اطلاع اور خبر کیوں نہیں دی؟ (گویا ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تیری اس خبر میں مجھے شک ہے، اس لیے وہ قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن بہر حال! یہ ایک اہم بات تھی، چوں کہ حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ میں رہتے تھے اس لیے باقاعدہ یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی پر ایک عنوان قائم کیا ہے: ”بَابُ الرَّحْلَةِ فِي الْمَسْئَلَةِ النَّازِلَةِ“ کوئی مسئلہ پیش آئے اس کو دریافت کرنے کے لیے مستقل سفر کرنا۔ ہمارے اکابر اور اسلاف کا یہی حال تھا۔ اتنا سا ایک مسئلہ پوچھنے کے لیے اُس زمانہ میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں۔ آج کل تو ایکسپریس ہائی وے اور ”A.C“ بسیں چلتی ہیں، پھر بھی ہم ایسا اہتمام نہیں کرتے (تو یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”كَيْفَ؟ وَقَدْ قَبِلَ“ تم اس کو اپنے نکاح میں کیسے باقی رکھ سکتے ہو، جبکہ یہ بات کہی گئی؟ (یعنی اگرچہ آج تک تمہیں اس کی اطلاع نہیں ہوئی اور نہ اس نے تم کو بتلایا، اور نہ تمہیں معلوم ہے؛ لیکن جب اس کی زبان سے یہ بات نکلی ہے، تو اب ظاہر ہے کہ ایک کھٹکے والی چیز ہوگئی، اس لیے احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس عورت کو نکاح میں باقی نہ رکھا جائے۔ آپ نے جدائی کے لیے صاف طور پر نہیں کہا۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے جدائی کے لیے فرمایا) چنانچہ حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عورت سے جدائی اختیار کر لی اور اپنے نکاح سے نکال دیا اور اس عورت نے دوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کر لیا۔

ایک مسئلہ

افادات:- ویسے فقہاء کے یہاں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ اگر کوئی ایک عورت کسی کے متعلق دودھ پلانے کی اطلاع دے تو صرف اس کی اطلاع سے دودھ پلانے کا مسئلہ ثابت ہوگا یا نہیں؟ ہم اس وقت اس سے بحث نہیں کرتے، لیکن یہاں پر اکثر حضرات علماء یہی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس سے بچنے کی جو تاکید فرمائی تھی وہ ورع کے طور پر تھی۔ یعنی اس کا احتمال ہے کہ واقعی

اس نے دودھ پلایا ہو۔ اور جب اس کی بات سچی ہو تو ان کے لیے اس سے نکاح کرنا حرام ہے۔ تو صرف حرام کے ڈر سے بھی آدمی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو بچائے۔

شک والی چیز چھوڑ کر.....

۵۹۳:- وعن الحسن بن علی رضی اللہ عنہما قال: حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ:

دَعَّ مَا يَرِيْبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيْبُكَ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

معنا: اِتْرُكْ مَا تَشْكُ فِيهِ، وَخُذْ مَا لَا تَشْكُ فِيهِ.

ترجمہ:- حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی

زبان سے سن کر یہ کلمہ اور جملہ یاد کر لیا ہے: ”دَعَّ مَا يَرِيْبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيْبُكَ“، یعنی شک والی چیز کو چھوڑ کر بغیر شک کی چیز کو اختیار کرو۔

افادات:- کسی معاملہ میں شک و تردد ہو، تو تردد والی چیز کو چھوڑ دو۔ آدمی

کو بلا تردد والی چیز کو اختیار کرنی چاہیے؛ ورع کا خلاصہ یہی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ

۵۹۴:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ لِأَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ غُلَامٌ

يُخْرِجُ لَهُ الْخَرَاجَ، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خَرَاجِهِ، فَبَجَاءَ يَوْمًا بِشَىْءٍ، فَأَكَلَ مِنْهُ

أَبُو بَكْرٍ فَقَالَ لَهُ الْغُلَامُ: تَدْرِي مَا هَذَا؟ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: وَمَا هُوَ؟ قَالَ: كُنْتُ

تَكْتَهِنُكَ لِإِنْسَانٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَمَا أَحْسِنُ الْكَهَانَةَ، إِلَّا أَنِّي خَدَعْتُهُ، فَلَقِيَنِي،

فَأَعْطَانِي لِذَلِكَ هَذَا الَّذِي أَكَلْتُمْ مِنْهُ، فَأَدْخَلَ أَبُو بَكْرٍ يَدَهُ، فَقَاءَ كُلَّ شَيْءٍ فِي

بَطْنِهِ. (رواه البخاری)

((الْخَرَاجُ)): شَيْءٌ يَجْعَلُهُ السَّيِّدُ عَلَى عَبْدِهِ يُؤَدِّيهِ كُلَّ يَوْمٍ، وَبَاقِي كَسْبِهِ يَكُونُ لِلْعَبْدِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک غلام تھا جس کو انہوں نے خراج پر اٹھا رکھا تھا، اس کا خراج استعمال کرتے تھے۔ (غلام سے کہہ دیا تھا کہ تم کماتے رہو اور اس میں سے مجھے اتنا حصہ دے دینا۔ وہ جو لاتا تھا اس کو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے استعمال میں لاتے تھے) ایک دن وہ غلام کھانے کی کوئی چیز لے کر آیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو کھالیا (مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابھی ایک ہی لقمہ کھایا تھا کہ) اس غلام نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ (دوسری روایتوں میں یہ بھی ہے کہ غلام نے کہا: آپ تو روزانہ پوچھتے ہیں کہ کہاں سے لایا، اور آج آپ نے نہیں پوچھا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فاقہ تھا اور طبیعت میں کھانے کا تقاضہ تھا اس لیے نہیں پوچھا اور ایک لقمہ منہ میں ڈال لیا) تو فرمایا: اچھا! اب بتا دے کہ کہاں سے لایا ہے؟ اس نے کہا: اسلام لانے سے پہلے زمانہ جاہلیت میں میں نے ایک آدمی کے لیے کہانت کی تھی (کہانت یعنی غیب کی خبریں دینا اور مستقبل کے متعلق بتلانا۔ اُس زمانہ میں عرب میں اس کا بڑا رواج تھا، کاہن اور جوتھی ہوا کرتے تھے جو لوگوں کو بتلایا کرتے تھے کہ تمہارا یوں ہوگا اور فلاں ہوگا۔ تو اس نے کہا کہ اس وقت میرے پاس ایک آدمی آیا تھا اور اسی کے متعلق میں نے کہانت کی ایک بات کہی تھی) حالانکہ میں کہانت جانتا بھی نہیں تھا (میں نے اس کو دھوکہ دیا تھا ”کر یا نیم چڑھا“ والی بات تھی، یعنی ایک تو کہانت خود غلط کام تھا اور اس میں بھی جانتا نہیں تھا، دھوکہ دیا تھا) آج میری اس کی ملاقات ہوئی تو میں نے جو کہانت کی تھی اس کی اجرت اور معاوضہ کے طور پر اس نے مجھے یہ کھانا دیا تھا جو آپ نے کھایا (حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے منہ میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ پیٹ میں تھا وہ سب قے کر ڈالا۔

.....تو بھی نکال کر رہتا

افادات:- مسند احمد کی روایت میں ہے کہ وہ ایک لقمہ تھا، قے کرنے کے واسطے انگلی ڈالی تو قے نہیں ہوئی، کسی نے کہا کہ ایک ہی لقمہ کھایا ہے، کیسے نکلے گا، ایسا کیجئے کہ آپ پانی پی کر قے کریں تو پانی کے ساتھ وہ لقمہ بھی نکل آئے گا۔ چناں چہ ایک بڑا پیالہ پانی کا بھر کر منگوا یا، اس کو پیا اور پھر قے کی تو بڑی مشکل سے وہ لقمہ باہر آیا۔ اس پر کسی نے کہا کہ ایک ہی تو لقمہ تھا، آپ نے اس کے لیے اتنی زیادہ زحمت اور تکلیف کیوں اٹھائی؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا: اگر وہ میری جان کے ساتھ نکلتا تب بھی میں اس کو نکال کر رہتا، کیوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ وہ گوشت جو حرام غذا سے تیار ہوا ہو، جہنم کی آگ کا زیادہ حق دار ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ حرام غذا سے پل کر تیار ہو۔

خراج کا مطلب یہ ہے کہ اُس زمانہ میں لوگوں کے پاس کئی کئی غلام ہوتے تھے، اپنے کام اور خدمت کے واسطے تو ایک دوکانی ہو جاتے تھے، باقی کو آقا اجازت دے دیتا تھا کہ تم کو جو ہنر اور کام آتا ہے، وہ کرتے رہو، اور تمہاری کمائی میں سے اتنا ہم کو دے دیا کرنا، بقیہ سب تمہارا ہوگا۔ تو جو مقدار آقا اپنے لینے کے لیے مقرر کرتا تھا اس کو ”خراج“ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

بیٹے کو دوسروں سے کم دیا

۵۹۵:- وعن نافع أن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ كان فرَضَ لِلْمُهَاجِرِينَ الْأَوْلِيَيْنِ أَرْبَعَةَ الْأَفِيفِ وَفَرَضَ لِابْنِهِ ثَلَاثَةَ أَلْفٍ وَخَمْسَمِئَةٍ، فَقِيلَ لَهُ: هُوَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ فَلِمَ نَقَصْتَهُ؟ فَقَالَ: إِنَّمَا هَاجَرَ بِهِ أَبُوهُ. يَقُولُ: لَيْسَ هُوَ كَمَنْ هَاجَرَ

بِنَفْسِهِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں بیت المال میں سے جو وظیفہ مقرر کیے تھے، تو مہاجرین اولین کے لیے وظیفہ کے طور پر چار ہزار (۴۰۰۰) درہم سالانہ مقرر کیے تھے؛ لیکن اپنے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے لیے۔ جو اپنے باپ کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے اور وہ بھی مہاجرین اولین میں سے تھے ان کے لیے۔ بجائے چار ہزار (۴۰۰۰) کے ساڑھے تین ہزار (۳۵۰۰) مقرر کیے۔ کسی نے پوچھا: یہ بھی تو مہاجرین اولین میں سے ہیں، آپ کا بیٹا ہوا تو کیا ہوا؟ ان کے لیے بھی تو چار ہزار مقرر کیجئے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: (اس وقت عبداللہ چھوٹے تھے، اور) ان کو ان کے باپ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

افادات:- گویا یوں سمجھئے کہ اصل ہجرت تو ان کے باپ نے کی تھی اور ان کے باپ ان کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کی ہجرت کے اندر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عملی طور پر گویا کچھ نقص محسوس کیا، یعنی وہ مکمل طور پر اپنے ارادہ سے نہیں، بلکہ اپنے باپ کے تابع بن کر آئے تھے۔ جو آدمی مستقل بالارادہ ہوتا ہے، اور اپنے ارادہ و فیصلہ سے جو کام کرتا ہے اس کا معاملہ اور جو اپنے باپ کے فیصلہ و ارادہ سے کرتا ہے، ان دونوں میں کچھ نہ کچھ فرق تو ہوتا ہی ہے۔ گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جو آدمی خود اپنے ارادہ و فیصلہ سے ہجرت کر کے آیا، یہ اگرچہ اسی زمانہ میں ہجرت کر کے آئے تھے؛ لیکن پھر بھی دونوں میں کچھ تو فرق ہے۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹا ہونے کی وجہ سے جو معاملہ کیا وہ احتیاط ہی کی وجہ سے تھا۔

نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تقسیم کرنے کے لیے چادریں آئیں۔

آپ نے ہر ایک کو ایک ایک چادر دی۔ بعد میں کسی وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ دینے کے لیے منبر پر کھڑے ہوئے تو ان کے جسم پر اسی طرح کی دو چادریں تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: «سَمِعُوا وَأَطِيعُوا» سنو اور کہنا مانو، تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا: «لَا تَسْمَعُ وَلَا طَاعَةَ يَا عُمَرُ» ہم نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے۔ پوچھا: کیوں بھائی؟ اس نے کہا: وہ جو چادریں آئی تھیں ان میں سے آپ نے سب کو ایک ایک تقسیم کی، اور آپ کے جسم پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ دو چادریں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے انصاف سے کام نہیں لیا، تو پھر کیسے آپ کی بات سنی اور مانی جائے۔ اسی مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے کہا: اٹھو اور ان کو جو اب دو۔ وہ کھڑے ہوئے اور کہا: میرے حصہ میں جو چادر آئی تھی وہ میں نے اپنے ابا کو دی ہے، پھر اس آدمی نے کہا: اب ہم آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔ (سیرت ابن الخطاب: ۱۶۷)

کوئی متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا.....

۵۹۶:- وعن عَطِيَّةِ بْنِ عُرْوَةَ النَّسَبِيِّ الصَّحَابِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا يَتَّبِعُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَا لَبَّأَسَ بِهِ، حَذَّرَ أَهْلَهُ بِأَسِّ بَأْسٍ. (رواه الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عطیہ بن عروہ سعدي رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ ایسی چیز کو جس کے اندر کوئی خطرہ اور حرج نہیں ہے محض اس ڈر سے چھوڑ دے کہ اس کے کرنے کی وجہ سے حرج والی کسی چیز میں مبتلا ہونا لازم آئے گا۔

لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں

افادات:- حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے کوئی آدمی اچھی آواز سے کچھ اشعار پڑھ رہا تھا تو انہوں نے اس کو منع کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! کیوں نہیں سنتے؟ حضرت نے فرمایا: لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں، اور بلا مزامیر یعنی گانے بجانے کے آلات کے بغیر صرف اچھی آواز والے اشعار کو بھی بعض علماء نے منع کیا ہے۔ حضرت مستقل امام نہیں تھے، بلکہ کبھی کبھی لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے، اس لیے انہوں نے اس کو سننا گوارا نہیں کیا۔ لوگوں کی نمازوں کو بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے

اسْتَحْبَابِ الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ
النَّاسِ وَالزَّمَانِ أَوِ الْخَوْفِ مِنْ
فِتْنَةٍ فِي الدِّينِ وَوُقُوعِ فِي حَرَامٍ
وَشُبُهَاتٍ وَمُحْوَاهَا

خلوت گزینی کا مستحب ہونا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زندگی گزارنے کے دو طریقے

زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں، دونوں متضاد اور الگ الگ ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان، رشتہ داروں، پڑوسیوں، دوستوں میں، معاشرہ اور سماج میں رہ کر سب کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے۔ اور دوسرا طریقہ عزت کا ہے یعنی آدمی گوشہ نشینی اختیار کرے، سماج اور سوسائٹی سے الگ تھلگ ایسی جگہ جہاں کسی سے کوئی واسطہ نہ پڑتا ہو، لین دین کی اور کوئی معاملہ کرنے کی نوبت نہ آئے، جس کو گوشہ نشینی کی زندگی کہا جاتا ہے اس طرح زندگی گزارے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں

اسلام نے رہبانیت کی اجازت نہیں دی ہے۔ رہبانیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی لوگوں سے کٹ کر پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مشقت اٹھا کر تن تنہا رہے، جس کو ”برہم چریہ“ کہا جاتا ہے۔ اسلام آنے سے پہلے بنو اسرائیل کے اندر بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے تھے جس کے متعلق قرآن پاک میں ہے: **وَرَهْبَانِيَّةٍ ابْتَدَعُوا مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيَّهِمْ** **اِلَّا اَنْبِيَاً رَضُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَمَا رَعَوْهَا حَقًّا رِعَايَتَهُ** (الحديد) یہ رہبانیت؛ جسے انہوں نے ایجاد کیا ہے، (باری تعالیٰ فرماتے ہیں) ہم نے ان کے اوپر یہ طریقہ لازم نہیں کیا تھا، بلکہ یہ چیز انہوں نے اپنے طور پر یہ سمجھتے ہوئے ایجاد کی کہ یہ طریقہ اختیار کر کے ہم اللہ تعالیٰ کو راضی اور خوش کر لیں گے۔ پھر اس کا جو اہتمام ہونا چاہیے اور اس کی جو رعایت کی جانی چاہیے، اس کے حقوق و حدود کو جس طرح بجالانا چاہیے اس کو بجا نہیں

لا سکے۔ اس لیے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم نہیں کی گئی تھی، بلکہ انہوں نے اپنے طور پر اختیار کی تھی، اس کا یہی نتیجہ ہونا تھا۔

بہر حال! اسلام رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو سماج ہی میں بھیجا، جہاں لوگوں کا اجتماعی گروہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے، انہی میں آ کر وہ کام کرتے ہیں، اور انسان فطری طور پر بھی ایسا ہی بنایا گیا ہے کہ وہ لوگوں میں رہ کر زندگی گزارے، اور پیدائشی طور پر بھی وہ اپنے ساتھ کچھ تعلقات اور رشتہ داریاں لے کر دنیا میں آتا ہے، اس لیے اصل تو یہ ہے کہ آدمی سماج اور سوسائٹی میں رہ کر زندگی گزارے، چنانچہ حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ آدمی جو لوگوں کے اندر مل جل کر رہتا ہے، اور ان کی طرف سے پہنچائی جانے والی ایذاؤں اور تکلیفوں پر صبر سے کام لیتا ہے، وہ اس سے بہتر ہے جو الگ تھلگ رہتا ہے اور ان کی ایذاؤں اور سزاؤں پر صبر نہیں کرتا۔ (ترمذی: ۲۵۰۷، باب [مخالطہ المسلم للناس] / سنن ابن ماجہ: ۴۰۳۲، کتاب القس)

فتنہ کی حالت

اور جہاں لوگ مل کر زندگی گزارتے ہیں وہاں دو طرح کے حالات ہوتے ہیں، ایک تو فتنہ کی حالت ہوتی ہے کہ مثلاً فتنہ اتنا عام ہو گیا کہ آدمی کو اپنے آپ کو گناہوں اور ان کی طرف لے جانے والے اسباب و وسائل سے بچانا مشکل ہو گیا، تو ایسے فتنہ و آزمائش کے زمانہ میں عزلت، گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرنے کو ترجیح دی گئی ہے، اور اسی کو پسند کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اگر لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں آدمی کو اپنے دین کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو کہ ان کی طرف سے جو حالات پیش آئیں گے ان پر صبر نہیں کر سکے گا اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی، اور ہو سکتا ہے کہ ان پر زیادتی ہو جائے، ان کے حقوق تلف ہوں، غیبت اور بہتان تراشی میں

ابتلاء کی نوبت آئے، اپنا حال و مزاج دیکھ کر اور لوگوں کے حالات دیکھ کر اس کو یہ غالب گمان ہے، اور اپنے دین کے اندر فتنہ، نقصان اور حرام یا شبہات میں پڑنے کا اندیشہ اور گمان غالب ہے؛ تو گوشہ نشینی پسندیدہ، مستحب اور مطلوب ہے، اس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ اس صورت میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے آدمی پر ضروری ہے کہ اختلاط اور لوگوں کے ساتھ میل جول اختیار نہ کرے۔

گوشہ نشینی مستحب ہونے کی تین شکلیں

اور اگر عام حالات ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط، سماج اور سوسائٹی میں رہنے کی صورت میں دین کے متعلق کسی نقصان، یا حرام میں پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے؛ تو کون سی صورت بہتر ہے؟ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا یا گوشہ نشینی و تنہائی اختیار کرنا؟ تو اس سلسلہ میں علماء کی دورائیں ہیں۔ چنانچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں اسی کو بیان فرماتے ہیں:

[۱]:- "إِسْتِحْبَابُ الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ" اگر زمانہ

والوں میں بگاڑ آ گیا ہو تو تنہائی اور گوشہ نشینی مستحب ہے۔

[۲]:- "أَوْ الْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّينِ" یا اپنے دین میں کسی نقصان یا کسی

فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو، تو اس صورت میں بھی تنہائی مستحب ہے۔

[۳]:- "وَوُقُوعِ فِي حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَنَجْوَاهَا" یا سماج اور معاشرہ میں زندگی

گزارنے کی صورت میں ڈر ہے کہ ہم حرام کاموں میں مبتلا ہو جائیں گے، کسی بھی طرح کا حرام ہو، صرف زنا کاری اور شراب نوشی ہی نہیں؛ بلکہ لوگوں کے حقوق ضائع ہونے، لوگوں پر بہتان تراشی، غیبت بازی ان کے متعلق بدگمانیوں میں مبتلا ہونے کا احتمال اور

ظن غالب ہو؛ تو اس صورت میں بھی گوشہ نشینی اور تنہائی مستحب ہے۔

اللہ کی طرف دوڑ لگاؤ

اس سلسلہ میں انہوں نے ایک تو عام آیت سے استدلال کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَقَرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑ لگاؤ، یعنی سب سے ہٹ کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا: آپ کہیے کہ میں تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے کھلم کھلا ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔ اسی سلسلہ میں کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔ اور آگے جو باب لائیں گے اس میں عام حالات میں کیا چیز پسندیدہ ہے، اس کو بتلائیں گے۔

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گوشہ نشینی

۵۹۷:- عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ

ﷺ: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: بیشک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے، اور اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو پاک صاف ہو، غنائی قلبی کی دولت سے مالا مال ہو، اور لوگوں سے مخفی اور گمنام رہتا ہو۔

افادات:- یہاں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے صرف وہی الفاظ پیش کئے ہیں جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں، لیکن صاحب الترغیب والترہیب نے مسلم شریف ہی کے حوالہ سے اس میں اضافہ فرمایا ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جب اختلاف چل رہا تھا اور ان میں آپس میں جنگ جاری تھی، اس زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے

اونٹوں اور بکریوں کو لے کر جنگل میں چلے گئے، اور وہاں یکسوئی اور گوشہ نشینی کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کیا (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) اسی زمانہ میں ان کے بیٹے عمر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس ان کو سمجھانے کے لیے گئے، وہ اپنی سواری پر سوار آ رہے تھے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب ان کو دور سے آتا ہوا دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: "اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ هَذَا الرَّكِبِ" اے اللہ! اس سواری کی برائی سے میں پناہ چاہتا ہوں۔ جب وہ ان کے قریب آئے تو کہنے لگے: ابا جان! لوگ تو وہاں قتل ہو رہے ہیں اور آپ اپنے اونٹوں کو لے کر یہاں آ گئے، لوگوں کی خبر کیوں نہیں لیتے؟ ان کے حال پر آپ توجہ کیوں نہیں کرتے؟ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا: چپ بھی رہو، میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: "ان الله يحب العبد التقي الغني الخفي" بیشک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے، اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو پاک صاف ہو، غننا قلبی کی دولت سے مالا مال ہو، اور لوگوں سے مخفی اور گمنام رہتا ہو۔ پھر فرمایا: اب جاؤ۔ یہ کہہ کر ان کو رخصت کر دیا، اور خود ساتھ نہیں گئے۔

(الترغيب والترهيب: ۲/۱۳۷/مسلم: ۷۶۲۱)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ منورہ سے باہر ہی اپنا ایک مکان بنا لیا تھا، وہیں رہتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو وہیں سے ان کا جنازہ لایا گیا، اور بقیع میں دفن کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فتنہ کے زمانہ میں یکسوئی حاصل کر کے اپنی دین کی حفاظت ضروری اور واجب ہو جاتی ہے۔ اس روایت کو لا کر یہی بتلانا چاہتے ہیں۔

اصحابِ کہف کا قصہ

اصحابِ کہف کا قصہ جو بنی اسرائیل کے زمانہ میں پیش آیا تھا اس کو قرآن کریم

نے بیان کیا ہے اس میں اسی چیز کو بتلایا گیا ہے۔ ایک بادشاہ تھا جس کا نام دقیانوس تھا، بت پرست اور بڑا سخت گیر تھا، لوگوں کو بت پرستی کے لیے آمادہ کیا کرتا تھا، لوگ اس کی سختی کی وجہ سے یا پھر لالچ میں آ کر بت پرستی اختیار کر لیتے تھے۔ ان حالات میں چند نوجوان جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی وہ اپنے ایمان پر ہی قائم رہے، بادشاہ نے ان کو بلایا، انہوں نے برسرِ دربار بادشاہ کو ایمان کی دعوت دی اور اس کی بت پرستی پر اس کو ٹوکا۔ وہ ظالم تو تھا ہی، اسی وقت وہ انتقام لے سکتا تھا؛ لیکن اس نے ان کو مہلت دی کہ چند دن غور کر لو۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں تو اپنے ایمان پر قائم رہنا ہے۔ اس نے مہلت دی ہے تو ظاہر ہے کہ بعد میں بھی بت پرستی کے واسطے ہمیں مجبور کرے گا، اگر ہم اپنے ایمان کی حفاظت چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس بستی کو چھوڑ دیں۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر ایک کھوہ میں چلے گئے، وہیں چھپ گئے اور وہیں پناہ حاصل کر لی اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی: ﴿رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا﴾ اے اللہ! اپنی طرف سے ہمارے لیے رحمت کا فیصلہ فرما اور ہمارا معاملہ آسان کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کر دی، پھر کئی سالوں کے بعد جب اٹھے اور باہر نکلے تو حکومت بدل چکی تھی، اور بادشاہ ایمان والا تھا۔

سب سے بہتر کون؟

۵۹۸:- وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَيْمَنُ النَّاسِ أَفْضَلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: مُؤْمِنٌ مَجَاهِدٌ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ رَجُلٌ مُعْتَزِلٌ فِي شَعْبٍ مِنَ الشَّعَابِ يَعْبُدُ رَبَّهُ.

وفی روایة: يَتَّقِي اللَّهَ، وَيَدْعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ایک

آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون سا آدمی سب سے اچھا اور بہتر ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: وہ مسلمان جو اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہو۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ آدمی جو کسی گھائی کے اندر یکسوئی اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائے۔

اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہو، گناہوں سے بچتا ہو، اور لوگوں کو اپنے شر سے بچاتا ہو۔ (یعنی لوگوں میں رہنے کی صورت میں یہ ڈر ہے کہ میرے شر سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی، اس لیے یکسوئی اور تنہائی اختیار کرتا ہو۔)

وہ زمانہ قریب ہے

۵۹۹:- وعنه قال قال رسول الله ﷺ: يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتَّبِعُ بِهَا شَعْفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفْرُبُ بَدِينَهُ مِنَ الْفِتَنِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال کچھ بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور جہاں بارش گرا کرتی ہے ایسے علاقوں میں چلا جائے، اور وہ آدمی اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے ایسا کرے گا۔

ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں

۶۰۰:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: مَا بَعَثَ اللَّهُ نَبِيًّا إِلَّا رَاعَى الْغَنَمَ. فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ قَالَ: نَعَمْ، كُنْتُ أُرْعَاهَا عَلَى قَرَارِ يَطْلُؤُهَا لِأَهْلِ مَكَّةَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس نے بکریاں چرائی ہیں۔ صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بھی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں! میں بھی مکہ والوں کی بکریاں چند سکوں کے بدلہ چرایا کرتا تھا۔

بہترین زندگی

۶۰۱:- وعنه عن رسول الله ﷺ أَنَّهُ قَالَ: مِنْ خَيْرِ مَعَاشِ النَّاسِ لَهُمْ رَجُلٌ مُهِسِكٌ عِنَانَ فَرَسِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، يَطِيرُ عَلَى مَتْنِهِ كُلَّمَا سَمِعَ هَيْعَةً أَوْ فَرَعَةً، طَارَ عَلَيْهِ يَدْبِغِي الْقَتْلَ، أَوْ الْمَوْتَ مَظَانَّهُ، أَوْ رَجُلٌ فِي غُنَيْمَةٍ فِي رَأْسِ شَعْفَةٍ مِنْ هَذِهِ الشَّعَفِ، أَوْ بَطْنٍ وَادٍ مِنْ هَذِهِ الْأَوْدِيَةِ، يُقِيمُ الصَّلَاةَ، وَيُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَيَعْبُدُ رَبَّهُ حَتَّى يَأْتِيَهُ الْيَقِينُ، لَيْسَ مِنَ النَّاسِ إِلَّا فِي خَيْرٍ. (رواه مسلم)

(يَطِيرُ): اُٹتی بے سُرْع. وَ (مَتْنُهُ): ظہرُہ. وَ (الْهَيْعَةُ): الصوتُ للحرب. وَ (الْفَرَعَةُ): نحوه. وَ (مَظَانُّ الشَّيْءِ): المواضع الَّتِي يُظَنُّ وجودُهُ فِيهَا. وَ (الْغُنَيْمَةُ) بضم الغين: تصغير الغنم. وَ (الشَّعْفَةُ) بفتح الشين والعين: هي أعلى الجبل.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے

ارشاد فرمایا: لوگوں میں بہترین زندگی والا وہ آدمی ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے اس کی پیٹھ پر سوار اڑا چلا جاتا ہو۔ جہاں کہیں دشمن کے ہتھیار یا گھبراہٹ کی آواز سنتا ہے اور دشمن کی طرف سے خطرے کی کوئی بات دیکھتا ہے؛ تو دوڑا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہے، اور اپنی جان قربان کرنے کی کوشش کرتا ہے، گویا مقابلہ کی حالت میں موت کو تلاش کرتا ہے۔ یا وہ آدمی جو اپنی چند بکریاں لے کر پہاڑ کی چوٹیوں میں سے کسی چوٹی پر یا کسی وادی میں جا کر رہتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے۔ اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا اور بھلائی پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ (خلاصہ یہ ہوا کہ فتنہ کے زمانہ میں اگر اپنے دین کے متعلق خطرہ ہو تو یکسوئی کو ترجیح دی گئی ہے۔)

بَابُ فَضْلِ الْإِخْتِلَاطِ

بِالنَّاسِ

لوگوں سے اختلاط کی شرائط

اب وہ زمانہ آیا کہ نہیں؟ تو اس سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا باب قائم کیا ہے جس میں انہوں نے کوئی روایت پیش نہیں کی ہے، بلکہ علماء کا جو نظریہ ہے صرف اسی کو پیش کیا ہے۔ فتنہ کے بارے میں تو انہوں نے اوپر باب قائم کر کے بتلا دیا کہ فتنہ کے زمانہ میں جب کہ آدمی کو سماج میں رہ کر اپنے دین کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو عزلت نشینی مستحب ہے، اور اگر دین کے فساد کا یقین ہو تو عزلت نشینی واجب ہے، لیکن عزلت نشینی کے لیے بھی باقاعدہ شرائط ہیں، ان تمام شرائط کا اہتمام کرتے ہوئے عزلت نشینی اختیار کرے۔

اور عام حالات میں کیا مناسب ہے؟ لوگوں کے ساتھ خلط ملط کر کے رہنا، یا عزلت نشینی؟ چنانچہ باب قائم کیا ہے: **بَابُ فَضْلِ الْإِخْتِلَافِ بِالْثَّلَاثِ، وَحُضُورِ جُمُعِهِمْ وَجَمَاعَاتِهِمْ، وَمَشَاهِدِ الْخَيْرِ، وَجَالِسِ الذِّكْرِ مَعَهُمْ، وَعَيَادَةِ مَرِيضِهِمْ، وَحُضُورِ جَنَائِزِهِمْ، وَمَوَاسَاةِ مُخْتَلَجِهِمْ، وَإِرْشَادِ جَاهِلِيهِمْ، وَغَيْرِ ذَلِكَ مِنْ مَّصَالِحِهِمْ لِمَنْ قَدَرَ عَلَى الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَقَتَمَحِ نَفْسَهُ عَنِ الْإِيذَاءِ وَصَبَرَ عَلَى الْأَذَى.** ”لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی فضیلت، جمعہ و جماعتوں کی حاضری، نیکی کے موقعوں پر حاضری، ذکر کی مجلسوں کی حاضری، مریضوں کی خبر پرسی، جنازوں کی حاضری، محتاجوں کی خیر خواہی، نادانوں کی رہنمائی، اس کے علاوہ دوسری مصلحتیں ہیں۔ یعنی سماج اور سوسائٹی میں رہ کر آدمی کو یہ سارے فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن یہ اس کے لیے ہے جو امر المعروف اور نہی عن المنکر کی قدرت رکھتا ہو، بھسلی بات کا حکم کرنے اور بری بات سے منع کرنے پر قادر ہو، لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہو، یعنی اپنے آپ پر اتنا کنٹرول ہو کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور لوگوں کی طرف سے جو تکلیف پہنچے، اس پر صبر سے کام لیتا ہو، تو اس

صورت میں لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا پسندیدہ ہے۔

پھر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: «إِعْلَمُوا أَنَّ الْإِحْتِلَاطَ بِالذَّائِبِ عَلَى الْوَجْهِ الَّذِي ذَكَرْتُمْ لَهُهُ الْمُخْتَارُ» ان تمام شرائط کے ساتھ سماج اور سوسائٹی میں رہے جو اوپر بتلائے گئے (کہ وہ سارے فوائد ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام ہو، اور اپنے آپ کو لوگوں کی ایذا رسانیوں سے بچاتا ہو، اور لوگوں کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتا ہو) تب ہی پسندیدہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایسی ہی گزری ہے، اور تمام انبیاء علیہم السلام، خلفاء راشدین کا بھی یہی طریقہ رہا ہے، ان کے بعد صحابہ، تابعین، علماء مسلمین اور خیار امت کا بھی یہی طریقہ رہا ہے، اور یہی اکثر تابعین اور ان کے بعد والوں کا مذہب ہے، امام شافعی، امام احمد اور اکثر فقہاء یہی فرماتے ہیں۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ﴾ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو۔ یہ عام حالات میں ہے۔

کیا وہ زمانہ آگیا؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ساتویں صدی کے ہیں، ان کے سوسال بعد علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ شارح بخاری آئے جو آٹھویں صدی کے بڑے عالم ہیں، وہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی ان ساری باتوں کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ہمارے زمانہ میں خلط ملط کر کے رہنے کے مقابلہ میں گوشہ نشینی افضل ہے۔ ان کے ستر سال بعد شارح بخاری علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ آئے، وہ بھی فرماتے ہیں کہ میں علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید کرتا ہوں، ہمارے زمانہ میں خرابیاں اور بڑھ گئی ہیں۔ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ ان تمام حضرات کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: یہ سب باتیں تو نویں صدی تک کی تھیں،

اب تو چودھویں صدی پوری اور پندرہویں صدی شروع ہو گئی، اب حالات میں جتنا بڑا انقلاب آ گیا ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی صاحب علم، صاحب تقویٰ، دیندار آدمی لوگوں میں بہ شرائط مذکورہ بالا رہے، تو آج بھی اس کے لیے لوگوں میں مل جل کر رہنا مفید ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو جیسا کہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی مجالس عام طور پر گناہوں سے خالی رہیں ہی نہیں، اس لیے دینی مجالس کو چھوڑ کر دوسری تمام مجالس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے، الا یہ کہ وہاں جانے سے کسی کو دینی نفع پہنچنے کی امید ہو، تو اس صورت میں اس کی اجازت ہے۔

ماحتوتوں کو نہ بخشے

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے اس موضوع پر تفصیل سے کلام فرماتے ہوئے ایک خاص نصیحت فرمائی ہے کہ ایک بات یاد رہے، جہاں آپ کسی منکر سے روکنے کی طاقت رکھتے ہوں تو اسے روکنے میں کبھی دریغ نہ کرنا، پیچھے نہ ہٹنا، کمزوری نہ دکھلانا، خاص کر اپنے ماتحتوں (بیوی، اولاد، نوکر) کے معاملہ میں آدمی کو چاہیے کہ ذرہ برابر بھی کمزوری نہ دکھلائے، اور منکرات و برائیوں سے ان کو روکنے کا اہتمام کرے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ كَمَا بَدَأَ بِهِ، فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ. فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ** (او کما قال علیہ والسلام) تم میں سے جو آدمی کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو روکے، اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو دل سے اس کو برا سمجھے۔ پھر فرمایا: یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ اور بعض روایتوں میں ہے: **وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ** اس کے بعد ایمان کا درجہ ہے ہی نہیں۔ کم سے

کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دل سے برا سمجھے۔

احقاقِ حق یا تذلیل؟

اس کے بعد حضرت شیخ رحمہ اللہ نے دوسری بات ارشاد فرمائی کہ جہاں برائیوں سے روکنے میں فتنہ کا قوی اندیشہ ہو، وہاں فتنہ جگانے کی کوشش نہ کی جائے۔ دونوں کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بہت سی مرتبہ آدمی اعلانِ حق اور احقاقِ حق کے نام سے کسی کو لوگوں کے سامنے رسوا کرنے، یا نیچا دکھلانے کے لیے کہتا ہے کہ: تم یوں کر رہے ہو۔ اور دوسری طرف جو اپنے ماتحت؛ اپنا بیٹا، اپنی بیوی وغیرہ برائیوں میں مبتلا ہیں، لیکن محض محبت و تعلق کی وجہ سے ان کو روک ٹوک نہیں کر رہا ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ جو آپ کے ماتحت ہیں ان کو روکو، ان کے معاملہ میں کوئی رکاوٹ ہی نہیں ہے۔ ان کی طرف سے تجارت میں اگر کوئی مالی نقصان ہوتا ہے، آپ کی فیکٹری، دکان میں وہ کوئی گڑبڑ کر دیتے ہیں تو کیا آپ اس کو برداشت کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ گالی دیں گے، برا بھلا کہیں گے، پٹائی کریں گے، آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو سب کچھ کرتے ہیں، اور اسی بیٹے، اسی ماں اور بیوی کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کر رہے ہیں، نماز نہیں پڑھتے، گناہوں میں مبتلا ہیں؛ لیکن وہاں کچھ نہیں کہتے۔ یہ ان کے ساتھ بدخواہی اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اس لیے کہ آدمی جہاں برائی سے روکنے پر قدرت رکھتا ہو، اس کے باوجود نہ روکے، تو اللہ تعالیٰ کا عام عذاب آئے گا، پھر اس سے نہ وہ بچ سکیں گے اور نہ یہ اپنے آپ کو بچا سکے گا۔ یہ اہم بات ہے، جس کو یاد رکھنا چاہیے۔

عذابِ الہی کو دعوت نہ دیں

خلاصہ یہ ہوا کہ دونوں حالتوں میں آدمی امتیاز کرے، اپنے ماتحتوں کے معاملہ میں کہ جہاں آدمی کو قدرت حاصل ہوتی ہے، وہاں ہاتھ سے روکنے کا اہتمام کرے، اور جہاں قدرت نہیں ہے، وہاں زبان سے ایسے انداز سے سمجھا دے جس سے کوئی فتنہ نہ ہو۔ اور اگر اس صورت میں بھی خطرہ ہو، تو پھر کم سے کم دل سے برا سمجھنے پر اکتفاء کرے، اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ اس صورت میں پھر چاہے کسی کی طرف سے کتنے ہی طعنے دیئے جاتے رہیں ان کو برداشت کرتا رہے، کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اس موقع پر خاص طور پر تاکید فرمائی ہے کہ اگر ہمت ہو تو ان کے لیے دعاء خیر بھی کرے۔ اس بات کو یاد رکھو، یہ بہت اہم چیز ہے۔ آدمی یہ نہ سمجھے کہ معاشرہ میں رہتے ہوئے میں برائیوں سے صرف نظر کر لوں، اس کی شریعت کسی حال میں اجازت نہیں دیتی۔ ہاں! یہ بات ٹھیک ہے کہ کسی اجنبی کو کہنے کی صورت میں اگر اندیشہ ہو تو آدمی نہ کہے، لیکن اپنے ہی لوگ گناہوں، بد عملیوں اور برائیوں میں مبتلا ہیں اور ان کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوتی، یہ بڑی خطرناک چیز ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے والی ہے۔

یہ آیت شبہ میں نہ ڈالے

حضرت شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ میں عمل کر رہا ہوں، یہ میرے لیے کافی ہے، چاہے بیوی بچے برائی کے اندر مبتلا ہوں۔ جیسے بعض حضرات اس سلسلہ میں یہ آیت پیش کرتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَعْلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ﴾

لَا يَصْرُكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ﴿۱﴾ اے ایمان والو! تم اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرو، کوئی آدمی گمراہ ہے تو وہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تم کو شبہ میں نہ ڈالے، اس سے مراد یہ نہیں ہے۔ جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہو جاتا ہے وہ اس میں داخل نہیں ہے، ہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد بھی وہ اگر اپنی اصلاح نہیں کرتا تو آپ بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی سے آدمی اپنے آپ کو روک لے۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اگر حالات ایسے آگئے تو آدمی اپنے متعلق غور و فکر کر کے اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے، جیسے حدیث پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِذَا رَأَيْتَ شُرْكَاً مُطَاعاً، وَهُوَ مُتَّبَعًا، وَدُنْيَا مُؤَثَّرَةً، وَإِنْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ، فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ، وَدَعِ الْعَوَاهِرَ (سنن ترمذی، باب: ومن سورة البائدة، حدیث رقم: ۳۰۵۸) جب تم دیکھو کہ بخل و حرص کی پیروی کی جا رہی ہے، خواہشاتِ نفس کے پیچھے لوگ دوڑ رہے ہیں، دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے، ہر ذی رائے اپنی رائے پر مست ہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے؛ تو ایسے موقع پر تم اپنے آپ کو سنبھال لو اور عوام کی طرف توجہ نہ دو۔ باقی یہ ہے کہ کسی بھی طریقہ سے، نرمی کے ساتھ، محبت کے ساتھ اگر آپ اپنی بات عوام تک پہنچا سکتے ہیں تو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح توفیق عطا فرمائے۔

التَّوَّاضِعُ وَخَفِضِ الْجَنَاحَ لِلْبُؤْمِنِينَ

تواضع اختیار کرنا

﴿ مجلس ۱ ﴾

۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۹ ستمبر ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مُحَمَّدًا وَنَسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْكَ وَنَعُوْذُ
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَحْمَالِنَا مِنْ يَّيِّدِ اللّٰهِ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ
 يُضِلُّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُوْ نَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدًا لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدِنَا
 وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا
 كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ:-

وَ اَخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

ساری خوبیوں کی جرٹ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے: تواضع اختیار کرنا اور ایمان والوں
 کے سامنے اپنے پہلو کو جھکانا۔

تواضع کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہی ساری نیکیوں
 اور خوبیوں کی جرٹ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا، اس لیے کہ تواضع کے مقابلہ میں تکبر ہے جو ساری
 خرابیوں اور برائیوں کی جرٹ ہے۔ شیطان جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مردود ہوا اس کی
 اصل وجہ یہی تھی کہ اس نے تکبر کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور
 فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو شیطان بھی ان کی جماعت میں تھا، اس
 لیے یہ بھی اس حکم میں داخل تھا، لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار کرتے ہوئے کہا
 کہ میں ان کو کیسے سجدہ کروں؟ ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ﴾ مجھے آپ نے
 آگ سے پیدا کیا ہے اور ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے، آگ اوپر اٹھنے والی چیز ہے، مٹی
 پستی میں رہنے والی چیز ہے، اس لیے مٹی کے مقابلہ میں آگ کو فضیلت حاصل ہے۔
 اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا شیطان نے انکار کیا، اور اپنی عقل چلائی۔ حالانکہ اصل تو یہ ہے

کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا تھا تو عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:۔

روزِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے * جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام اور شریعت کو عقل کی ترازو میں تولنا شروع کر دے گا تو پھر بات ہی ختم ہو جائے گی، پھر تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کے حکم کی بجا آوری نہیں ہوگی؛ بلکہ اپنی عقل پر چلنا ہوگا۔ اگر یہ سوچتا کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی خالق ہے اور اس کا بھی خالق ہے، وہ میری حقیقت سے بھی واقف ہے اور اس کی حقیقت سے بھی واقف ہے، اس کے باوجود جب اس نے حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو اس کو ماننا چاہیے، لیکن وہ اپنی عقلی دلیل لایا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حجت بازی کرنے لگا۔

حضرت آدم کا امتیازی وصف

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے مقابلہ میں بھی اور شیطان کے مقابلہ میں بھی جو فضیلت حاصل ہوئی، اس کی اصل بنیاد ان کی شانِ عبدیت، شانِ بندگی اور عجز و تواضع ہے، جو شانِ ایک بندے کی ہونی چاہیے وہی شان ان میں پائی گئی، یہی ایک چیز تھی جس نے ان کو سب کے ممت بلہ میں فوقیت دلوائی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اونچے مرتبہ پر پہنچایا۔

حضرت علامہ نور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ زمین کے اندر میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں، تو سیدھی سادی بات تو یہ ہے کہ آگے کچھ بولنے کی کچھ گنجائش ہی نہیں تھی، اس کے باوجود فرشتوں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿أَتَجْعَلُ

فِيهَا مَنْ يَفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ﴿﴾ باری تعالیٰ! آپ زمین کے اندر ایک ایسی شخصیت کو بھیج رہے ہیں جو زمین میں فتنہ اور فساد مچائے گی اور خون خرابہ کرے گی؟ ﴿وَمَنْحُنْ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ہم آپ کی تعریف اور پاکی کی بیان کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کی عبادت کرنے اور پاکیزگی کی بیان کرنے کے لیے کافی ہیں؛ پھر ان کی کیا ضرورت ہے؟ باری تعالیٰ نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا: ﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ میں جو چیزیں جانتا ہوں تم وہ نہیں جانتے، فرشتوں نے فوراً عرض کیا: ﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا بِالْمَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ آپ کی ذات پاک ہے، ہمیں کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے جو آپ نے ہمیں سکھایا، آپ بہت زیادہ جاننے والے حکمت والے ہیں۔ بہر حال! انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن ان کی طرف سے پہلے ایک بات تو پیش ہوئی۔ اس کے بعد جب سجدہ کے لیے کہا گیا تو فرشتے تو فوراً سجدہ ریز ہو گئے لیکن شیطان نے حکم نہیں مانا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، باری تعالیٰ کے سامنے حجت بھی کرنے لگا کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا، میں ان کو کیسے سجدہ کروں؟ حالاں کہ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کے عشق اور محبت کی ضرورت تھی۔

ایک ”ع“ کی کمی

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیطان میں تین عین تھے۔ بہت بڑا عابد تھا، بہت بڑا عارف تھا اور بہت بڑا عالم بھی تھا۔ اس کے علم کا کیا کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فرشتوں کا استاذ بنا دیا تھا، تبھی تو معلم المملکت کہلایا۔ عبادت کا یہ عالم کہ آسمان پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اور عارف یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کو پہچاننے والا بھی تھا، اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے پر جب اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی

بارگاہ سے مردود کیا تو اس نے ایک درخواست پیش کر دی کہ قیامت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے تک مجھے مہلت دی جائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی بارگاہ سے ہانکا تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض تھا، ایسی ناراضگی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کرنا اس کی معرفت ہی کی علامت ہے کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی۔ ہمارا تمہارا حال تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ابھی مجھ سے بات نہ کرنا، تمہاری کوئی درخواست منظور نہیں ہوگی چوں کہ اس وقت ایک خاص کیفیت ہے۔ لیکن شیطان جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کیفیت سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں، وہ تو حاکم ہے، اگر درخواست قابل قبول ہے، تو قبول ہو جائے گی، چاہے اس وقت اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ ہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں اس نے درخواست پیش کی اور اللہ تعالیٰ نے وہ منظور کر لی کہ جا! تجھے مہلت دی جاتی ہے جب تک کہ پہلا صور پھونکا جائے گا۔ اس نے ہوشیاری سے کام لیا تھا اور کہا تھا کہ دوبارہ جب پیدا کیے جائیں وہاں تک مہلت دی جائے، اس کا مقصد یہ تھا کہ پہلے صور پر سب ختم ہو جائیں گے اور دوسرے صور پر سب دوبارہ پیدا ہوں گے، تو دوبارہ پیدا ہونے تک جب مہلت مانگوں گا تو مجھ پر موت طاری نہیں ہوگی۔ وہ ہوشیاری کرنے گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کی ہوشیاری کہاں چل سکتی ہے؟ لہذا باری تعالیٰ نے کہا: تجھے مہلت تو دی جاتی ہے لیکن ایک مقررہ وقت یعنی پہلے صور کے پھونکنے جانے تک ہی دی جاتی ہے۔

بہر حال! یہ تین عین اس میں تھیں، لیکن وہ عاشق نہیں تھا، اگر عاشق ہوتا تو باری تعالیٰ کی طرف سے جب حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو فوراً کر دیتا۔ یہ نہ دیکھتا کہ میں کیا ہوں اور وہ کیا ہے، اس لیے کہ عاشق کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے محبوب و معشوق کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس پر جان چھڑکنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

محبت جب پیوست ہو جاتی ہے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کا تعلق محبت والا ہونا چاہیے ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے خوب ڈٹ کر محبت کرنے والے ہیں، بلکہ ایمان نام ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا ہے، ایمان کی حقیقت یہی ہے۔ اور محبت کا حال یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ دل میں پیوست ہو جاتی ہے تو پھر نکلنے کا نام نہیں لیتی، اسی لیے تو جب حضور پاک ﷺ نے قیصر روم ہرقل کے نام خط لکھا تھا، جس میں اس کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس مبارک نامہ کو کھولنے اور اس کا مضمون پڑھنے سے پہلے ہی ہرقل نے حضور پاک ﷺ سے متعلق حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ کس شخصیت کا خط ہے، بھیجنے والے کون ہیں۔ چنانچہ وہ اس زمانہ میں بیت المقدس کی زیارت کے لیے آیا ہوا تھا۔ مکہ مکرمہ سے بھی قریش کا ایک قافلہ وہاں پہنچا ہوا تھا جس کی سرداری ابوسفیان کر رہے تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ حضور ﷺ کے مد مقابل کافروں کے سردار تھے، انہی لوگوں کو تحقیق حال کے لیے بلایا گیا، اس نے ان سے بہت سارے سوالات کیے، ان میں ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ جو اس دین کے اندر داخل ہو جاتا ہے؛ تو پھر کیا اس سے ہٹتا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! ایسا تو نہیں ہوتا۔ تو ہرقل نے اس کی وجہ یہی بتائی تھی کہ ایمان کا حال ایسا ہی ہے کہ جب وہ دلوں کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے تو پھر نکلنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ اصل تو ایمان نام ہی اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہے۔

اُمُّ الامراض

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر شیطان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی تو یہ بات ہی پیدا

نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے شیطان کو ہلاک کرنے کا سبب تکبر اور بڑائی ہے۔ تکبر ہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی کے نتیجے میں غصہ آتا ہے، اسی کے نتیجے میں حسد پیدا ہوتا ہے، اسی کے نتیجے میں بغض اور کینہ پیدا ہوتا ہے، اور اسی کے نتیجے میں اور بھی بہت ساری خرابیاں جنم لیتی ہیں، اسی لیے اہل تصوف کے یہاں اس کا نام ہی ”اُمُّ الامراض“ یعنی ساری بیماریوں کی ماں اور جڑ ہے۔ تو تکبر ساری خرابیوں کی جڑ ہے، اس کے بالمقابل تواضع ہے۔ اس بات سے تواضع کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس آدمی کے اندر تواضع ہوگی وہ تکبر سے پاک صاف ہوگا، تو بہت ساری برائیوں کی جڑ خود بخود ہی کٹ گئی، لہذا تواضع بہت ضروری چیز ہے، اسی لیے اس کا حکم و ترغیب دی گئی اور قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت بتلائی گئی ہے، خود حضور پاک ﷺ نے اپنے عمل سے اس کو کر کے بتلایا ہے۔

تواضع کی حقیقت

تواضع کی حقیقت کیا ہے؟ تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کمتر سمجھے، صرف کمتر کہنا کافی نہیں، بلکہ کمتر سمجھنا ضروری ہے۔ آدمی دل سے اپنے آپ کو سب سے کم درجہ سمجھے۔ اگر کوئی آدمی زبان سے اپنے آپ کو حقیر، فقیر، پر تقصیر اور بندہ ناچیز کہتا ہے اور دل سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تو چاہے ایسے الفاظ کہتا رہے؛ اس کا نام تواضع نہیں ہے۔ بلکہ دل سے اپنے آپ کو سب سے کمتر اور سب سے نکمہ سمجھتا ہو، اور یہ سوچتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اگر کوئی کام مجھ سے کروا رہا ہے تو یہ محض اس کا فضل و کرم اور اس کی عنایت ہے، باقی ذاتی اعتبار سے اس میں میرا کوئی کمال اور میسر ہی اپنی کوئی قابلیت نہیں ہے، میری ذاتی صلاحیت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہی اصل ہے کہ آدمی اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے؛ اسی کا نام تواضع ہے۔

نمائشی تواضع

اپنے آپ کو کمتر کہنے اور بولنے کا نام تواضع نہیں ہے، بلکہ یہ تو تواضع کی نمائش ہے۔ بعض مرتبہ آدمی تواضع کی نمائش کرتا ہے کہ کسی نے کچھ کہا تو کہنے لگتا ہے کہ میں تو بڑا نالائق ہوں، میں کچھ بھی نہیں ہوں، تاکہ سامنے والے کہیں کہ نہیں نہیں حضرت! آپ تو بہت بڑے مقام والے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی زبان سے اپنی بڑائی کہلوانے کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، ان کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب کوئی ان کی تعریف کرتا تھا، تو وہ بالکل چپ اور خاموش رہتے تھے، تردید بھی نہیں کرتے تھے۔ اس سے کوئی آدمی یہ نہ سمجھے کہ شاید ان میں تکبر تھا اس لیے اپنی تعریف سنتے رہتے تھے، حالانکہ ایسی بات نہیں تھی، بلکہ وہ خاموش اس لیے رہتے تھے کہ تردید کے اندر بھی کبھی تکبر کا پہلو آ جاتا ہے۔

حقیقی تواضع کی ایک علامت

حقیقی تواضع کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ: میں ناچیز، گنہگار، بندہ حقیر پر تقصیر ہوں، اور سامنے والا جواب میں اگر یہ کہہ دے کہ: ہاں! آپ بالکل ایسے ہی ہیں؛ پھر دیکھئے! اس کا چہرہ متاثر ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کا چہرہ اس سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی طبیعت پر اس جواب کا اثر ہوتا ہے، تو سمجھ جاؤ کہ حقیقی تواضع نہیں ہے۔ اور اگر ایسی بات نہیں ہے تو اس صورت میں سمجھا جائے گا کہ حقیقی تواضع سے آراستہ ہے۔

حضورِ پاک ﷺ کی تواضع

حضورِ پاک ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ہر جگہ تواضع نظر آئے گی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضورِ پاک ﷺ کی طبیعت میں اتنی زیادہ تواضع تھی کہ مدینہ منورہ کی کوئی بچی بھی کسی کام کے لیے آپ کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی تو آپ چلے جاتے تھے۔ جس آدمی کے مزاج میں تکبر ہو، وہ جھلا ایسا کر سکتا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی حضورِ پاک ﷺ سے مصافحہ کرتا تھا تو جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ ہٹاتا، حضورِ اکرم ﷺ اپنا ہاتھ نہیں ہٹاتے تھے، اور کوئی آپ کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کرتا تو جب تک وہ اپنی بات پوری کر کے اپنا چہرہ نہیں پھیرتا تھا تب تک حضورِ اکرم ﷺ بھی اپنا چہرہ مبارک نہیں پھیرتے تھے۔

مجبوری کی وجہ سے مسند بنوائی گئی

مجلس میں بھی پہلے یہ ہوتا تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ سب کے ساتھ ملے جلے بیٹھتے تھے، آپ کے لیے کوئی ممتاز نشست نہیں بنائی گئی تھی، اس لیے کسی کو پیہ ہی نہیں چلتا تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کون ہیں اور صحابہ کون ہیں، اس کی وجہ سے نئے آنے والوں کو تکلیف ہوتی تھی، کوئی نیا آدمی آتا جو آپ کو پہچانتا نہ ہو، تو اس کو دوسروں سے پوچھنا پڑتا کہ حضورِ پاک ﷺ کون ہیں۔ پھر اگر جمع زیادہ ہوتا تو دور والے آپ کو دیکھ بھی نہیں پاتے تھے۔ ان ساری دشواریوں کے پیش نظر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضورِ اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے لیے کوئی اونچی بیٹھک بنوائیں، اس لیے کہ نئے آنے والے آپ کو پہچانتے نہیں، ان کو لوگوں

سے پوچھنا پڑتا ہے، اگر آپ کے لیے ممتاز بیٹھک بنائیں گے تو پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ دوسرا یہ ہے کہ جو لوگ دور ہوتے ہیں ان کو آپ دور سے نظر نہیں آتے تو ان کے لیے بھی دشواری کا سبب ہے، اگر آپ اونچائی پر ہوں گے تو ان کو بھی آپ کی زیارت کا موقع ملے گا، ان ساری ضرورتوں کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اونچی بیٹھک بنانے کی اجازت دی پھر حضور اکرم ﷺ اس پر تشریف فرما ہوتے تھے۔

آپ جب چلتے تھے تو اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے چلیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کے آگے راستہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا کہ راستہ دیا جائے، جیسا کہ بڑوں کے لیے کیا جاتا ہے، آپ کے لیے ایسا نہیں ہوا کرتا تھا، حضور اکرم ﷺ اس کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ تواضع کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی دل سے اپنے آپ کو کمتر سمجھے۔

نعمتوں کو عطیہ خداوندی سمجھے

اب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دے رکھی ہیں؛ ان کا کیا؟ مثلاً ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے علم سے نوازا ہے، تو یہ تو ہونہیں سکتا کہ وہ آدمی یہ سمجھے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، کسی کے پاس دولت ہے تو وہ یہ سمجھے کہ میرے پاس دولت نہیں ہے؛ یہاں تواضع کیسے اختیار کی جائے؟ تو کتابوں میں لکھا ہے کہ جو نعمت اس کے پاس ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ، دین و بخشش سمجھے کہ یہ علم، عہدہ، منصب، مال و دولت، حسن و جمال، یا جو کچھ بھی ہے؛ اس میں میری ذاتی قابلیت و صلاحیت کو دخل نہیں ہے، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمایا ہے۔ ہماری جسمانی نعمتیں تو عطیہ خداوندی ہی ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کیا وہ یہ سب

نعمتیں مانگنے جاتا ہے؟ اس کے اندر تو کسی چیز کی قابلیت نہیں ہوتی، اس کو سب کچھ دینے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اس لیے آدمی یہ سوچے کہ مجھے جو کچھ بھی ملا ہے وہ سب محض اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرما رکھا ہے، اس سے شکر کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ اگر آپ کہیں تو اُحد پہاڑ کو سونے کا بنا دیا جائے اور آپ کے لیے دولت کی ریل پیل ہو جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے عرض کیا: باری تعالیٰ! مجھے یہ منظور نہیں ہے؛ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کھانا کھاؤں، ایک روز بھوکا رہوں؛ تاکہ جس روز کھانا کھاؤں اس روز آپ کا شکر ادا کروں اور جس روز بھوکا رہوں اس روز صبر سے کام لوں۔ حضور اکرم ﷺ کسی حال میں اپنے لیے کوئی امتیازی حیثیت پسند نہیں فرماتے تھے اور جو اکابرین امت گزرے ہیں، ان کا حال بھی حضور اکرم ﷺ کی اقتداء میں یہی تھا۔

خليفة وقت کا سترہ پیوندی کرتہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے، آپ کے جسم پر جو کرتہ تھا اس پر سترہ پیوند لگے ہوئے تھے، جس میں ایک چمڑے کا تھا۔ اپنے زمانہ کا علی الاطلاق حکمران اور ایسا خلیفہ وقت جن کی سلطنت کی حدود بڑی وسیع تھیں، فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، اس کے باوجود ان کے لباس کا یہ عالم تھا۔ اور آپ کو جہاں نیند آتی تھی وہیں لیٹ جاتے اور سو جاتے تھے۔ کھانے کے معاملہ میں بھی سادگی کا یہی حال تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بعد میں بھی یہی سلسلہ رہا۔ تو تواضع کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی دل سے یہ سمجھے کہ میں سب سے کمتر ہوں، کسی قابل نہیں ہوں، اور جو کچھ اپنے پاس ہے

اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور دین سمجھے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر مسلمان سے فی الحال اور ہر کافر سے فی المال اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہوں۔ مسلمان سے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی نعمت عطا فرما رکھی ہے۔ اور کافر سے احتمال کے درجہ میں کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرمائے اور اونچا مرتبہ عطا فرمادے۔ پس یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ آدمی اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کی کیفیت

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ہے کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (دونوں حضرات حضرت حکیم الامت کے خلفاء میں سے تھے) سے کہا کہ جب لوگ حضرت کی مجلس میں بیٹھتے ہیں اس وقت پوری مجلس میں دل میں یہی خیال رہتا ہے کہ میں ہی سب سے نکما اور کمتر ہوں۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہی کیفیت میری بھی رہتی ہے۔ پھر ان دونوں نے کہا کہ اچھا! حضرت کے سامنے اس کو عرض کیا جائے، کہہیں اس میں ہمارے نفس کا کوئی کید تو نہیں ہے؟ دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا حال عرض کیا، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس وقت مجلس منعقد ہوتی ہے، اس وقت میرا حال یہ ہوتا ہے کہ جتنے مجلس میں بیٹھے ہوتے ہیں، میں اپنے آپ کو ان میں سب سے زیادہ نکما اور کمتر سمجھتا ہوں۔

متکبر کی نقد سزا

عرب میں ایک کہاوت ہے: ”متکبر کا حال ایسا ہے جیسے وہ کسی پہاڑ پر کھڑا ہو۔“ پہاڑ پر کھڑا رہنے والا آدمی نیچے والوں کو بہت چھوٹا دیکھتا ہے، لیکن دوسروں کا معاملہ بھی اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے یعنی نیچے والے بھی جب اس کو دیکھتے ہیں تو ان کو وہ چھوٹا ہی نظر آتا ہے، چنانچہ تکبر کرنے والا بھی دوسروں کو بہت کمتر سمجھتا ہے، خود اس کو بھی دوسرے لوگ حقیر ہی سمجھتے ہیں۔ یہ قدرتی اثر ہوتا ہے۔ تکبر کرنے والے کی یہ قدرتی نقد سزا ہے۔ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے تو دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔ چوں کہ اس نے اوپر سے دیکھ کر دوسروں کو چھوٹا سمجھا، تو نیچے والے بھی تو اس کو دیکھ رہے ہیں تو وہ بھی نیچے سے چھوٹا ہی لگ رہا ہے۔

نقشوں کو تم نہ جانچو

اور تکبر میں تحقیر کا معاملہ بھی ہوتا ہے اور تحقیر کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں۔ مسلم شریف کی روایت ہے: ”يَحْسِبُ امْرِيَّ مِنَ الشَّيْءِ اَنْ يَّحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ“۔ کسی مسلمان کی برائی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ لہذا کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس کے دل میں ایمان کی جو دولت ہے وہ بہت بڑی دولت ہے، اسی وجہ سے شریعت نے ہر ایمان والے کے احترام کا حکم دیا ہے۔ پھر یہ کہ کس کی ایمانی کیفیت کیسی ہے یہ کون جان سکتا ہے؟ کسی کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا وہ کس درجہ کا ہے؟ آج جتنے بھی لوگ بڑے منصب اور عہدوں پر فائز ہیں، ان کے نام اور ان کے منصب سے جو آدمی واقف نہ ہو، اس کے سامنے ان کو کھڑا کر دیا جائے، تو کیا چہرہ دیکھ کر وہ کہہ دے گا کہ یہ صدر جمہوریہ ہیں، اور یہ وزیر اعظم ہیں؟

نہیں کہہ سکے گا۔ کسی کے بھی چہرہ سے اس کے اندر کی حقیقت کا پتہ نہیں چلا کرتا۔ اسی طرح ظاہری حالت کی وجہ سے کسی کے متعلق فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

میں یہ بتا رہا تھا کہ تواضع کی صفت بہت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد کے باہر صحن میں حدیث کا درس دے رہے تھے، اسی دوران بارش کے چھینٹے گرنے لگے، تو طلباء فوراً اپنی کتابیں لے کر مسجد کی طرف دوڑے۔ حضرت نے دیکھا کہ سب کے جوتے باہر پڑے ہوئے ہیں تو حضرت سب کے جوتے اٹھا کر ایک جگہ رکھنے لگے، تاکہ بارش سے بھیک کر خراب نہ ہو جائیں۔ طلباء نے جب یہ دیکھا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ حضرت نے یہ نہیں سوچا کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں۔ جو بڑے حضرات ہوتے ہیں ان کی شان یہی ہوتی ہے۔

دارالعلوم کے صدر مدرس کی تواضع

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے، اونچے پائے کے بزرگ اور بڑے عالم تھے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی دیہاتی نے آپ کی دعوت کی، اس کا گھر دور تھا، جب دعوت کا وقت آیا تو اس نے سواری بھی نہیں بھیجی۔ حضرت نے سوچا کہ اس کے یہاں دعوت ہے، چلو! چلتے ہیں۔ پیدل پہنچ گئے، اس نے کھانا کھلایا، آم کا موسم ہت، آم بھی کھلائے، اور واپسی میں آم کی ایک پیٹی بھی ساتھ دے دی۔ ایک تو سواری کا انتظام نہیں کیا، اور جب روانہ ہو رہے تھے تو آم بھی دے دیئے۔ حضرت نے انکار نہیں

کیا، بلکہ قبول کر لیے۔ اب پیٹی لے کر چل رہے ہیں اور طبیعت بہت نازک تھی، اتنا وزن اٹھانے کی عادت بھی نہیں تھی، اس لیے ایک ہاتھ میں تھوڑی دیر اٹھاتے، پھر دوسرے ہاتھ میں اٹھاتے، اسی طرح ہاتھ بدلتے رہے۔ جب دیوبند قریب آیا تو دونوں ہاتھ بالکل شل سے ہو چکے تھے تو اس پیٹی کو سر پر رکھ دیا۔ جب دونوں ہاتھ خالی ہوئے، راحت ملی تو کہنے لگے کہ یہ تجویز پہلے سے کیوں نہیں سو جھی؟ خیر! پھر شہر میں داخل ہوئے، بازار سے گزر رہے تھے تو دکاندار نیچے اتر اتر کر سلام کرنے لگے، لیکن حضرت اس پیٹی کو سر پر اٹھائے ہوئے بے فکر چلے جا رہے تھے، اور سب کے سلام کا جواب بھی دے رہے تھے، دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میں پیٹی اٹھائے ہوئے ہوں۔ تو آدمی کو اپنے اندر تواضع پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دَم نکلنے کے بعد ذائقہ آتا ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عجیب و غریب بات نقل کی ہے۔ حضرت فرماتے تھے: جب پلاؤ پکایا جاتا ہے تو چاول شروع میں بہت اچھلتا اور جوش مارتا ہے، اور جب تک کچا ہوتا ہے اس میں سے آواز آتی رہتی ہے، لیکن جب پکنے کے قریب آتا ہے اور تھوڑی دیر باقی ہوتی ہے تو اس کا دم نکالا جاتا ہے، اس وقت وہ بالکل خاموش پڑا رہتا ہے، اور جہاں اس کا دم نکال دیا گیا تو اس میں سے خوشبو بھی پھوٹی ہے اور اس کا ذائقہ بھی عمدہ ہو جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ: آدمی میں بھی خوشبو اور ذائقہ اسی وقت آئے گا جب کہ اس کا دم نکال دیا جائے، جب تک اس میں دم رہے گا وہاں تک اچھلتا کودتا رہے گا، اور یہ اس کے کچا رہنے کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ کو تواضع ہی پسند ہے

باری تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا: ﴿وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِمَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ جو آپ پر ایمان لائے ہیں، ان کے لیے آپ اپنا بازو جھکائیے، آپ ان کے سامنے تواضع اور انکساری سے پیش آئیے۔ اللہ تعالیٰ کو فنائیت، عبدیت اور تواضع ہی پسند ہے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ﴾ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ﴾ اور تم کو مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ﴿لَتَعَارَفُوا﴾ محض پہچان کے لیے۔ اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور اس پر تکبر کرنا صحیح نہیں ہے ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اپنے آپ کو گناہوں سے زیادہ بچانے والا ہو۔

..... ذرا بند قبادیکھ

باری تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَا تَزُكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ أَنْتُمْ﴾ اے لوگو! اپنی پاکی بیان مت کرو۔ یعنی اپنی خوبیاں ذکر مت کرو کہ میں ایسا پاک ہوں اور ایسی خوبیوں والا ہوں، تم میں کون پاکیزہ ہے یہ تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ سورہ نور میں فرمایا ہے: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانہ پاتا۔ اگر کوئی آدمی گناہوں سے بچ رہا ہے، نیکی کے کام کر رہا ہے، تو اس فخر و غرور میں نہ رہے کہ یہ میرا کمال ہے۔ نہیں بھائی! ایسا بالکل نہیں ہے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی توفیق

ہے، اگر اس کی توفیق ایک لمحہ کے لیے بھی ہٹ جائے تو آدمی کسی بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں اسی کو باری تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو گناہوں سے بچ رہا ہے وہ اس کو اپنا کمال نہ سمجھے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے، اگر اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی گناہوں سے بچ نہ سکتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اسے بچاتا ہے۔ اس لیے اپنی پاکیزگی بیان مت کرو:۔

اتنی نہ بڑھاپا کی داماں کی حکایت * دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بسند قبادیکھ
آدمی کو اپنے معاملہ میں پاکیزہ بننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو لوگ ہی فیصلہ کریں گے، یا اللہ تعالیٰ کے یہاں فیصلہ ہوگا۔ اس آیت میں ﴿فَلَا تَوَسَّوْا﴾ کہہ کر کبر سے منع کیا گیا اور تواضع اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

کوئی کسی پر فخر نہ کرے

۶۰۲:- عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنْ اللَّهُ أَوْحَى إِلَيْكَ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتَّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَتَّبِعِي أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ. (رواه مسلم)
ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر وحی بھیجی کہ تم تواضع اختیار کرو (یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھو) یہاں تک کہ تم میں سے کوئی کسی کے اوپر فخر و غرور نہ کرے اور اپنی بڑائی نہ جتلائے۔ اور کوئی کسی پر ظلم اور سرکشی نہ کرے۔

افسادات:- تکبر ہوگا تو انسانوں پر ظلم سے بھی باز نہیں آئے گا۔ جہاں بھی ظلم ہوتا ہے تکبر کے نتیجے ہی میں ہوتا ہے۔ جہاں تواضع ہوگی وہاں ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ وہاں تو جانوروں تک کے ساتھ انصاف اور رحم و کرم کا معاملہ کیا جائے گا

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا اس میں فرمایا تھا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ! كُلكُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تَرَابٍ﴾ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اس لیے کسی عربی کو عجمی پر، کسی سفید کو کالے پر فخر کرنے اور بڑائی جتلانے کی ضرورت نہیں ہے ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ تم میں سب سے باعزت اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہو۔ اس لیے ہمیں تو یہی دیکھنا ہے کہ وہاں کیا فیصلہ ہوتا ہے، یہاں دنیا میں کسی نے اگر واہ واہ کر دی، یا تعریف کر دی، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تواضع اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

(آمین)

التَّوَّاضِعُ وَخَفْضُ الْجَنَاحِ لِلْبُؤْمِنِينَ

تواضع اختیار کرنا

﴿ مجلس ۲ ﴾

۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۶ ستمبر ۲۰۰۰ء
 جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ تواضع کا بیان چل رہا ہے اور اس کی شریعت میں
 بڑی تاکید ہے، اس سلسلہ میں بہت کچھ وضاحت گذشتہ مجلس میں آچکی ہے۔ آج کچھ
 روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا

۶۰۳:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: مَا نَقَصَتْ
 صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ
 اللَّهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد
 فرمایا: صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا۔ اور معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندہ کی عزت ہی بڑھاتے
 ہیں۔ اور کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا اور اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ
 اس کے درجہ کو بلند ہی کرتے ہیں۔

افادات:- بعض روایتوں میں حضور پاک ﷺ کے پہلے کلمات کو قسم
 کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے یعنی حضور پاک ﷺ نے قسم کھا کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ
 صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا۔ چوں کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کرنے کی وجہ سے
 مال کم ہو رہا ہے، حضور اکرم ﷺ نے تاکید فرماتے ہوئے قسم کے ساتھ یہ بات ارشاد
 فرمائی کہ دیکھنے میں اگرچہ صدقہ کرنے کی وجہ سے آپ کو ایسا نظر آتا ہے کہ مال آپ
 کے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس میں کمی ہو رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صدقہ کے نتیجہ
 میں اللہ تبارک و تعالیٰ مال میں اضافہ ہی فرماتے ہیں۔

معافی عزت بڑھاتی ہے

”وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا“ اور بندے کے معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت و آبرو میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔ یعنی کسی آدمی نے آپ کی شان میں گستاخی کر دی، کوئی ناروا معاملہ اور نامناسب سلوک کر دیا، آپ کو گالی دی، لیکن جب آپ اس کو معاف کر رہے ہیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے اور ہمارا نفس دھوکہ بھی دیتا ہے کہ تم اس کو معاف کر کے اپنی کمزوری دکھلاتے ہو؟ اس میں تو اپنی بے عزتی ہے اور عام طور پر اسی کی وجہ سے آدمی کو طیش آجاتا ہے، اس کی طبیعت میں غصہ آجاتا ہے، اور انتقام کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کی طرف سے آپ کے ساتھ کی گئی اس گستاخی اور نامناسب سلوک کو اگر آپ معاف کر دیں گے، تو یوں نہ سمجھئے کہ اس کی وجہ سے آپ کی عزت پر کوئی حرف آ گیا اور آپ کی عزت میں کمی ہوگئی، آپ کا ویلو گھٹ گیا اور بے عزتی ہوگئی۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، بلکہ معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کی عزت بڑھائیں گے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاف کر کے آدمی اپنی کمزوری دکھا رہا ہے اور عزت گھٹ رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس عمل کے نتیجے میں اس کی عزت کو اور زیادہ بڑھائیں گے، اس میں اور اضافہ کریں گے۔

اليوم يوم المرحمة

حضور اکرم ﷺ کے ساتھ زندگی بھر جن لوگوں نے ایذا رسانی کا معاملہ کیا، آپ کی عزت کے درپے رہے، آپ کو طرح طرح سے تکلیفیں پہنچائیں، آپ کو جھٹلایا، آپ کو وطن سے بے وطن کیا، یہاں تک کہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بھی آپ کے پیچھے

پڑے رہے، لشکر لے کر حملہ کرنے کے لیے آتے رہے۔ ایسا معاملہ کرنے والوں کو آخر حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر معاف کر دیا۔ جب آپ کعبۃ اللہ سے باہر آئے اور دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ مکہ والے تمام کے تمام مسحِ حرام میں جمع ہیں، تو آپ نے پوچھا: تم لوگ میرے متعلق کیا خیال کرتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ ان لوگوں نے جواب دیا: ”أَخْ كَرِيْمٌ وَابْنُ أُمِّ كَرِيْمٍ“ آپ شریف بھائی ہیں، شریف بھائی کے بیٹے ہیں، ہم آپ سے بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لَا تَثْرِيْبُ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوا، اَنْتُمْ الظَّلَقَاءُ“ اکثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی معاف کرنے بعد بھی دوا یک جملہ تو کہہ ہی دیتا ہے کہ چلو! معاف کر دیا، پھر ایک آدھ بات سنا دیتا ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، جاؤ! تم سب آزاد ہو، آپ ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تو اس کی وجہ سے کیا آپ ﷺ کی عزت میں کمی آگئی؟ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ نے عزت اور بڑھادی، آپ کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہوا۔ کوئی آدمی اگر یہ سمجھتا ہو کہ اس کے ساتھ نازیبا، ناروا اور نامناسب سلوک کرنے والے، یا گالی دینے والے، یا ایذا میں اور تکلیفیں پہنچانے والے کو معاف کرنے کی وجہ سے ہماری عزت گھٹتی ہے؛ تو اس کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، اللہ تعالیٰ اس کے نتیجے میں اس کی عزت کو بڑھاتے ہی ہیں، کر کے تو دیکھو۔ حضور اکرم ﷺ جب قسم کھا کر ایک بات فرما رہے ہیں تو آدمی تجربہ کر لے، تجربہ کرنے سے آپ ہی آپ اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔

تواضع کی زبردست خاصیت

”وَمَا تَوَاضَعٌ أَحَدُ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ“ کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے

تواضع اختیار کرتا ہے، اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے درجہ کو بلند ہی کرتے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی کبریائی و بڑائی اور اس کی عظمت جس کے دل میں سما جائے، اس کی بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے؟ پھر بھلا وہ اپنے آپ کو کہاں اونچا اور بڑا سمجھ سکتا ہے؟ جس کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا استحضار ہر وقت ہو، جس کی نگاہوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بڑائی و کبریائی ہو، وہ کبھی اپنی ذات کی طرف نظر کر ہی نہیں سکتا۔

جب عظمت الہی جاگزیں ہوتی ہے

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةً أَهْلِهَا أَذِلَّةً﴾ دنیا کے بادشاہوں کا دستور یہ ہے کہ جب کسی آبادی یا ملک میں فاتحانہ طور پر داخل ہوتے ہیں تو اس کو زیر کر کے اس کے عزت والے لوگوں اور سرداروں کو قید کر کے رسوا و ذلیل کرتے ہیں؛ تاکہ وہ دوبارہ مقابلہ میں سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عظمت جب کسی دل میں آ جاتی ہے تو پھر نفس کا غرور، اس کا کبر، اس کا حسد اور جتنے بھی بڑے بڑے روگ نفس کے اندر ہیں، سب زیر ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ختم کر دیتا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سر بلندی عطا فرماتے ہیں۔ یہ تواضع کی زبردست خاصیت ہے۔

کتے اور سور سے بھی گیا گزرا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سر بلندی عطا فرماتے ہیں ﴿فَهُوَ فِي نَفْسِهِ صَغِيرٌ وَفِي أَعْيُنِ النَّاسِ

عَظِيمٌ۔ وہ اپنی نگاہوں میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن لوگوں کی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو آدمی تکبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر کے رہتا ہے۔ فَهُوَ فِي أَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيرٌ، وَفِي نَفْسِهِ كَبِيرٌ۔ وہ آدمی اپنی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھتا ہے کہ مجھ جیسا کوئی نہیں ”ہم چوں من دیگرے نیست“، بعض لوگوں نے اس میں ترمیم کرتے ہوئے یہ کہا ہے ”ہم چوں من ڈنگرے نیست“، میرے جیسا کوئی جانور نہیں ہے۔ جب وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا ہم مرتبہ کوئی نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرتے ہیں۔ وہ اپنی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے، لیکن لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوتا ہے آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں: ”حَتَّىٰ لَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِنْ كَلْبٍ أَوْ خَيْزُرٍ“ یہاں تک کہ لوگوں کی نگاہوں میں وہ کتے اور سوسے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے (شعب الایمان: ۷۹۰) وہ آدمی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے، لیکن اس کو معلوم نہیں کہ لوگوں کا میرے متعلق کیا خیال ہے۔

چھپھلی مجلس میں عربی کی ایک کہاوت سنائی تھی کہ جو آدمی تکبر کرنے والا ہوتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پہاڑ پر کھڑا ہونے والا آدمی ہوتا ہے، اس کو نیچے والے چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں، وہ اپنے تکبر کی وجہ سے دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے، لیکن نیچے والے بھی اس کو چھوٹا ہی دیکھتے ہیں، یعنی نیچے والوں کو بھی وہ بڑا نظر نہیں آتا۔

تواضع کا اعلیٰ نمونہ

۶۰۴:- وعن أنس بن مالك قال: أتته مرة على صبيان، فسلم عليهما، وقال:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَفْعَلُهُ. (متفق عليه)

ترجمہ:- ایک مرتبہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما کے پاس سے گزر رہا تو

انہوں نے خود ہی بچوں کو سلام کیا، اس کے بعد فرمایا: نبی کریم ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔
 اسنادات:- یعنی آپ ﷺ جب بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو آپ
 از خود بچوں کو سلام کرتے تھے۔ اس سے حضور اکرم ﷺ کی تواضع کا پتہ چلتا ہے۔ آپ
 ﷺ کا مقام تو بہت بلند تھا، اس کے باوجود آپ جب بچوں کے پاس سے گذرتے
 تھے تو سلام میں ابتدا فرماتے تھے۔ ویسے بھی بعض روایتوں میں ہے: "الْبَادِيَةُ
 بِالسَّلَامِ بَرِيءٌ مِنَ الْكِبَرِ (فيض القدير شرح جامع الصغیر)؛ جو آدمی سلام میں ابتدا کرتا ہے
 وہ عام طور پر تکبر سے بری ہوتا ہے۔ اور جس کے دل میں کبر ہوتا ہے وہ عام طور پر سلام
 میں ابتدا نہیں کرتا، وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے سلام کریں، میں کسی کو سلام کیوں کروں؟
 لیکن حضور اکرم ﷺ کا عمل یہ تھا کہ آپ بچوں تک کو اپنی طرف سے سلام میں ابتدا
 فرماتے تھے۔ اس میں بچوں کی تعلیم و تربیت بھی مقصود ہے، اور آپ ﷺ کی تواضع
 کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ایک اور نمونہ

۶۰۵:- وعنه قَالَ: إِنْ كَانَتْ الْأُمَّةُ مِنْ إِمَاءِ الْمَدِينَةِ لَتَأْخُذُ بِرِدِّ

النَّبِيِّ ﷺ فَتَنْطَلِقُ بِهِ حَيْثُ شَاءَتْ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ کی باندیوں میں سے کوئی
 باندی (اور بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ مدینہ کی بچیوں میں سے کوئی بچی)
 حضور اکرم ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور جہاں چاہتی لے جاتی تھی۔

اسنادات:- یعنی آپ اس کے کہنے پر بھی انکار نہیں فرماتے تھے اور وہ
 آپ کو جہاں لے جانا چاہتی وہاں آپ تشریف لے جاتے تھے۔ اس سے آپ ﷺ
 کی غایت تواضع معلوم ہوتی ہے۔

گھر کے نبوی اعمال

۶۰۶:- وعن الأَسودِ بنِ يزيدٍ، قَالَ: سئِلْتُ عائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا مَا كَانَ النَّبِيُّ

ﷺ يَصْنَعُ فِي بَيْتِهِ؟ قَالَتْ: كَانَ يَكُونُ فِي مَهْمَنَةِ أَهْلِهِ -يعني: خِدْمَةِ أَهْلِهِ- فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ. (رواه البغاري)

ترجمہ:- حضرت اسود بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: حضور اکرم ﷺ جب گھر میں تشریف لاتے تھے تو کیا کرتے تھے؟ (یعنی گھر میں رہنے کے درمیان آپ کیا کام کرتے تھے؟) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: گھر والوں کے کام کاج میں رہتے تھے، لیکن جب نماز کا وقت آتا تھا تو فوراً نماز کے لیے نکل جاتے تھے۔

افادات:- یعنی ان کا تعاون کرتے تھے، گھر کے کام کاج میں مدد فرماتے تھے۔ چنانچہ بعض روایتوں میں ہے کہ اگر مشک پھٹی ہوئی ہوتی تھی تو اس کو سی لیتے تھے، جھاڑو دیتے تھے، بکری کا دودھ اپنے دست مبارک سے دوہتے تھے، اپنے کپڑے میں جوں تلاش کرتے تھے۔ ویسے حضور اکرم ﷺ کو جوں نہیں ہوتی تھی شراح نے لکھا ہے کہ ایسا ہوتا ہے کہ جب آدمی دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے تو کسی کی جوں چڑھ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ گھر میں جا کر ان چھوٹے چھوٹے کاموں کا اہتمام فرماتے تھے۔ گھر والوں کے کام کاج میں اس طرح تعاون اور مدد کرنا، ان کا ہاتھ بٹانا: یہ غایت تواضع کی علامت ہے۔ متکبر بھلا ایسا کر سکتا ہے؟ وہ تو لیجئے دیجئے ہی میں لگا رہتا ہے۔ ایسا آدمی جب گھر بھی جاتا ہے تو گھر والے اس کی وجہ سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کب یہاں سے نکلے۔ اسی لیے لکھا ہے کہ آدمی کو گھر میں بالکل ہلکا پھلکا رہنا چاہیے، بو جھل بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ یعنی گھر والوں

کے ساتھ آدمی کا معاملہ ایسا رہے کہ گھر والے اس کے وجود کو گھر میں برکت سمجھیں اور یہ سوچیں کہ جتنا زیادہ گھر میں رہے اتنا ہی اچھا ہے، اس کو بوجھ نہ سمجھیں کہ ذرا کسی بچے نے بھی کچھ کہہ دیا تو اس کو طمانچہ ماردیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ذرا دیر کے لیے بھی اگر گھر میں گئے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ اس نوع کا تھا کہ جب گھر والوں کے درمیان میں ہوتے تو گھر کے کام کاج میں ان کا ساتھ دیتے۔

جس وقت، جو فرض

آگے ایک بات فرمائی کہ جب نماز کا وقت آتا تھا تو فوراً نماز کے لیے نکل جاتے تھے۔ دراصل جس کا جیسا حق ہو اس کو ادا کرتے رہنا چاہیے، جب اللہ تعالیٰ کے حق کا وقت آ گیا تو اس کی ادائیگی میں بھی کوتاہی اور غفلت نہیں ہونی چاہیے، جیسا کہ آپ ﷺ کا عمل بتلایا کہ نماز کا وقت آنے پر فوراً نماز کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ گھر میں جا کر گھر والوں کے کام میں ان کا ہاتھ تو بٹاتے ہیں، لیکن اس میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ نماز کا وقت آتا ہے تو اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں، اُدھر کام میں ذرا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو یہاں تک ہاتھ بٹا رہے ہیں کہ اُدھر جماعت بھی چھوٹ رہی ہے۔ تو یہ طریقہ بھی بالکل غلط اور ناپسندیدہ ہے۔

پر دیسی کے ساتھ متواضعانہ سلوک

۶۰۷- وعن أبي رفاعَةَ تَمِيمِ بْنِ أُسَيْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: انْتَهَيْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ يُخْطَبُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! رَجُلٌ غَرِيبٌ جَاءَ يَسْأَلُ عَن دِينِهِ لَا يَدْرِي مَا دِينُهُ؟ فَأَقْبَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَتَرَكَ حُطْبَتَهُ حَتَّى انْتَهَى

إِلَىٰ، فَأَتَىٰ بِكُرْسِيِّ، فَقَعَدَ عَلَيْهِ، وَجَعَلَ يُعَلِّمُنِي هَيْمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ، ثُمَّ أَتَىٰ حُطْبَتَهُ فَأَتَمَّهُ آخِرَهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو رفاعہ تمیم بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا کہ آپ تقریر فرما رہے تھے۔ میں نے پہنچتے ہی عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایک پردیسی آدمی اپنے دین کے متعلق آپ سے کچھ پوچھنے کے لیے آیا ہے، اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس کا دین کیا ہے؟ (کس چیز کا عقیدہ رکھنا چاہیے؟ کس چیز کو عمل میں لانا چاہیے؟ دین کے متعلق اس کو معلومات چاہئیں) وہ صحابی کہتے ہیں کہ میری بات سن کر نبی کریم ﷺ اپنا خطبہ اور تقریر چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوئے یہاں تک کہ منبر سے اتر کر میرے پاس آئے، پھر کرسی لائی گئی تو آپ اس پر بیٹھے اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام بتلائے ہیں وہ مجھے سکھانے لگے۔ جب مجھے بتلا چکے تو پھر واپس منبر پر تشریف لے گئے اور اپنا خطبہ پورا کیا۔

افادات:- ایک پردیسی آدمی کی بات پر تقریر کو درمیان میں چھوڑ دینا غایت درجہ تواضع کی بات ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جس میں آدمی منتظر رہتا ہے کہ یہ کام پورا کر لوں پھر آپ کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اگرچہ کوئی آدمی اپنے کسی کام میں مشغولی کی وجہ اس کو پورا کرنے کے بعد توجہ کرے تو یہ چیز تواضع کے منافی نہیں ہے۔

انگلیاں چاٹنا؛ تواضع کی علامت

۶۰۸:- وعن أنس رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ كان إذا أكل طعاماً، ليعق أصابعه الثلاث. قال: وقال: إذا سقطت لقمته أحدكم فليبط عنها الأذى، وليأكلها ولا يدعها للشيطان. وأمر أن تُسَلَّتِ القِصْعَةُ، قال: فإتاكم لا تدرون في أي طعامكم البركة. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے تھے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا: کسی کا لقمہ اگر گر جائے تو اس پر جو میل مٹی لگی ہو اس کو دور کرے، پھر اس لقمے کو کھالے، اس کو شیطان کے لیے چھوڑ نہ دے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کر کے چاٹ لیا جائے، اس لیے کہ تم کو یہ پیتے نہیں ہے کہ تمہارے کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے۔

افادات:- عام طور پر حضور اکرم ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ تین انگلیوں۔ انگوٹھا، انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی۔ سے کھاتے تھے۔ ان تین انگلیوں ہی سے لقمہ لیتے اور کھانا تناول فرماتے تھے اور جب کھانے سے فارغ ہو جاتے تو ان تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے۔ پہلے درمیانی پھر انگشتِ شہادت پھر انگوٹھا۔ اور انگلیوں کو چاٹنا غایت تواضع کی بات ہے، متکبر لوگ بھلا ایسا کہاں کر سکتے ہیں؟

شیطان کو آرام نہ پہنچاؤ

”وَلَا يَدْعُهَا لِلشَّيْطَانِ“ اس لقمے کو شیطان کے لیے نہ چھوڑ دے۔ اگر آپ چھوڑ دیں گے تو گویا وہ شیطان کی غذا بنے گی، اور شیطان یہی چاہتا ہے، حالانکہ شیطان کو تو بھوکا ہی رکھنا چاہیے، اس کو کسی طرح کا آرام نہیں پہنچانا چاہیے۔

شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی جب گھر میں داخل ہو تو اللہ کا نام لے کر داخل ہو، اگر آدمی اللہ کا نام لیے بغیر اور گھر میں داخل ہوتے وقت کی جو دعائیں ہیں وہ پڑھے بغیر داخل ہوتا ہے تو شیطان خوش ہوتا ہے کہ چلو! آج اس گھر میں ہمیں رات کو قیام کا موقع مل گیا۔ اسی طرح کھانا شروع کرتے ہوئے بھی بسم اللہ نہیں پڑھتا تو وہ خوش ہو جاتا ہے کہ چلو! ہم کو کھانے میں شرکت مل گئی۔ اسی لیے شریعت نے ان چیزوں

میں اللہ کا نام سکھایا ہے، اور شیطان ان میں سے اپنا حصہ نکلوانے کے لیے مختلف تدبیریں اپناتا ہے، وہ ایسی کوششیں کرتا ہے کہ کسی بھی طرح کچھ نہ کچھ آپ سے چھین لے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی لوگ ساتھ میں کھانے کے لیے بیٹھے ہیں تو وہ کسی ایسے آدمی کو لے آتا ہے جس نے بسم اللہ نہ پڑھی ہو۔

شیطان لُچا ہے

ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک باندی دوڑی ہوئی آئی اور برتن میں ہاتھ ڈالنا ہی چاہتی تھی کہ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی دوران ایک اور دیہاتی آیا اور جلدی سے بسم اللہ پڑھے بغیر ہی ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا، آپ نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا، پھر ارشاد فرمایا: دیکھو! شیطان کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں (صحیح مسلم: ۸۰۷۸/۵۳۷۸) شیطان یہ چاہتا تھا کہ بسم اللہ پڑھوائے بغیر ان کو کھانا کھلوائے تاکہ اس کے ضمن میں خود اس کو بھی کھانا مل جائے، لیکن میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ معلوم ہوا کہ اس کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے۔

اس طرح کھاتے کھاتے ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لقمہ گر جاتا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ شیطان ہی نے آپ کے ہاتھ سے کسی طریقہ سے گروا دیا ہو۔ جو لُچے لوگ ہوتے ہیں نا وہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں کہ آپ کوئی چیز کھا رہے ہوں تو ہاتھ مار دیتے ہیں تاکہ گر جائے اور وہ اٹھا کر کھالیں۔ تو شیطان بھی لُچا ہے، اس کی عادت بھی یہی ہے کہ آپ کے ہاتھ سے لقمہ کسی طرح نیچے گر اداے، اگر آپ اس کو یوں ہی چھوڑ دیں گے تو وہ کھالے گا اور اس کا مقصد حاصل ہو جائے گا، اس لیے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لیجئے، تاکہ شیطان کو شرکت کا موقع نہ ملے۔

ایک جزو بھی ضائع نہ جائے

”فَاتَّكُمُ لَا تَذَرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةَ“ حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کر کے چاٹ لیا جائے، اس لیے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے۔ یعنی پیالے میں جتنا کھانا ہے وہ اگر آپ پورا کر چکے ہیں لیکن اس کے کناروں کے اوپر کھانے کے تھوڑے اجزاء لگے ہوئے ہیں، ان کو چھوڑنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ان کو صاف کر لو۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیالے میں ایک کلو کھانا رکھا ہوا ہے وہ سب کھا ہی جاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو ضرورت کم ہے، اور کھانے کی مقدار زیادہ ہے، تو وہ دوسرے موقع پر کھالی جائے گی، لیکن کھانے کے جو ذرات اور دانے اس پیالے اور برتن کے ادھر ادھر کونے میں لگے ہوئے ہیں، اگر آپ صاف نہیں کریں گے تو وہ ضائع ہو کر شیطان کا حصہ بنیں گے، اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پیالے کو انگلی سے صاف کر لو اور چاٹ لو، پتہ نہیں کہ کھانے کی برکت کون سے حصہ میں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسی کو چاٹ لینے کے نتیجے میں آدمی کو سیری نصیب ہو جاتی ہے، اور برکت کا مطلب یہی ہے کہ آدمی کی ضرورت اس سے پوری ہو جائے، ورنہ کھانے کے بعد بھی تقاضا باقی رہ جاتا ہے۔

قدرِ نعمت

ہمارے اکابر تو اس بات کا یہاں تک اہتمام کرتے تھے کہ جو ذرات منہ میں رہ جاتے وہ بھی ضائع نہ چلے جائیں۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے

متعلق سنا کہ کھانا کھا چکنے کے بعد کلی کرنے سے پہلے ایک گھونٹ پانی منہ میں گھما کر حلق سے نیچے اتار لیتے تھے، تاکہ کھانے کے وہ ذرات باہر نہ گر جائیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہیں سے کوئی ہدیہ آیا، اس ٹوکری پر کچھ ذرات لگے ہوئے تھے تو آپ نے بڑی محنت سے ان کو تلاش کر کے نوش فرمایا تاکہ وہ ضائع نہ جائیں۔ درحقیقت یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، آدمی جب اس بات کو مد نظر رکھے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے تو پھر اس کو قدر ہوگی اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کا اہتمام ہوگا۔ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ اس کی بڑی اچھی مثال دے کر سمجھاتے تھے: کسی بڑے آدمی نے آپ کو کوئی چھوٹی سی چیز - کھانے کے دو چار لقمے، ایک دو بیڑے، یا تھوڑی سی مٹھائی - دی، اس کے سامنے آپ وہ چیز کھا رہے ہیں اور وہ دیکھ بھی رہا ہے، تو اب اس کا کوئی ذرہ بھی نیچے گرے گا تو آپ یہ سوچ کر جلدی سے اس کو اٹھالیں گے کہ وہ دیکھ رہا ہے، اگر نہیں اٹھاؤں گا تو وہ کیا کہے گا کہ میری دی ہوئی چیز کی اس کے نزدیک کوئی قدر نہیں ہے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تو ہر چیز کو دیکھ ہی رہا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمت کی قدر دانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی دی چیز کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، اگر کسی نے پانی پیا اور آدھا گلاس بچ گیا، تو اس کو پھینکنے کی اجازت نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ بھائی! اس کو رہنے دو، کوئی دوسرا پی لے گا۔

..... تب قدر ہوتی ہے

دراصل ہمارے پاس پانی وافر مقدار میں موجود ہے اس لیے ہمیں قدر نہیں

ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جہاں پانی نہیں ملتا یا کبھی کوئی ایسا موقع آجاتا ہے کہ پانی کی قلت ہو جاتی ہے؛ تب اس کی قدر ہوتی ہے۔ کنڈلا (گجرات کے ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے) میں جو سمندری طوفان آیا تھا، اس کے بعد وہاں پانی کی قلت ہو گئی تھی، وہاں جانے والوں نے بتایا کہ جو لوگ مدد کی اشیاء لے کر گئے تھے ان کے پاس خود کے پینے کے لیے پانی کی بوتلیں تھیں۔ وہاں کے لوگ ان کے پاس جمع ہو جاتے اور عاجزی کرتے کہ ہم اتنی مدت سے پیاسے ہیں، ہمیں ایک گھونٹ پانی دے دو۔ ایک گھونٹ پانی کی قدر ایسے مواقع پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی قیمتی نعمت ہے۔ اس لیے اس کی قدر دانی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔

اس روایت میں پیالے کو چاٹنے کا حکم ہے، اور نبی کریم ﷺ انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے، یہ سب تواضع ہی کی چیزیں ہیں۔ جس آدمی کے مزاج میں تکبر ہوگا، وہ بھلا ایسے کام کیسے کرے گا!

وہ ادا بہت پسند آئی

۶۰۹:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قَالَ: ((مَا بَعَثَ اللَّهُ نَبِيًّا إِلَّا الرَّعَى الْغَنَمَ)) قَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ، كُنْتُ أُرْعَاهَا عَلَى قَرَارِ يَطُّ لِأَهْلِ مَكَّةَ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس نے بکریاں چرائی۔ صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جی ہاں! میں چند قیراط (سکون) کے بدلہ میں مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

افسادات:- ہرنی نے بکریاں چرائی ہیں اور آپ ﷺ کا بھی بکریاں چرانا ثابت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے حضراتِ انبیاء کی تربیت ہوتی ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بکری ویسے تو بڑا مسکین جانور ہے لیکن جب ضد پر آجاتی ہے اور اپنے اگلے پاؤں چوڑے کر کے کھڑی ہو جاتی ہے، تو اس کو ڈنڈا مارو، تب بھی نہیں ہٹتی، اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی لیکن ہٹے گی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تمہیں یاد ہے تم ایک مرتبہ بکریاں چرارہے تھے، ایک بکری بھاگی تو تم اس کے پیچھے دوڑے، وہ برابر دوڑتی جا رہی تھی اور تم اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے، یہاں تک کہ جب وہ بھی تھک گئی اور تم بھی تھک گئے، تو وہ تمہارے ہاتھ آگئی۔ تم اس کو گود میں لے کر کہنے لگے: ارے پیاری! تو نے اتنا بھاگ کر اپنے آپ کو بھی تھکا یا اور مجھے بھی تھکا دیا۔ تمہاری یہ اداجھے بہت پسند آئی۔ پھر اسی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کلام فرمایا۔

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ بکریوں کے چرانے میں حضراتِ انبیاء کی ایک طرح سے تربیت کی جاتی تھی۔

حضراتِ انبیاء کی تربیت

ایک موقع پر نبی کریم ﷺ ایک غزوہ میں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں ایک جگہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیلو کے پھل توڑنے لگے تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کالا دیکھ کر توڑنا۔ پیلو کا پھل جب کچا ہوتا ہے تو سبز ہوتا ہے، پھر اس میں پیلا پن آتا ہے، پھر سرخی آتی ہے اور پھر کالا ہوتا ہے، اور جو کالا ہوتا وہی میٹھا ہوتا ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے بکریاں چرائی ہیں؟ یعنی یہ نکتہ تو اسی آدمی

کو معلوم ہو سکتا ہے جو بکریاں چرانے کے لیے جنگل میں گیا ہو۔ گھر پر رہے ہوئے آدمی کو یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! میں نے بکریاں چرائی ہیں، اور ہرنی نے بکریاں چرائی ہیں۔

ایک بات یاد رہے

تو بکریاں چرانا تواضع کی بات ہے اور تواضع پیدا کرنے والی بھی ہے، لیکن ایک بات یاد رہے کہ جس کو بکریاں پالنے کا شوق ہو وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اس کا یہ عمل دوسروں کے لیے ایذا کا باعث نہ ہو۔ بعض لوگ شوق میں بکریاں پالتے ہیں، پھر ان کی نگرانی نہیں کرتے تو پڑوسیوں کو اس کی وجہ سے تکلیف ہو جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اس کی وجہ سے جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔

..... تو بھی قبول کر لوں گا

۶۱۰:- وعنه، عن النبي ﷺ قَالَ: لَوْ دُعِيْتُ إِلَى كُرَاعٍ أَوْ ذِرَاعٍ لَأَجَبْتُ، وَلَوْ أُهْدِيَتْ لِي ذِرَاعٌ أَوْ كُرَاعٌ لَقَبِلْتُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی پائے یا دست کا گوشت کھانے کے لیے مجھے بلائے، تو میں اس کی دعوت کو قبول کروں گا۔ یا یہی چیزیں ہدیہ میں دے، تو میں اس کو بھی قبول کر لوں گا۔

افادات:- بکری کا جو گلہ پیر ہوتا ہے اس کو ”ذراع“ کہتے ہیں۔ آپ

لوگ کہیں گے کہ پائے تو بہت اچھی چیز ہے، سورت والے ناشتہ میں بارہ ہانڈی اور پائے بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ اُس زمانہ میں پائے ایسے نہیں پکائے جاتے تھے، بلکہ وہ لوگ اس کو آگ پر بھون لیتے تھے، اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بعض

مرتبہ دیر تک کو کر میں پکانے بعد بھی وہ کچے رہ جاتے ہیں اور کھائے نہیں جاسکتے، تو آگ پر بھوننے پر کیسے بنتے ہوں گے۔ پھر پاپیوں میں کھانے کا حصہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی اگر مجھے اس کے لیے بھی دعوت دے گا تو میں قبول کروں گا اور اس کے گھر پر حاضری دوں گا۔ یا ہدیہ میں بھی دے گا تو میں اس کو قبول کر لوں گا۔ یہ بھی نہایت تواضع کی بات ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی معمولی یا کم قیمت چیز۔ جس کی قدر و قیمت زیادہ نہ سمجھی جاتی ہو۔ بھی کسی آدمی کو دی جائے، اور وہ اس کو قبول کر لے تو یہ تواضع کی دلیل ہے۔ ورنہ جو آدمی متکبر ہوتا ہے وہ ایسی چیز کو کہاں قبول کرے گا؟ وہ تو طرح طرح کی باتیں بنائے گا کہ یہ کیا چیز دینے آئے ہو؟ کیا میری بے عزتی کر رہے ہو؟

کوئی چیز جب سر اٹھاتی ہے

۶۱۱:- وعن أنس بن مالك قال: كانت ناقة رسول الله ﷺ العصباء لا تسبق أو لا تكاد تسبق، فجاء أعرابي على قعود له، فسبقها، فشق ذلك على المسلمين حتى عرفه، فقال: حقت على الله أن لا يرفع شيء من الدنيا إلا وضعه. (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی اونٹنی عصباء ہمیشہ آگے ہی رہتی تھی، کوئی دوسرا اونٹ اس سے آگے نہیں جاسکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک دیہاتی اپنے نوجوان اونٹ پر آیا، اور اس سے آگے نکل گیا، یہ چیز صحابہ کرامؓ پر بڑی شاق گذری (برداشت نہیں ہوئی) حضور اکرم ﷺ نے ان کے ان جذبات و احساسات کو ان کے چہروں سے محسوس کیا تو ایک اصول ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ضروری ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس

کو نیچا کر کے رہتے ہیں۔

افادات:- ”عضباء“ آپ ﷺ کی اوٹنی کا نام ہے۔ ”عضباء“ دراصل ایسی اوٹنی کو کہتے ہیں جس کا کان کٹا ہوا ہو۔ اس اوٹنی کا کان کٹا ہوا تھا یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ اس کا نام نہیں تھا بلکہ اس کا صرف لقب تھا۔

قدرت کا ایک دستور اور قانون ہے کہ جو سر اٹھائے گا، اس کو نیچا ہونا ہے۔ اس لیے کوئی آدمی اپنے آپ کو بہت بڑا بنانے کی کوشش نہ کرے، ورنہ ہوتا یہی ہے کہ اس کے لیے قدرت کی طرف سے نیچا ہونے کی شکلیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے مشکوٰۃ شریف کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی تھی کہ جو آدمی تکبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر کے رہتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ آدمی تواضع اختیار کرنے کا اہتمام کرے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق و سعادت نصیب فرمائے

تحریم الکبر والاعجاب

کبر و خود پسندی کی حرمت

۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنِّیْہِۭ بِہِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ
 یُّضِلُّہٗ فَلَا ہَادِیَ لَہٗوْ نَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنَّ سَیِّدِنَا
 وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلِّمَ تَسْلِیْمًا
 کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ۔۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فِسَادًا
 وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

تکبر اور خود پسندی

نیا عنوان قائم کیا ہے: تکبر اور خود پسندی کا حرام ہونا۔

تکبر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے دوسروں کو حقیر سمجھے۔ اور خود پسندی یہ ہے کہ اپنی خوبیوں پر دوسرے کسی کی تحقیر کے بغیر دل ہی دل میں اترانا۔ یعنی اپنی ذات کے متعلق اچھا گمان ہو، اس میں دوسرے کی تحقیر نہیں ہوتی؛ یہ عجب اور خود پسندی ہے۔

..... جو بڑا بننا نہیں چاہتے

قرآن پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فِسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے جو زمین کے اندر نہ تو بڑا بننا چاہتے ہیں، اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ اور اچھا انجام متقیوں کے واسطے ہے۔ گویا جب آدمی بڑا بننا چاہتا ہے تو اسی کے

نتیجہ میں بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور زمین میں فساد ہوتا ہے۔ اور جو لوگ زمین میں تواضع کے ساتھ رہتے ہیں، بڑائی نہیں چاہتے وہ فساد بھی نہیں پھیلاتے۔ تو اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسے ہی لوگوں کو وہاں کا گھر اور نعمتیں عطا فرمائیں گے۔

زمین میں اکڑ کر مت چلو

ایک اور آیت کا حصہ پیش کیا ہے: ﴿وَلَا تَمَّشْ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ زمین میں اکڑ کر مت چلو۔ ”مَرَحٌ“ یعنی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے اکڑ کر چلنا۔

سورہ لقمان کی آیت پیش کی ہے: ﴿وَلَا تَصْعَرَ حَذَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمَّشْ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخٍ﴾ اپنے رخسار کو تکبر کی وجہ سے لوگوں سے مت پھیرو (متکبر اپنی بڑائی جتانے کے واسطے لوگوں سے اپنا رخ پھیر لیتا ہے، منہ موڑ لیتا اور اعراض کرتا ہے) اور زمین میں اترا کر نہ چلو، بیشک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے اترانے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو دشمن رکھتا ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ اپنا دشمن بنا نہیں پھر اس کے لیے دنیا میں کہاں ٹھکانہ رہے گا، اور کون اس کو اونچا لاسکے گا؟

اترانے کا عبرتناک انجام

قارون کے متعلق قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مَوْسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُمْ مِنَ الْكُفْرِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے (تعلق رکھتا) تھا، اپنی قوم کے مقابلہ میں وہ سرکشی اور غرور پر اتر آیا۔ ہم نے اس کو

ایسے خزانے عطا فرمائے تھے جن کی کنجیاں بھی بڑے طاقتور لوگوں کی ایک پوری جماعت اٹھایا کرتی تھی۔ لوگوں نے اس سے کہا: تو مت اترا، اترا نے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے، (لیکن وہ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آیا اور ایک روز اسی اترا ہٹ کے اندر عمدہ لباس پہنے ہوئے، اپنے بالوں کو سنوارے ہوئے اڑتے ہوئے چل رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی دولت، خزانوں، مکان و پارٹمنٹ کے ساتھ زمین کے اندر دھنسا دیا اور قیامت تک دھنستا چلا جائے گا)

گویا جو آدمی عجب، خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار اور لعنت برستی ہے، اور ایسا انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب کا حق دار بنتا ہے۔

ذرّہ برابر تکبر کی سزا

۶۱۲:- وعن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه عن النبي ﷺ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ! فَقَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُجِئُ بِأَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا، وَنَعْلُهُ حَسَنَةً؛ قَالَ: إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُجِئُ بِالْجَمَالِ، الْكِبَرُ: بَطْرُ الْحَقِّ وَخَمَطُ النَّائِسِ. (رواه مسلم)

(بَطْرُ الْحَقِّ): دَفْعُهُ وَرَدُّهُ عَلَى قَائِلِهِ. وَ(خَمَطُ النَّائِسِ): اِحْتِقَارُهُمْ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کے دل میں ذرّہ برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کیا: آدمی تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کے جوتے اعلیٰ ہوں (لباس کے معاملہ میں عمدگی کو پسند کرتا ہے؛ تو کیا یہ تکبر کی بات ہے؟) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جمیل و خوبصورت ہے، اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق کا انکار کرنا، قبول نہ

کرنا، اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

افادات:- تکبر کو شیطانی گناہ بتلایا گیا ہے، اور ایسے گناہوں پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ یعنی ذرہ برابر دل میں تکبر ہوگا تو اس کے ہوتے ہوئے وہ آدمی جنت میں نہیں جاسکتا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ زرد رنگ کی چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں ہوتی ہیں، ان کو عربی میں ”ذِرَّةٌ“ کہتے ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ کھڑکی یا دروازہ کے سوراخ سے دھوپ کسی اندھیرے گھر میں آتی ہے تو اس دھوپ کے اندر کچھ اڑتا ہوا نظر آتا ہے جو عام حالت میں نظر نہیں آتا؛ اسی کو ”ذِرَّةٌ“ کہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے ایک روٹی کا وزن کیا اور پھر اس کو کسی جگہ رکھ دیا تو زرد رنگ کی بہت ساری چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں اس پر آگئیں، اس کے بعد ان تمام چیونٹیوں سمیت اس کا وزن کیا، تو وزن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مطلب یہ ہے کہ تکبر کا اتنا کم حصہ کہ جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، اتنا بھی کسی کے دل میں ہے تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ بہت سخت وعید ہے۔

ٹھیک ٹھاک اور ٹیپ ٹاپ

”إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ“ اللہ تعالیٰ جمیل و خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ ”جمال“ کا ترجمہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیک ٹھاک فرمایا ہے، اور اس کی تشریح یہ فرمائی ہے کہ آدمی کا اپنی حالت کو درست رکھنا۔ ایسی صورت نہ ہو کہ اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر کسی کو نفرت یا دل میں کدورت پیدا ہو۔ بعضوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ ایک پانچواں اور دوسرا نیچا ہے، ایک آستین چوڑی،

دوسری تنگ ہے، ٹوپی بھی پھٹی ہوئی ہے، کپڑے میلے کچیلے اور بال بھی بکھرے ہوئے ہیں؛ ایسی ہیئت کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ آدمی کا لباس چاہے معمولی ہو، لیکن صاف ستھرا ہو اور اس کی ہیئت ٹھیک ٹھاک ہو۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک تو ہے ٹھیک ٹھاک، اور ایک ہے ٹیپ ٹاپ۔ ٹیپ ٹاپ یعنی تجل اور زینت؛ اس کو مردوں کے لیے پسندیدہ قرار نہیں دیا ہے، ہاں! عورتوں کے لیے پسندیدہ ہے جبکہ اپنے شوہر کے لیے کرتی ہوں۔ مرد اپنے آپ کو ایسی چیزوں میں لگائے اس کو پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ ٹھیک ٹھاک تو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، لیکن ٹیپ ٹاپ پسند نہیں ہے۔ گویا ٹھیک ٹھاک ایک درمیانی حالت ہے، اور ٹیپ ٹاپ میں آدمی آگے بڑھتا اور غلو کر جاتا ہے، اس لیے اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ تو آدمی اپنا حال درمیانی رکھے، یہ اچھی چیز ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند بھی کرتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے؛ یہ تکبر نہیں ہے۔

یہ تکبر نہیں

تو پھر تکبر کیا ہے؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اس کی تشریح فرمائی ہے۔ اچھا لباس پہننا، اچھا جوتا اور اچھی ٹوپی استعمال کرنا؛ اس کا نام تکبر نہیں ہے، بلکہ **«الْكِبْرُ؛ بَطْرُ الْحَقِّ وَ غَمَطُ النَّاسِ»** حق کا انکار کرنا، حق قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا؛ یہ تکبر ہے۔ اگر اعلیٰ درجہ کے کپڑے پہن کر مزاج میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ کوئی آدمی صحیح اور درست بات کہتا ہے، حق بات پیش کرتا ہے؛ تب بھی وہ انکار کر دیتا ہے کہ اس نے مجھے کیوں کہا؟ دیکھتا نہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں؟ تو یہ تکبر ہوا۔ باقی آدمی اپنا لباس عمدہ سے عمدہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ سچائی کو کبھی رد نہیں کرتا، جو حق بات اس کے

سامنے پیش کی جاتی ہے اس کو فوراً قبول کر لیتا ہے؛ تو پھر اس کو تکبر نہیں کہیں گے۔

یہ کبر ہے

اور کوئی آدمی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے لیکن حق بات پیش کی جاتی ہے تو وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، انکار کر دیتا ہے؛ تو یہ تکبر کی بات ہے۔ بعض فقراء اس مزاج کے ہوتے ہیں، صاحب ثروت ہی متکبر ہو یہ ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ تو دل کی ایک کیفیت ہے۔ چنانچہ وہ فقیر جو متکبر ہو، اس کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ اگر کچھ پاس ہے اور تکبر کرتا ہے تو کوئی بات بھی ہے کہ اس کی وجہ سے تکبر پیدا ہوا، لیکن کوئی آدمی فاقہ مست ہے اور تکبر کرتا ہے؛ تو یہ تو بہت ہی زیادہ بری چیز ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ: وہ اپنی دھڑی میں مست اور ہم اپنی چڑی میں مست۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چڑی کوئی مستی کی چیز ہے۔

جنبشِ باطن

جس کے اندر کسی گناہ کا سبب ہو اور وہ گناہ کا ارتکاب کرے تو کوئی بات بھی ہے۔ جیسے احادیث میں تین آدمیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا بادشاہ، اور تیسرا تکبر کرنے والا فقیر؛ ان تینوں کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مبغوض و ناپسندیدہ رکھتے ہیں۔

بوڑھا زانی: بڑھاپے میں ویسے بھی آدمی کے قوی جواب دینے لگتے ہیں، بیوی موجود ہو تب بھی آدمی کو اس کی طرف رغبت اور میلان کم ہو جاتا ہے، اور یہ بوڑھا ہو کر زنا میں مبتلا ہوا۔ یہ تو عمر کی وہ منزل تھی کہ اس زمانہ میں حلال طریقے سے بھی یہ چیز ملتی ہے تو آدمی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، چہ جائیکہ حرام میں مبتلا ہوا۔ گویا یہ اس

کے باطنی خبثت پر دلالت کرنے والی چیز ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کو بھی بہت زیادہ مبعوض اور ناپسندیدہ رکھتے ہیں۔

جھوٹا بادشاہ: آدمی عام طور پر جھوٹ اس لیے بولتا ہے کہ وہ کوئی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ سچائی کے ساتھ میں وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکوں گا، لیکن بادشاہ کے پاس تو ساری سلطنت ہے، اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس کا جھوٹ بولنا تو باطن میں خباثت کا پتہ دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کو مبعوض رکھتے ہیں۔

فقیر متکبر: فقر کے ساتھ تکبر کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس کے پاس کچھ ہوتا، ثروت و دولت ہوتی، کوئی منصب و عہدہ ہوتا اور اس کے ساتھ تکبر ہوتا، تو کوئی بات بھی تھی، لیکن فقر کے ساتھ تکبر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ باطنی خبثت کی وجہ سے یہ حرکت کر رہا ہے۔

کوئی برا نہیں.....

تو تکبر کی ایک علامت حق کا انکار کرنا۔ اور دوسری علامت کسی کو حقیر سمجھنا۔ حقیر بھی بہت خطرناک چیز ہے، شریعت اس کی کسی حال میں اجازت نہیں دیتی۔ مسلم شریف کی روایت ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: «يَحْسَبُ امْرُؤٌ مِنَ النَّبِيِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ» کسی آدمی کی برائی کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، اللہ تعالیٰ نے ایک مؤمن کے دل میں ایمان کی جو کیفیت اور دولت پیدا فرمائی ہے اس کی وجہ سے اس کا اکرام کرنے کی اور اس کی حقیر سے بچنے کی شریعت نے بڑی تاکید فرمائی ہے، اس کے پاس بہت بڑی دولت ہے، بلکہ لکھا ہے کہ دوسری مخلوقات کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

عطاء اور بقاء کا مراقبہ

اور سوال یہ ہے کہ آدمی کس بنیاد پر کسی دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے؟ اس لیے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے اس میں اس کے کمال کو کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، جب بھی آدمی کو یہ خیال پیدا ہو کہ میرے پاس دولت ہے، علم ہے تقویٰ و بزرگی ہے، عمل صالح ہے، کوئی منصب و عہدہ ہے، غرض ہر وہ چیز جس کی وجہ سے دل میں تکبر پیدا ہو سکتا ہے، تو اس کے متعلق آدمی یوں سوچے کہ یہ سب مجھے میرے استحقاق کی وجہ سے نہیں ملا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ چیز عطا فرمائی ہے۔ اور پھر یہ بھی سوچے کہ اس کا بقاء بھی اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہی موقوف ہے، مثلاً: دولت، علم، بزرگی اور تقویٰ؛ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو گا تب ہی باقی رہیں گی، ورنہ آن کی آن میں اللہ تعالیٰ اس کو ختم بھی کر سکتا ہے۔ اگر دماغ پر ذرا سا اثر آ گیا تو ساری عقل غائب، اور سارا علم ختم ہو جاتا ہے کیسا ہی آدمی ہو، وہ لوگوں کے لیے کھلونا بن جاتا ہے، ساری چیزیں اور سارے کمالات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات غور کرتے رہنی چاہیے کہ جو کچھ بھی ہے، محض اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی بخشش ہے، اور اس میں میرے کسی بھی استحقاق کو دخل نہیں ہے، پھر اس کا باقی رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی پر موقوف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں جس کو کمزور سمجھ رہا ہوں، کیا ضروری ہے وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے۔ ابھی اس کے پاس یہ چیز نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ چیز آج جو میرے پاس ہے، کل کو اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ اچھے انداز میں اس کو دیدے۔ مثلاً: ہم اپنے آپ کو اس لیے بڑا سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس دولت ہے، اس کے پاس نہیں ہے، لیکن ہو سکتا

ہے کہ کل اس کے پاس ہم سے ڈبل دولت آجائے۔ دنیا میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں کہ کل جس کے پاس کچھ نہیں تھا، ایک مدت کے بعد اس کے پاس دولت کی ریل پیل ہو جاتی ہے۔ تو اپنی جس نعمت کی وجہ سے میں اپنے آپ کو بڑا اور سامنے والے کو حقیر سمجھ رہا ہوں؛ کیا ضروری ہے کہ میرے پاس وہ نعمت باقی رہے اور کیا ضروری ہے کہ اس کے پاس آئندہ نہ آئے؟ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مجھ سے زیادہ مقدار میں دیدے۔ آدمی اگر یہ ساری باتیں سوچتا رہے گا تو کبھی کسی کی تحقیر دل میں پیدا نہیں ہوگی۔

اتنی نہ بڑھا.....

اور تحقیر ہی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے آدمی محروم ہو جاتا ہے۔ جب یہ کیفیت کسی کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میری عطا ہے، تیرے کمال کو اس میں کیا دخل ہے؟ اگر کسی کے پاس علم یا دولت، بزرگی، تقویٰ و پرہیزگاری ہے، اور وہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ تو اس کے بارے میں خود باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيَّ كُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَايَ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی گناہ سے بچ نہیں سکتا تھا۔

﴿مَا زَكَايَ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا﴾ اہل علم جانتے ہیں کہ جب نکرہ نفی کے تحت آتا ہے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اور باری تعالیٰ پوری تاکید کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کو گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ اس لیے اگر ہمیں توفیق ملی ہے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے: ﴿فَلَا تَزُكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى﴾ اپنے آپ

کو پاک صاف ظاہر مت کرو، اپنی پاکی پر مت اتراؤ، اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون گناہ سے بچنے والا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے:۔

اتنی نہ بڑھاپا کی داماں کی حکایت * دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قب دیکھ

یعنی آدمی کو خود اپنے حالات پر نظر کرتے رہنا چاہیے، خود آدمی اپنے حالات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف ہوتا ہے، اس لیے کسی کی تحقیر تو ہونی ہی نہیں چاہیے۔

کبر سے ارتداد تک

پہلے بھی میں نے قصہ سنایا تھا، موقعہ کی مناسبت سے پھر سناتا ہوں۔ اس واقعہ کو ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ میدان عرفات سے روانگی کے لیے تیار تھے، آفتاب غروب ہو چکا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے پاس یمن کے کچھ سردار قسم کے لوگ بھی موجود تھے، وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ ایسا لگ رہا ہے کہ حضور کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں کہ وہ آجائیں تو چلیں، لیکن پتہ نہیں کہ کس کا انتظار ہے؟ اتنے میں ایک نوجوان سانولے رنگ کا، دبلا پتلا، ہونٹ موٹے، چپٹا چہرہ آیا۔ یہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو حضور اکرم ﷺ کے بڑے لاڈلے تھے۔ چہرے مہرے سے خوبصورت نہیں تھے، ان کے والد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورے چپٹے تھے، لیکن ان کی والدہ سیاہ فام تھیں، حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کا ہی اثر آیا تھا۔ خیر! ان سردار قسم کے لوگوں نے جب ان کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ: ان کی وجہ سے ہمیں اتنی دیر یہاں انتظار کروایا گیا؟ گویا ایک قسم کی تحقیر ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جو اس

واقعہ کے راوی ہیں۔ فرماتے ہیں: «فَلِذَلِكَ كَفَرَ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ أَجْلِ ذَا» اسی وجہ سے یمن والے کفر و ارتداد میں مبتلا ہوئے۔

صاحب طبقات محمد بن سعد کہتے ہیں: میں نے اپنے استاذ یزید بن ہارون - جو بڑے محدث ہیں - سے پوچھا کہ حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کا فتنہ پھیلا، بہت سے لوگ اسلام چھوڑ کر کافر ہو گئے ان میں یمن کے اسی علاقہ کے لوگ مبتلا ہوئے، اور اس کی وجہ ان کا یہی تحقیر کا جملہ تھا۔ (حیاء الصحابة، جلد: ۲، ص: ۵۳۳، الاستخفاف بالمسلم واحتقارہ)

دوسرا واقعہ

شیخ ابو عبد اللہ اندلسی رحمہ اللہ کا عبرت ناک واقعہ ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے پورا قصہ ذکر کیا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے مستقل رسالہ لکھا ہے، کسی زمانہ میں میں نے اس کا گجراتی کیا تھا اور گجراتی میں وہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

ایک بڑے محدث تھے، قراءاتِ سبعہ کے ساتھ قرآن پاک کے حافظ، عربی کے بڑے ماہر، اور اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے، ان کی خانقاہیں تھیں، سیکڑوں ان کے مرید تھے۔ ایک مرتبہ اپنے مریدوں کے ساتھ ایک جگہ سے گزر رہے تھے جو عیسائیوں کی بستی تھی، وہاں سے گزرنے کے دوران ان کے کلیساؤں اور عبادت گاہوں سے ناقوس کی آواز آرہی تھی اور وہاں سور بھی چر رہے تھے۔ ان کے دل میں ان لوگوں کی تحقیر آئی کہ یہ عجیب قوم ہے، کس چیز کی عبادت کرتے ہیں اور کس دین پر عمل کرتے ہیں؟ وہ فرماتے ہیں کہ اسی وقت میں نے ایک آواز سنی کہ تمہیں جو کچھ ملا ہے، وہ تو ہماری

عطا ہے، اس میں تمہارے کون سے عمل اور صلاحیت کو دخل ہے؟ اسی بستی سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ اس بستی کے سردار کی نوجوان لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے کے لیے کنویں پر جا رہی تھی، جب اس پر نظر پڑی تو ان کا دل اس پر آ گیا، شیخ وہیں کھڑے ہو گئے اور ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ مریدین منتظر ہیں کہ شیخ چلیں تو ہم بھی چلیں۔ کچھ دیر بعد شیخ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اب تو میں یہیں کا ہو گیا ہوں۔ پھر انہوں نے باقاعدہ پیغام نکاح بھیجا تو سردار نے کہا: میں اپنی بیٹی ایسے نہیں دے سکتا، بلکہ میری چند شرطیں ہیں: آپ ایک مدت تک یہیں رہیے، ہمارے دین کو اختیار کیجیے، اور اتنے زمانہ تک میرے سوچرائیے؛ تب میں اس کا نکاح آپ سے کروں گا۔ شیخ نے اپنے مریدوں سے اپنا رشتہ توڑ کر کہا: تم لوگ جاؤ، میں تمہارے ساتھ آنے والا نہیں ہوں، وہیں رہ گئے اور ایک لمبی مدت تک اسی حالت میں رہے۔

شیخ کے سب معتقدین پر اس واقعہ کا بڑا اثر تھا کہ اتنا بڑا محدث، اتنا بڑا عالم اور اتنا بڑا شیخ وقت کس ابتلاء میں پھنس گیا! سب مریدین بیچارے رو رو کر دعا کرتے تھے کہ: اے اللہ! ہمارے شیخ کو اس ابتلاء و آزمائش سے نکال دے۔ کچھ مدت کے بعد مریدین شیخ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے واپس آئے، تو دیکھا کہ سر پر نصاریٰ کی ٹوپی ہے، کمر پر زنا باندھا ہوا ہے، اور اسی عصا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں جس کا سہارا لے کر اپنے مریدین کی تربیت کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑے رہتے تھے، اور سوروں کو چرارہے ہیں۔ حضرت شبلیؒ اور حضرت جنیدؒ بھی اس قافلہ میں تھے، حضرت شبلیؒ نے شیخ سے کچھ سوالات کیے کہ آپ کو تو پورا قرآن پاک قراءت سبعہ کے ساتھ یاد تھا؛ اب بھی اس کی کوئی آیت یاد ہے؟ شیخ نے کہا: دو آیت کے سوا کچھ یاد نہیں، ایک تو یہ ہے:

﴿وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ﴾ جس کو اللہ تعالیٰ ذلیل کرتا

ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور دوسری یہ ہے: ﴿وَمَنْ يَتَّبِدْ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ جس نے ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کیا تحقیق وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا۔ پھر پوچھا: آپ کو تو ہزاروں حدیثیں یاد تھیں، اب بھی کوئی یاد ہے؟ کہا: صرف ایک حدیث یاد ہے: «مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَأَقْتُلُوهُ» جو آدمی اپنا دین بدل دے اس کو قتل کر دو۔

خیر! بعد میں پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی، تو بہ کر کے دوبارہ ایمان میں آئے، اور پھر وہی سارا علم اللہ تعالیٰ نے دوبارہ عطا فرمایا۔ یہ سب ہو چکنے کے بعد میں انہوں نے اپنے اس ابتلاء و آزمائش کی جو وجہ بتلائی وہ یہی تھی کہ میرے دل میں اس بستی والوں کے متعلق حقارت کا جذبہ آیا تھا، اسی کی وجہ سے اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ طرف سے ڈالا گیا۔ (نوٹ:- یہ قصہ مفصل آپ بیتی نمبر ۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مرتب۔)

دینی کام کرنے والوں سے

بہت سی مرتبہ دین کے کام میں لگے ہوئے لوگ اس قسم کی آزمائش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس کے پیچھے بھی عام طور پر یہی چیز کارفرما ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو دینی کام کی توفیق عطا فرمائی ہے، علمی، تصنیفی، تبلیغی، یا کسی بھی لائن سے؛ تو کبھی کسی بندہ خدا کی تحقیر دل میں نہیں آنی چاہیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ہر مسلمان کو حالاً اور کافر کو مالا اپنے سے بہتر و افضل سمجھتا ہوں۔ مسلمان کو اس لیے کہ ایمان جیسی نعمت اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے، اور ہو سکتا ہے اس کی کوئی خوبی اور وصف ایسا ہو جو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو میرے مقابلہ میں زیادہ مقام دلانے کا باعث ہو؛ اس لیے میں اس کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں۔ اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا

ہوں، ہو سکتا ہے کہ کل کو وہ اسلام لے آئے، اور مدد تو خاتمہ پر ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کس کا خاتمہ کس حال پر ہوتا ہے، کسی کافر کے متعلق بھی ہم گارنٹی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کفر پر ہی مرے گا، کل کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دیدی، اور دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو وہ تو کامیاب ہو گیا، اور کسی مؤمن کے متعلق گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ ایمان کے ساتھ ہی دنیا سے جائے، نعوذ باللہ کہیں محرومی کی نوبت آئی اور ایمان سے محروم ہو کر گیا تو وہ ناکام ہوا۔ اس لیے آدمی کے دل میں کسی کی بھی تحقیر نہیں آنی چاہیے، اس سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، اس کے نتیجہ میں آدمی بہت ساری آزمائشوں میں مبتلا ہوتا ہے، اسی کو غَمَطُ النَّاسِ کہا گیا ہے۔

..... پھر کبھی ہاتھ نہ اٹھا سکا

۶۱۳:- وعن سلمة بن الأكوع رضي الله عنه أن رجلاً أكل عند رسول الله ﷺ بشماله، فقال: كُلْ بيمينك. قال: لا أستطيع! قال: لا استطعت. ما منعة إلا الكبؤ. قال: فما رقعها إلى فيه. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا: دائیں ہاتھ سے کھاؤ (تو حق بات کو قبول نہ کرتے ہوئے) اس نے کہا: میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا (حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے کھا سکتا تھا لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا، اور بات نہیں مانی) تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے! اب نہیں کھا سکو گے (حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) اس کے بعد کبھی وہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا ہی نہیں سکا (ہمیشہ کے لیے اس کا دایاں ہاتھ بیکار ہو گیا۔)

افادات:- بہت سی مرتبہ کسی آدمی کو بھلائی کے کام کے لیے یا کسی برائی سے بچنے کے لیے کہا جاتا ہے، تو اس بات کو رد کر دیتا ہے، حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ جو بات مجھے کہی جا رہی ہے وہ بالکل درست ہے، لیکن کبر کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کرتا، تو پھر اس کو اسی طرح کی تکلیفیں بھگتنی پڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

پھر جنت کے قابل بنے گا

۶۱۴:- وعن حارثة بن وهب بن وهب رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: (الْأَخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ: كُلُّ عْتَلٍ جَوَّاهٍ مُسْتَكْبِرٍ. (متفق عليه))

ترجمہ:- حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: میں تمہیں جہنمیوں کے متعلق نہ بتاؤں (کہ کون لوگ جہنم میں جائیں گے؟) ہر بد مزاج، منہ پھٹ، غرور کرنے اور اترانے والا۔

افادات:- اگر مؤمن ہے تب بھی تکبر کے ہوتے ہوئے جنت میں نہیں جاسکتا۔ جہنم کی بھٹی میں ڈال کر تکبر سے پاک صاف کریں گے، پھر جنت میں جانے کے قابل بنے گا۔

جنت و دوزخ کا مناظرہ

۶۱۵:- وعن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: احتجبت الجنة والنار، فقالت النار: في الجنة نارون والمتكبرون. وقالت الجنة: في ضعفاء الناس ومساكينهم، ففضى الله بينهما: إنك الجنة رحمتي، أرحم بك من أشاء، وإنك النار عذابي أعتب بك من أشاء، ولكلكما علي ملوها. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت اور دوزخ میں آپس میں دلیل بازی ہوئی (یعنی دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی فوقیت جتانے کے لیے دلیلیں پیش کیں، دونوں میں مناظرہ ہوا) جہنم کہنے لگی: میرے اندر تو بڑے بڑے سرکش اور تکبر کرنے والے ہیں (دنیا میں جو بڑے سمجھے جاتے تھے، جیسے: فرعون، ہامان، قارون و شداد) اور جنت کہنے لگی: میرے اندر تو کمزور مسکین قسم کے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان فیصلہ کیا (کہ لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے) جنت سے کہا: تو میری رحمت کا مظہر ہے، میں جس کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا چاہتا ہوں، اس کو تیرے اندر بھیج دیتا ہوں۔ اور جہنم سے کہا: تو میری سزا دینے کا ذریعہ ہے، تیرے ذریعہ میں جس کو چاہتا ہوں سزا دیتا ہوں۔ اور تم میں سے ہر ایک کے لیے میرے پاس بھراوا ہے (یعنی تمہاری ضرورت اور مانگ پوری کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔ جنت کو بھی میں اس کے مناسب لوگوں سے بھروں گا۔ اور جہنم کو بھی میں اس کے مناسب لوگوں سے بھروں گا)

جو چھوٹوں کو بڑا بنادے

افادات:- بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ جہنم کے مقابلہ میں جنت نے کیا دلیل پیش کی؟ وہ تو یوں کہہ رہی ہے کہ میرے اندر کمزور اور مسکین لوگ ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: وہ یہ بتلانا چاہتی ہے کہ جو دنیا میں کمزور اور ناقابل توجہ سمجھے جاتے تھے، میرے اندر آنے کے بعد آج وہ بادشاہ بن گئے اور بڑے شہسار ہونے لگے۔ تو جو چھوٹوں کو بڑا بنادے، اس کے کمال کا کیا کہنا۔ دراصل جنت کی بات میں بھی اس کے اندر جانے والے لوگوں کی صفات کا اثر ظاہر ہو گیا، اصل میں جنت یہی کہنا چاہتی ہے، لیکن اس چیز کو وہ تواضع والے انداز میں بیان کر رہی ہے۔ چوں کہ جنت متواضعین کی

جگہ تھی، اس لیے اس کلام کے پیش کرنے میں بھی تواضع کا اثر آ گیا۔ اور جہنم متکبرین کی جگہ ہے اس لیے اس کو اس نے اسی انداز میں پیش کیا۔

جنت اور جہنم کا بھراوا

جنتی اور جہنمی جب اپنی اپنی جگہ پہنچ جائیں گے تو باری تعالیٰ جہنم سے پوچھیں گے: "هَلِ امْتَلَأْتِ؟" کیا تو بھر گئی؟ تو وہ کہے گی: "هَلْ مِنْ مَزِيدٍ" اور کچھ ہے؟ اس کے اس مطالبے کو ختم کرنے کے لیے باری تعالیٰ (اپنی شانِ شان) اپنا قدم اس میں رکھ دیں گے جس کی وجہ سے جہنم کی طغیانی ختم ہو جائے گی، اس کو بھرنے کے لیے کوئی الگ مخلوق پیدا نہیں کی جائے گی۔ اور جنت کے اندر جننیوں کو بھیجنے کے بعد بھی بہت سی جگہ خالی رہ جائے گی، حالاں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو دنیا کا دس گنا عطا کیا جائے گا اور اعلیٰ کا تو معلوم نہیں کیا حال ہوگا۔ غرض سب کو سب کچھ دے چکنے کے بعد بھی جنت میں بہت سی جگہ خالی رہ جائے گی تو اس کو بھرنے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا کریں گے، اس کے ذریعہ سے جنت کے خالی حصوں کو بھریں گے تاکہ وہ آباد ہو جائے۔

نظرِ رحمت سے محروم

۶۱۶:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: لا ينظر الله يومه

القيامة إلى من جرّأ رآه بظراً. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے جو اپنی لسنگی اور پانچامہ (یعنی وہ کپڑا جو نیچے پہنا جاتا ہے) تکبر کی وجہ سے سُخنوں سے نیچے تک لٹکائے۔

افادات:- کوئی بھی لباس جو تکبر کی وجہ سے سُخنے ڈھانپ دیتا ہو، وہ اس میں

داخل ہے، چاہے وہ پاجامہ ہو، پتلون ہو، لنگی ہو یا عربی کرتہ؛ سب اس میں داخل ہیں۔ دیکھو! اتنی سخت وعید ہے کہ تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔

تین مبغوض ترین

۶۱۷:- وعنه، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَأَهُمُّ عَذَابِ أَلِيمٌ: شَيْخُ زَانَ، وَمَلِكُ كَذَّابٌ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ. (رواه مسلم) ((العائِل)) : الْفَقِيرُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے گا، نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا، اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھے گا (بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ، اور تکبر کرنے والا فقیر۔) (تشریح پہلے آچکی ہے)

متکبر کو شدید دھمکی

۶۱۸:- وعنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: قَالَ اللَّهُ -عز وجل-: الْعِزُّ إِزَارِي وَالْكَِبْرِيَاءُ رِدَائِي، فَمَنْ يِنَازِعْنِي فِي وَاحِدٍ مِنْهُمَا فَقَدْ عَدَّ بْتَهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: عزت میری ازار اور کبریائی میری چادر ہے، جو ان کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا، میں اس کو عذاب دوں گا۔

افادات:- بعض روایتوں میں ”قَصَبْتُهُ“ کا لفظ ہے، میں اس کی گردن

توڑ دوں گا۔ آدمی اپنے جسم کا نچلا حصہ جس لباس سے ڈھانکتا ہے اس کو عربی میں ”ازار“ کہتے ہیں، چاہے وہ پاجامہ ہو یا لنگی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو آدمی بڑائی اختیار کرنا چاہے گا، میں اس کو سزا دوں گا اور دنیا ہی میں اس کو رسوا کر دوں گا۔

خود پسندی کی نقد سزا

۶۱۹:- وعنه: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي فِي حُلَّةٍ تَعْجِبُهُ نَفْسُهُ، مَرَّ جِلٌّ رَأْسَهُ، يَخْتَالُ فِي مَشِيَّتِهِ، إِذْ حَسَفَ اللَّهُ بِهِ، فَهُوَ يَتَجَلَّجَلُ فِي الْأَرْضِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (متفق عَلَيْهِ).

((مَرَّ جِلٌّ رَأْسَهُ)): اُمِّي هُمَّيْثُ طُهُ، ((يَتَجَلَّجَلُ)) بِالْجَيْمِينِ: اُمِّي يَغْوُضُ وَيَنْزِلُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ ایک آدمی ایک جوڑا پہنے جا رہا تھا، خود پسندی میں مبتلا تھا، بالوں میں کنگھی کیے ہوئے تھا، چال میں اکڑ پیدا ہو گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا، اب وہ قیامت تک زمین میں اترتا رہے گا۔

متکبر لکھ دیا جاتا ہے

۶۲۰:- وعن سَلْمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ حَتَّى يُكْتَبَ فِي الْجَبَّةِ اِرِين، فَيُصِيبُهُ مَا أَصَابَهُمْ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن) ((يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ)): اُمِّي: يَزْتَفِعُ وَيَتَكَبَّرُ.

ترجمہ:- حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی برابر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جو بڑے بڑے متکبرین گزرے ہیں

ان میں اس کو بھی لکھ دیا جاتا ہے، اور ان کو اللہ تعالیٰ کا جو عذاب پہنچا تھا، وہی عذاب اس کو بھی پہنچتا ہے۔

افسادات:- حالاں کہ اس کے اندر اور کوئی برائی نہیں ہے، صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہے، بس اس کی وجہ سے ان کے ساتھ شمار کیا گیا۔
اللہ تعالیٰ ہمیں تکبر اور خود پسندی سے محفوظ رکھے اور تمام رذائل سے ہمیں پاک و صاف فرمادے۔

بَابُ حُسْنِ الْخُلُقِ

ایچھے اخلاق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱۴۲۱ھ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۰ء
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنُسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ
 بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرٍ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتٍ اَحْمَالِنَا مِنْ بِيْتِهٖ اِيْدهِ اللّٰهِ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ
 يُضِلُّهٗ فَلَا هَادِيَ لَهٗو نَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ سَيِّدِنَا
 وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا
 كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ:-

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيْمٍ. وَالْكَاطِمِيْنَ الْغَيْظِ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ

صرف یہ اخلاق نہیں

نیا عنوان قائم کیا ہے: اچھے اخلاق کا بیان۔

اخلاق سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر ہمارے یہاں اس لفظ کو جب استعمال کرتے ہیں تو مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ آدمی لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ کوئی آدمی بوقت ملاقات اگر خندہ پیشانی سے ہنس مکھ طریقہ سے، یا نرمی سے پیش آتا ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کے اخلاق بہت اونچے اور اچھے ہیں، لیکن شریعت کی اصطلاح میں صرف اتنی بات کو اخلاق نہیں کہتے، اگرچہ شریعت کی نگاہ میں یہ بھی ایک پسندیدہ طریقہ ہے، جو آدمی با اخلاق ہوگا اس میں یہ بات بھی پائی جائے گی، لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اخلاق کا لفظ جب قرآن اور حدیث میں بولا جاتا ہے، تو اس کا ایک مخصوص مفہوم و معنی مراد لیا جاتا ہے۔ دیکھو! اخلاق کی درستگی کی طرف شریعت نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا ہے، اگر اخلاق درست ہوں گے، تب ہی عبادات، معاملات اور معاشرت بھی ٹھیک ہوں گے۔ اگر اخلاق بگڑے ہوئے ہیں تو عبادات، معاملات اور معاشرت بھی ٹھیک نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ آدمی کے لیے وبال بن جاتے ہیں۔ اس لیے اخلاق کی درستگی کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا گیا ہے۔

جسم کی قدر رُوح سے ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، ایک اس کا جسم ہے، اور ایک روح ہے۔ ویسے بھی صرف جسم کا نام انسان نہیں ہے جب تک کہ اس میں روح موجود نہ ہو۔ بغیر روح کے خالی جسم کو کوئی بھی انسان سے تعبیر نہیں کرتا۔ اگر جسم کے اندر سے روح نکال لی جائے تو کوئی جسم اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہتا، حالاں کہ اس کا پورا جسم ویسا ہی موجود ہے جیسا روح نکلنے سے پہلے تھا۔ کان، ناک، زبان، ہونٹ، ہاتھ، پاؤں، جسم کے دوسرے سارے اعضاء اپنی حالت پر موجود ہیں، اس کے باوجود کوئی اس کو انسان سے تعبیر نہیں کرتا، بلکہ اب اس کو 'لاش' کہا جاتا ہے، جو دراصل لاشی ہے، یعنی کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس کو 'لاش' سے اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے کہ جب تک اس میں روح تھی لوگ اس کے ساتھ محبت و اکرام کا معاملہ کرتے تھے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے تھے، اگر وہ کوئی بڑا آدمی تھا تو اس کی اطاعت کو اپنے لیے عزت سمجھتے تھے، اس کی چشم و ابرو کے منتظر رہتے تھے، لیکن جب اس کے جسم میں سے روح نکل جاتی ہے، تو اب اس کی اطاعت ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے، وہ ساری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جب تک وہ زندہ تھا اس میں مالک بننے کی صلاحیت تھی، چیزیں اس کی ملکیت میں آسکتی تھیں، لیکن اب موت کی وجہ سے مالک بننے کی صلاحیت بھی ختم ہو گئی۔ جب تک وہ زندہ تھا، اپنی بیوی کا شوہر تھا، لیکن جب انتقال ہو گیا تو نکاح کا رشتہ بھی ختم ہو گیا، اگرچہ دوسرے رشتے ختم نہیں ہوتے، لیکن زندگی میں اس کے ساتھ جو تعلق رہتا ہے، موت کے بعد وہ باقی نہیں رہتا، کتنی ہی محبت و تعلق ہو، اس کی عزت و احترام دل میں ہو، لیکن روح نکل چکنے کے بعد اس کے جسم کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو گھر میں بھی رکھیں، بلکہ کوشش

یہ کی جاتی ہے کہ پہلی فرصت میں اس کو نہلا کر، کفن پہنا کر دفن کا انتظام کیا جائے۔ اولاد چاہے کتنی ہی محبت کرنے والی ہو، لیکن جب باپ کے جسم سے روح نکل جائے، پھر ان سے کوئی کہے کہ اس جسم کو گھر ہی میں رہنے دو، تو اولاد اس کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا کہ جسم کی جو بھی قدر و قیمت ہے وہ روح کی وجہ سے ہے۔

روح سے متعلق بھی احکام

روح بھی انسان کا ایک جزو ہے، اس کے متعلق بھی کچھ خاص خاص ہدائیتیں شریعت نے دی ہیں، جسم کے اوپر جیسے مختلف حالات طاری ہوتے ہیں، مثلاً جسم تندرست ہوتا ہے، بیمار بھی ہوتا ہے، توانا و طاقتور ہوتا ہے، کمزور و نحیف بھی ہوتا ہے جو بصورت اور بد صورت ہوتا ہے۔ اسی طریقہ سے روح صحت مند اور بیمار ہو سکتی ہے، طاقتور اور نحیف ہو سکتی ہے، خوبصورت اور بد صورت ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو حالات جسم پر طاری ہوتے ہیں، وہی حالات روح پر بھی طاری ہو سکتے ہیں۔ اور روح کے متعلق بھی شریعت نے ہمیں خاص طور پر ہدائیتیں دی ہیں، اور یہی آدمی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جسمانی اعمال میں فرائض

ظاہری اعمال کا تعلق آدمی کے اعضاء سے ہے۔ مثلاً: نماز میں قیام، رکوع و سجدہ، قعدہ، قراءت وغیرہ ارکان ہیں، یا تسبیحات، ثناء، تشہد اور درود پڑھتے ہیں؛ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی اپنے اعضاء کے ذریعہ انجام دیتا ہے، اور یہ جسمانی عبادت ہے۔ روزہ بھی جسمانی عمل ہے، جو شریعت نے ہم پر فرض کیا ہے۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اس میں بھی آدمی کے بدن کا کچھ حصہ لگتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو ادا کرتا ہے۔ حج میں پہنچنے کے لیے مال کو کام میں لایا جاتا ہے، وہاں پہنچنے کے بعد جو

مناسک و افعال ادا کئے جاتے ہیں وہ بھی تمام جسم ہی کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں تو جسمانی اعمال میں بہت سارے اعمال فرض و واجب کا درجہ رکھتے ہیں، اور شریعت کی طرف سے ان کو فرائض کی حیثیت دی گئی ہے جن کو بجالانا ضروری ہے۔

اسی طرح جسمانی اعمال میں بعض ایسے ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، مثلاً: شراب پینا، چوری کرنا، زنا کرنا، اور بھی بہت سارے کام ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اگر کوئی آدمی وہ کام کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

روحانی اعمال میں فرائض و محرمات

اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی کچھ اعمال ایسے ہیں جن کو انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اور وہ فرض کا درجہ رکھتے ہیں۔ تو وضع فرض کا درجہ رکھتی ہے۔ شکر فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ صبر فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی طریقہ سے اور بھی باطنی صفات ہیں جو فرائض کا درجہ رکھتی ہیں، جیسے: زہد، اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کے اوپر توکل و اعتماد رکھنا اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے رجاء اور امید قائم رکھنا، اللہ تعالیٰ کا خوف اور ڈر؛ یہ سب وہ روحانی صفات ہیں جو فرائض کا درجہ رکھتی ہیں، اور ان کا حاصل کرنا آدمی کے لیے ضروری ہے۔

اسی طریقہ سے روحانی کچھ صفات ایسی ہیں جو ذمہ اور بری کہلاتی ہیں، ان سے بچنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح زنا، چوری، شراب نوشی اور دیگر برے افعال سے بچنا ضروری ہے، جیسے یہ حرام کام ہیں، اسی طرح حسد حرام ہے، تکبر حرام ہے، کینہ و بغض رکھنا حرام ہے، دنیا کی محبت رکھنا حرام ہے، مال اور جاہ کی محبت حرام ہے، اسی طرح بقیہ صفات ذمہ جتنے بھی ہیں ان تمام کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ سب ”اخلاق“ کہلاتے ہیں جن کا تعلق روح اور دل سے ہے، ظاہری جسم سے یہ کام انجام نہیں دیئے جاسکتے، بلکہ یہ سب اندرونی چیزیں ہیں۔ یعنی آدمی تو وضع جسم سے

انجام نہیں دے سکتا۔ تو اضع کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی صرف سر کو جھکا دے، یا اپنے سینے کو کسی کے سامنے موڑ دے، یا ہم جس کو خاطر تو اضع سے تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی مہمان آیا ہو، تو اس کی خدمت کر لی جائے؛ یہ تو اضع نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ پہلے بتلادیا تھا کہ آدمی اپنے آپ کو کم درجہ اور کمتر سمجھے؛ اس کا نام تو اضع ہے، اور اس کا تعلق دل سے ہے، ظاہری اعضاء سے نہیں ہے۔

اسی طریقہ سے شکر ہے، تو دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے صبر، زہد و توکل ہے، امید رکھنا، اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا؛ یہ ساری چیزیں آدمی کے ظاہری جسم سے تعلق نہیں رکھتی ہیں، بلکہ ان سب کا تعلق دل سے ہے۔ اسی طرح اخلاص بھی دل اور روح سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، اعضاء سے تعلق رکھنے والی چیز نہیں ہے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو آدمی کے جتنے بھی ظاہری اعمال ہیں، ان کے اندر بھی اخلاص کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ نماز، روزہ وغیرہ بڑی بڑی عبادتوں میں بھی اگر اخلاص نہیں ہے تو اس صورت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں وہ سب قبول تو کیا ہوتیں، ان پر ثواب تو کیا ملتا؛ اُلٹا ان کی وجہ سے سزا ہوگی اور جہنم میں بھیجا جائے گا۔

لینے کے دینے

حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے تین آدمیوں کو بلا یا جائے گا، ایک شہید، دوسرا قاری اور تیسرا وہ آدمی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا تھا۔ اور ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں یہ نعمتیں دی تھیں، ان میں تم نے کیا کیا؟ ہر ایک اپنا عمل بتلائیں گے۔ مالدار کہے گا: نیسیکی کا کوئی کام اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں میں نے خرچ نہ کیا ہو۔ اس سے کہا جائے گا: ٹھیک ہے، لیکن تمہاری نیت یہ تھی کہ لوگ سخی کہیں، دل کے اندر

شہرت کی نیت تھی، تم چاہتے تھے کہ تمہاری شہرت اور نیک نامی ہو۔
 شہید سے کہا جائے گا: ہم نے تمہیں جسمانی صحت و قوت دی تھی، شجاعت و بہادری
 دی تھی، اس کو تم نے کہاں استعمال کیا؟ وہ کہے گا: باری تعالیٰ! تیرے راستے میں تیرے
 کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑتا رہا، یہاں تک کہ جان تک قربان کر دی۔ اس سے بھی یہی
 کہا جائے گا: یہ سب تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ تیری تعریف کریں کہ بڑا بہادر تھا۔
 قاری اور عالم سے پوچھا جائے گا: ہم نے علم جیسی نعمت دی تھی، اس میں کیا عمل
 کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں نے علم پھیلا یا، پڑھا اور پڑھایا۔ اس سے بھی
 کہا جائے گا کہ یہ سب اس لیے کیا تھا، تاکہ لوگ بڑا عالم کہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اخلاص
 نہیں تھا۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ سب سے پہلے انہیں کو جنم کے اندر بھیجا جائے گا۔
 تو دیکھو! اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے اعمال اللہ تعالیٰ کے
 یہاں قابل قبول نہیں ہوئے، بلکہ ان کے اوپر سزا کا فیصلہ ہوا۔

حاصل کلام

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ تمام باطنی اعمال روح و قلب سے تعلق رکھتے ہیں، جن
 کو ”اخلاق“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جب تک یہ درست
 نہ ہوں گے، وہاں تک ظاہری اعمال کے اندر بھی جان نہیں آئے گی۔ ظاہری اعمال کی
 قبولیت اور ان کا درست ہونا، ان کے اندر اثر کا پیدا ہونا؛ یہ ساری چیزیں باطنی اخلاق
 پر متوقف ہیں، اگر وہ اچھے ہوں گے تو ظاہری اعمال بھی اچھے ہوں گے، اور اگر وہ
 بگڑ گئے تو ظاہری اعمال بھی بگڑ جائیں گے۔ اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی کی طرف
 خاص طور پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

خُلُقِ عَظِيمٍ

ایک آیت پیش کی ہے: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ حضور پاک ﷺ کو باری تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آپ کو عظیم اخلاق پر پیدا کیا گیا ہے، یعنی کسی انسان میں اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق جتنے بھی ہو سکتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اعلیٰ اخلاق سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے، اور آپ کی ذات کو دنیا والوں کے لیے نمونہ بنایا ہے۔

غصہ پینا، معاف کرنا

﴿وَالكَاطِبِينَ الْعَظِيمِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ غصہ کو پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ عفو و درگزر یعنی کسی کو معاف کر دینے کا جذبہ ہونا اور غصہ کو پی جانا؛ یہ دل کے اندر ہوتا ہے۔ غصہ دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، لیکن اس کے ظاہری آثار ہوتے ہیں کہ آدمی کو جب غصہ آئے گا تو اس کا چہرہ سرخ ہو جائے گا، رگیں پھول جائیں گی، بکواس کرنا شروع کر دے گا، کبھی ہاتھ بھی اٹھا دے گا، آگ بگولہ ہو جائے گا؛ یہ سب اس کے آثار اور نشانیاں ہیں۔ اصل چیز تو دل کے اندر ہے یعنی غصہ۔ اور غصہ کو بڑی بری چیز قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر گیا کہ ایک آدمی نے آ کر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: ﴿لَا تَغْضَبْ﴾ غصہ مت کرنا۔ دوبارہ پوچھا تو بھی یہی تاکید فرمائی۔ تیسری مرتبہ پوچھا تو پھر یہی تاکید فرمائی۔ (بخاری شریف: ۶۱۱۱، باب الْحَدِيثِ مِنَ الْغَضَبِ)

ازالہ نہیں، امالہ

غصہ ان چیزوں میں سے ہے جن کا تعلق انسان کے باطن سے ہے، اور کوئی آدمی اگر غصہ کو ختم کرنا چاہے تو وہ ختم بھی نہیں ہو سکتا۔ جن اوصاف کو اللہ تعالیٰ نے آدمی

کے اندر فطرتاً پیدا کیے ہیں ان کے بارے میں شریعت کا مقصود یہ ہے کہ ان کا امالہ کر دیا جائے یعنی ان کو صحیح رخ پر موڑ دیا جائے، ان کا ازالہ مقصود نہیں ہوتا۔ اگر آدمی کی طبیعت میں غصہ نہیں ہوگا تو کافروں کے ساتھ مقابلہ کیسے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاد کا حکم دیا ہے، وہاں بات کیسے بنے گی؟ برائی کے کاموں سے روکنے کے لیے بھی غصہ کی ضرورت رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ صفت آدمی کے اندر ہونی چاہیے، البتہ اس کا رخ صحیح کر دیا جائے، اپنی ذات کے لیے اس کو استعمال کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے متعلق حدیث پاک میں آتا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی آدمی بدسلوکی کرتا تھا تو حضور ﷺ کبھی بدلہ اور انتقام نہیں لیتے تھے، لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑا جا رہا ہوتا تو حضور اکرم ﷺ کو ایسا غصہ آتا تھا کہ کوئی بھی سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ غصہ کا بھی صحیح مصرف ہے۔

اسی طرح آدمی کے اندر خرچ کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے، اب وہ آدمی اگر اس جذبہ کو فضول خرچی میں استعمال کرے گا، تو گنہگار ہوگا۔ اس لیے خرچ کرنے والی اس صفت کو اگر وہ آدمی نیکی کے کاموں میں استعمال کر لے تو کارآمد ہے۔

یا خرچ نہ کرنا جس کو بخل کہا جاتا ہے وہ بھی طبیعت کے اندر کا ایک جذبہ ہے جو انسان کو خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ اگر انسان اسی جذبہ کو اس طرح استعمال کرے کہ گناہ کے کاموں میں خرچ کرنے سے اپنے آپ کو بچائے رکھے، تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ہاں! نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے روکے گا؛ تو یہ بری چیز ہے۔

اسی طرح آدمی کے دل میں ایک چیز شہوت رکھی گئی ہے۔ اگر شہوت ہی نہ ہو تو بیوی کا حق کیسے ادا کرے گا؟ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو آدمی کے اندر ہونا چاہیے، لیکن اگر اس کو غلط جگہ استعمال کرتا ہے تو گناہ میں مبتلا ہوگا، اس لیے اس کے رخ کو صحیح طرف پھیر

دیا جائے؛ اسی کو امالہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو اچھی چیزیں ہیں ان کو اچھے مصارف میں استعمال کرے۔ اور جو بری چیزیں ہیں ان کا رخ بھی اچھے مصارف کی طرف موڑ دے، اور آدمی صحیح طریقہ سے ان کو استعمال کرنا سیکھ جائے۔ امالہ کا مطلب ہی یہ ہے: رخ کو صحیح کر دینا، اور اس صلاحیت کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا، غلط جگہ استعمال کرنے سے بچالینا۔ کسی بھی صفت کا ازالہ نہیں بلکہ امالہ مقصود ہے۔

نفس پر قابو پانے کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی کوئی بات کہی، تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ آ گیا، اس کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا تو اس نے سیٹے ہی لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرہ پر تھوک دیا، تو وہ فوراً اس کے سینے سے اتر گئے۔ کسی نے کہا: اس نے جب آپ پر تھوک دیا تو یہ تو اس سے انتقام لینے کا اور زیادہ موقع تھا، آپ نے اس کو چھوڑ کیوں دیا؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: پہلے جب اس کو میں نے پچھاڑا تھا وہ اس لیے کہ اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی بات کہی تھی، لیکن جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرا نفس طیش میں آ گیا، اب اگر میں اس کے ساتھ کچھ کرتا تو گویا میں اپنی ذات کے لیے انتقام لیتا، اور شریعت اس بات کی تعلیم نہیں دیتی، شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ تمہاری ذات کا معاملہ ہو تو درگزر کر دو۔

اچھے اخلاق کی تکمیل

۶۲۱:- وعن أنس رضي الله عنه قال: كان رسول الله ﷺ أحسن الناس خلقاً.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اخلاق کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے بہتر تھے۔

افادات:- بلکہ آپ ﷺ تو دنیا کو اخلاق سکھانے ہی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: «بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ» میں اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں۔ اچھے اخلاق کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ ہو سکتا ہے وہ نبی کریم ﷺ نے امت کے سامنے پیش کیا۔

حضور اکرم ﷺ کے اوصاف و اخلاق

۶۲۲:- وَعَنْهُ، قَالَ: مَا مَسِسْتُ دِيْبًا جَا وَلَا حَرِيرًا أَلْيَيْنَ مِنْ كَفِّ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَلَا شَمَمْتُ رَائِحَةً قَطُّ أَطْيَبَ مِنْ رَائِحَةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَلَقَدْ خَدَمْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَشْرَ سِنِينَ، فَمَا قَالَ لِي قَطُّ: أَفٍّ، وَلَا قَالَ لِي شَيْءٍ فَعَلْتُهُ؛ لِمَ فَعَلْتَهُ؟ وَلَا لَشَيْءٍ لَمْ أَفْعَلْهُ؛ أَلَا فَعَلْتِ كَذَا؟ (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی طرح کا ریشم، نہ موٹا، نہ مطلق ریشم، نہ نبی کریم ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم نہیں چھویا۔ اور حضور ﷺ کی خوشبو سے زیادہ اچھی خوشبو میں نے کبھی نہیں سونگھی۔ اور میں نے نبی کریم ﷺ کی دس سال تک خدمت کی، کبھی آپ ﷺ نے مجھے آف نہیں فرمایا۔ اور نہ کرنے جیسا کوئی کام کیا ہو تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا۔ اور جو کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور نہیں کیا، تو اس پر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں نہیں کیا۔

افادات:- آپ ﷺ کی ہتھیلی ریشم سے بھی زیادہ نرم و گداز تھی۔ ویسے آپ کا جسم کسا ہوا اور مضبوط تھا، اس کے باوجود اس میں نرمی تھی، چھونے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ریشم سے زیادہ نرم ہے۔

مجسم خوشبو

قدرتی طور پر آپ ﷺ کے جسم مبارک میں سے خوشبو مہکتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ خوشبو کا استعمال بھی کثرت سے فرماتے تھے، لیکن قدرتی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے پسینے کے اندر خوشبو رکھی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ دوپہر کے وقت حضور ﷺ میرے یہاں ایک چمڑے پر لیٹے ہوئے تھے، آپ کا پسینہ نکلا، میں اس کو ایک بوتل میں جمع کرنے لگی، حضور اکرم ﷺ کی آنکھ مبارک کھلی تو مجھ سے پوچھا: یہ کیا کر رہی ہو؟ میں نے عرض کیا: آپ کا پسینہ جمع کر رہی ہوں، اس سے زیادہ اچھی خوشبو اور کوئی نہیں ہے، اور اس کو ہم اپنی خوشبوؤں میں ملاتے ہیں۔ آدمی کے پاس کم درجہ کی خوشبو ہو، پھر اعلیٰ درجہ کی کوئی خوشبو مل جائے تو وہ اس کو اپنی خوشبو کے اندر ملا لیتا ہے، اور اس طرح اپنی کم درجہ کی خوشبو کو بھی اعلیٰ درجہ کی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے جسم اطہر میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے قدرتی طور پر خوشبو پیدا فرمائی تھی۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ آپ ﷺ جب کسی گلی سے گزر جاتے، تو بعد میں وہاں سے گزرنے والا اس خوشبو سے جان لیتا تھا کہ حضور پاک ﷺ یہاں سے گزرے ہیں۔ کسی بچے کے سر پر اگر آپ ہاتھ پھیر دیتے، تو دن بھر اس کے سر سے خوشبو آتی تھی۔ کسی سے مصافحہ کر لیتے تھے تو اس کے ہاتھوں سے خوشبو آتی رہتی تھی۔ آپ ﷺ کے جسم اطہر میں اللہ تعالیٰ نے ایسی عمدہ خوشبو رکھی تھی۔

خادم خاص کا تجربہ

حضور اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے حضرت ابوطالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے - جو حضرت انسؓ کے سوتیلے والد ہوتے ہیں - کہا کہ کوئی

چھوٹا بچہ ہو تو اس کو ہمارے حوالہ کر دو کہ ہمارے گھر کے کام کاج میں مدد کرے اور خدمت کر دیا کرے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میری عمر دس سال تھی، حضرت ابوطلمحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے اپنے پیچھے اونٹ پر سوار کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپ کے حوالہ کیا کہ یہ ہمارا بچہ ہے، آپ اس کو اپنی خدمت کے لیے قبول فرمائیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔

بچوں کی عادت تو سب جانتے ہی ہیں کہ ان کا جو کام ہوتا ہے وہ از خود تو کرتے نہیں ہیں، بڑوں کو دیکھ بھال اور نگرانی کر کے کام کروانا پڑتا ہے۔ بحسناری شریف کی روایت میں ہے، خود حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میری والدہ، نانی اور خالہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں خدمت کے لیے جانے کی مجھ سے پابندی کرواتی تھیں اور یاد دلا کر مجھے بھیجتی تھیں، جیسے گھر والے بچوں کو مدرسہ اور اسکول بھیجتے ہیں۔ گویا ان کی والدہ، نانی، خالہ وغیرہ تاکید کے ساتھ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بھیجتی تھیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دس سال کی عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لگے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک (یعنی دس سال) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر بیس سال تھی، اور ظاہر ہے کہ دس سال کا بچہ خدمت کرنے میں کوتاہی تو ضرور کرے گا۔ جب بڑی عمر والے کوتاہی کرتے ہیں تو پھر چھوٹوں سے کیوں نہیں ہوگی۔ لیکن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ان دس سالوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجھے اُف نہیں فرمایا۔ نہ کرنے کا کام کیا ہو، تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ”یہ کام کیوں کیا“۔ اور جو کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور نہیں کیا، تو اس پر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ”ایسا کیوں نہیں کیا“۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس میں دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اخلاق کو بتلانا

مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس عمر میں آپ کی خدمت کر رہے تھے، اس میں یہ بات قرین قیاس، بلکہ ضروری ہے کہ ان سے کوتاہی ہوئی ہی ہوگی۔ بلکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ کبھی حضور اکرم ﷺ مجھے کسی کام کے لیے بھیجتے تھے، تو میں راستہ میں کھیل یا کوئی چیز دیکھنے کے لیے کھڑا ہو جاتا اور دیکھنے میں مشغول ہو جاتا، حضور اکرم ﷺ پیچھے سے آ کر میرا کان پکڑ کر فرماتے کہ تم کو تو وہاں بھیجا تھا، یہاں کیوں کھڑے ہو؟ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کبھی بچپن کی وجہ سے میں یوں کہہ دیتا: میں وہاں نہیں جاؤں گا، حالاں کہ دل میں ہوتا کہ جاؤں گا، تب بھی حضور ﷺ کچھ نہیں فرماتے تھے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کے اخلاق تھے، حالاں کہ عام طور پر اپنے خادم کے ساتھ مخدوم کا جو معاملہ ہوتا ہے وہ سب جانتے ہیں۔

اخلاق کی بلندی

۶۲۳:- وعن الصعب بن جثامة رضي الله عنه قال: أهديت رسول الله ﷺ جماراً وحشياً، فردّه عليّ، فلبّار أي مافي وجهي، قال: إن الله نردّه عليك إلا لأثار حرم. ترجمہ:- حضرت صعّب بن جثامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک جنگلی گدھا (زندہ شکار کر کے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول نہیں فرمایا (حضور اکرم ﷺ کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے میرے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہوئے) جب میرے چہرے پر آپ ﷺ نے اس کا اثر دیکھا تو فرمایا: ہم حالتِ احرام میں ہیں، اس لیے ہم نے اس کو واپس کیا ہے (اور کوئی وجہ نہیں ہے)

افادات:- پالتو گدھا کھانا تو حرام ہے، لیکن جنگلی گدھا کھانا حلال ہے، اور چوں کہ جو آدمی حالتِ احرام میں ہوتا ہے وہ نہ تو شکار کر سکتا ہے اور نہ شکار کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اور کسی بڑے آدمی کے پاس بڑی محبت کے ساتھ کوئی ہدیہ لے کر

جائیں اور وہاں قبول نہ ہو، تو دل پر اثر ہوتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کے ہدیہ کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت پر کچھ ناگواری محسوس کی تو بطورِ معذرت کے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہم حالتِ احرام میں ہیں۔ یہ آپ ﷺ کے اخلاق کے بلندی کی بات ہے۔ جو آدمی بااخلاق ہوتا ہے اس کو سامنے والے کی ذرا سی بات کا بھی فوری طور پر احساس ہوتا ہے، اور اگر اپنی طرف سے اس کو کوئی ایسی بات پیش آئی ہو تو پھر وہ اپنے اخلاق کے ذریعہ سے اس کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

نیکی اور گناہ کیا ہے؟

۶۲۴- وعن الثَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الْبِدْءِ وَالْإِثْمِ، فَقَالَ: الْبِدْءُ: حُسْنُ الْخَلْقِ وَالْإِثْمُ: مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق ہیں۔ اور گناہ جو تمہارے دل میں کھٹکے، اور تم یہ ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو۔

افادات:- جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اچھے اخلاق کا تعلق آدمی کے دل سے ہے، جب کسی کے دل میں اچھی صفات ہوں گی تو اس کے اعمال میں بھی ان کا ظہور ہوگا۔ گویا اچھے اخلاق ہی نیکی کی جڑ ہیں، اسی لیے اخلاقِ فاضلہ اعمالِ صالحہ سے بھی مقدم ہیں، جب تک اخلاق صحیح نہیں ہوں گے تب تک اعمال میں صلاح اور درستگی نہیں آسکتی۔ اگر ان کے بغیر ظاہری طور پر اچھے اعمال کرتا بھی ہے، اور دیکھنے والوں کو اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں؛ تب بھی اخلاق کے نادرست ہونے کی وجہ سے وہ سارے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام حاصل نہیں کرتے۔

اور دوسری بات حضورِ اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جو تمہارے دل کے اندر کھٹکے، اور جس کام کے متعلق تم یہ ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو؛ وہ گناہ ہے۔ گویا تمہارے دل کے اندر کسی کام کے چھپانے کا خیال پیدا ہونا، اور دل کی کھٹک اس کے گناہ ہونے کی علامت ہے۔

بہترین لوگ

۶۲۵:- عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما قال: لَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا، وَكَانَ يَقُولُ: إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا. ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نہ تو فحش گو تھے، اور نہ بہ تکلف فحش گوئی کرنے والے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں۔

افادات:- "فَاحِشٌ" یعنی طبعی و فطری طور پر آدمی کا مزاج ہی فحش باتیں بولنے کا ہو۔ اور "مُتَفَحِّشٌ" یعنی فطری طور پر تو اس کے مزاج اور طبیعت میں فحش گوئی نہیں ہے، لیکن کبھی دوستوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی کوئی بات زبان سے نکال دیتا ہے حضورِ اکرم ﷺ نہ تو طبعی طور پر فحش گو تھے اور نہ کبھی بہ تکلف فحش گوئی کرتے تھے۔

اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں

۶۲۶:- وعن أبي الدرداء رضي الله عنه أن النبي ﷺ قال: مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلَ فِي مِيزَانِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وَإِنَّ اللَّهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَدِيئِيَّ. ((الْبَدِيئِيُّ)) هُوَ الَّذِي يَتَكَلَّمُ بِالْفَحِشِ وَرَدِيَءِ الْكَلَامِ.

ترجمہ:- حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز آدمی کے ترازو میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ فحش گوئی کرنے والے بد زبان آدمی کو پسند نہیں کرتا۔

افادات:- جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اعمال میں بھی وزن اور قبولیت اخلاق ہی سے آتی ہے، اور اخلاق میں سے ایک صفت اخلاص بھی ہے کہ کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتا۔ تو اچھے اخلاق آدمی کے ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز ثابت ہوں گے۔

دو جنتی عمل

۶۷:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: سئل رسول الله ﷺ عن أكثر ما يدخل الناس الجنة؟ قال: تقوى الله وحسن الخلق. وسئل عن أكثر ما يدخل الناس النار؟ فقال: الغم والفرج.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: وہ کونسی چیز ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنت میں لے جائے گی؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: گناہوں سے بچنا اور اچھے اخلاق۔ اور آپ ﷺ سے پوچھا گیا: لوگوں کو سب سے زیادہ جہنم میں لے جانے والی چیز کونسی ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: منہ اور شرمگاہ۔

افادات:- تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا ڈر۔ جس کے نتیجے میں آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائے۔ اور اچھے اخلاق؛ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو کثرت سے آدمی کو جنت میں لے جائے گی۔

منہ میں زبان کی بے احتیاطیاں بھی آ جاتی ہیں، کھانے پینے کے معاملہ میں جو

بے احتیاطیاں ہوتی ہیں، وہ بھی اس میں آجاتی ہیں۔ دوسری چیز شرمگاہ: ان دو اعضاء کی بے احتیاطی کی وجہ سے عموماً آدمی جہنم میں جاتا ہے۔ اسی لیے بخاری شریف کی روایت ہے، نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: «مَنْ يَلْظُمُنْ لِي مَمَاتَيْنِ لِحَيْيْتِهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ» جو آدمی مجھے اپنے اس عضو کی جو اس کے دونوں جبرٹوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور جو دونوں ٹانگوں کے درمیان میں ہے (یعنی شرمگاہ) کی گارنٹی دے (کہ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں کرے گا) تو میں ایسے آدمی کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں (بخاری شریف، باب حفظ اللسان: ۶۳۷۴) حدیث پاک میں آتا ہے کہ لوگوں کو کثرت سے جہنم میں لے جانے کا ذریعہ زبان ہی کی کاٹی ہوئی کھیتیاں بنیں گی۔ (ترمذی) منہ سے مراد زبان بھی ہو سکتی ہے، اور دوسری بے احتیاطیاں بھی اس میں آجاتی ہیں۔

کامل ایمان والے

۶۲۸:- وعنه قال قال رسول الله ﷺ: أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخَيْرًا كُمْ خَيْرًا كُمْ لِنِسَائِهِمْ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح) ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان والوں میں مکمل ایمان والے لوگ وہ ہیں جو اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہوں، اور تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہیں۔

افادات:- آدمی کے اخلاق کا سب سے بڑا ظہور بیویوں کے معاملہ میں ہوتا ہے، اس لیے کہ ان سے چوبیس گھنٹے واسطہ پڑتا ہے، اور جس سے زیادہ واسطہ پڑتا ہو، اسی کے سامنے آدمی کی خوبیاں اور برائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ جن سے واسطہ کم پڑتا ہے، ان کے سامنے یہ چیزیں اتنی زیادہ نہیں آتیں، اسی لیے جو لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے زیادہ اچھے ہیں وہ لوگوں میں بھی سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ اگر آدمی

کے اخلاق کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہو، لیکن اس کے گھر والوں کو شکایت ہو؛ تو ایسے اخلاق کس کام کے؟ جیسے: کسی آدمی کی سخاوت کی دنیا میں دھوم مچی ہو اور اس کے گھر والے بھوکے مرتے ہوں، تو لوگ کیا کہیں گے کہ ساری دنیا اس کے دسترخوان پر کھاتی ہے تو کیا ہوا، خود اس کے گھر والے تو محروم ہیں۔ اسی طرح اگر تمہارے احساق سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، آپ کی تعریف کر رہے ہیں، لیکن تمہارے گھر والوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچتا؛ تو پھر بات کیسے بنے گی۔ اسی لیے فرمایا کہ تم میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھے وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھائی سے پیش آتے ہیں۔ اور بیوی کی طرف سے ناگوار باتیں کثرت سے پیش آتی رہتی ہیں، اس لیے جو آدمی اخلاق کے اعتبار سے زیادہ کامل ہوگا، وہی اس محاذ پر فاتح بن سکے گا۔

اچھے اخلاق والوں کا مقام

۶۲۹:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن

المؤمن ليذكرك بحسن خلقه درجة الصائم القائم. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد

فرماتے ہوئے سنا: ایمان والا اپنے اچھے اخلاق کے ذریعہ؛ ہمیشہ روزہ رکھنے والے اور رات بھر قیام کرنے والے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

افادات:- آدمی مسلسل روزے رکھ کر اور رات بھر قیام کر کے اللہ تعالیٰ

کے یہاں جو اجر و ثواب حاصل کرتا ہے، وہی اجر و ثواب، وہی مقام و مرتبہ اچھے اخلاق سے بھی حاصل کر سکتا ہے۔

تین آدمی، تین گارنٹی

۶۳۰:- وعن أبي أمامة الباهلي رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: أنا

زَعِيمٌ بَبِيَّتٍ فِي رَبْضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْبِرَاءَ، وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا. وَبَبِيَّتٍ فِي وَسْطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ، وَإِنْ كَانَ مَا زِحًا. وَبَبِيَّتٍ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَنَ خُلُقَهُ. (حدیث صحیح، رواہ أبو داود و بیہقی صحیح) ((الزَّعِيمُ)): الضَّامِنُ.

ترجمہ:- حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے؛ میں اس کو جنت کے کنارے پر ایک مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔ اور جو شخص جھوٹ کو چھوڑ دے، چاہے مذاق ہی میں کیوں نہ ہو؛ میں اس کو جنت کے بیچ میں مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔ اور جس کے اخلاق اچھے ہوں؛ میں اس کے لیے جنت کے اونچے درجہ پر مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔

افادات:- جہاں بھی کوئی معاملہ ہوتا ہے، اس میں ایک آدمی حق پر ہوتا ہے۔ دوسرا ناقص اس سے جھگڑتا ہے۔ حق پر ہونے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ مقدمہ بازی کر کے بھی اپنا حق وصول کرے، اس کے باوجود وہ جھگڑا چھوڑ دے، اپنا حق جانے دے؛ ایسے آدمی کے لیے حضور اکرم ﷺ جنت کے کنارے پر مکان دلانے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

حضور ﷺ کی نگاہوں میں محبوب اور قریب جگہ پانے والے

۶۳۱:- وعن جابر بن عبد الله عن رسول الله ﷺ قَالَ: إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ، وَأَقْرَبَكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، أَحْسَبْنَكُمْ أَخْلَاقًا. وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ، وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي يَوْمَ الْقِيَامَةِ، التُّرْتَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ وَالْمُتَفَهِّقُونَ. قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَدْ عَلِمْنَا التُّرْتَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ، فَمَا الْمُتَفَهِّقُونَ؟ قَالَ: الْمُبْتَكَرُونَ. (رواه الترمذی)

ترجمہ:- حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ اور میری نگاہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ ہیں جو بہ تکلف بہت زیادہ بولنے والے، لوگوں پر اپنی باتوں کے زور سے چڑھ بیٹھنے والے اور زیادتی کرنے والے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ”قَرَّتْ أَرْوُن“ اور ”مُتَشَدِّدٌ قَوْن“ کو تو ہم جانتے ہیں؛ لیکن ”مُتَقَبِّهِتُون“ کون لوگ ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تکبر کرنے والے۔

افادات:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں محبوب اور قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب جس کو جگہ ملے گی؛ وہ اچھے اخلاق والے ہیں اور تکبر کرنے والا اپنی باتوں میں بڑے بڑے الفاظ استعمال کر کے لوگوں پر اپنی دھونس جمانا اور رعب بٹھانا چاہتا ہے، ایسے لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہیں، اور قیامت کے روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ دور ہوں گے۔

عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ سے حسنِ خلق کی تفسیر یہ نقل کی گئی ہے: ”طلاقة الوجه، وبذل المعروف، وكف الأذى“ مسکراتا ہوا چہرہ، اچھی چیز خرچ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا۔

باب الحلم والانیاءة والرفق

حلم، وقار اور نرمی

﴿ مجلس ۱ ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ حلم، وقار، نرمی

باب کا عنوان قائم کیا ہے: ”حلم“ یعنی بردباری و تحمل۔ اور ”اناءة“، یعنی سنجیدگی و وقار۔ اور ”رفق“، یعنی نرمی۔

”حلم“ کا مطلب یہ ہے کہ خلاف مزاج کوئی بات پیش آئے تو بجائے غصہ ہونے کے اس کو برداشت کر جانا، سامنے والے کے ساتھ غصہ والا معاملہ کرنے کے بجائے برداشت کر کے بھلائی والا معاملہ کرنا۔ خلاف مزاج چیز برداشت کرنے کو عربی میں ”حلم“ اور اردو میں ”بردباری“ کہتے ہیں۔

”اناءة“ کا مطلب ہے: کسی بھی کام کو اطمینان کے ساتھ انجام دینا، جلد بازی سے کام نہ لینا، جس کو گجراتی میں (W&I) کہتے ہیں۔ اور ”رفق“ کا معنی ”نرمی“ ہے۔

یہ تین اوصاف ہیں۔ عام طور پر آدمی جب غصہ میں آتا ہے تو ان تینوں کے خلاف باتیں وجود پذیر ہوتی ہیں، اس لیے اصل تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو غصہ سے بچائے۔ اس سلسلے میں آگے روایتیں بھی آئیں گی، پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کچھ ارشادات ذکر کئے ہیں۔

سب سے عمدہ گھونٹ

﴿وَالكَافِرِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں ﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔ جب آدمی کو غصہ آئے تو اس کے تقاضہ کو پورا کرنے کے بجائے اس کو

دبائے اور غصہ پی جائے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ سب سے عمدہ گھونٹ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، وہ غصہ کو پینا ہے۔ تو غصہ کو پینا، دبانا اور لوگوں سے درگزر کرنا؛ یہ بہت عمدہ اوصاف ہیں۔ اس لیے کہ غصہ آدمی کو انتقام اور بدلہ لینے پر آمادہ کرتا ہے، اور معاف کر دینا بلکہ معاف کر دینے کے بعد مزید اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا؛ یہ بہت ہی اونچی صفت ہے۔

جا! تجھے آزاد کیا

حضرت امام زین العابدین علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دسترخوان پر تشریف فرما تھے، غلام کھانے کی کوئی گرم گرم چیز لے کر آیا، اس کے ہاتھ سے وہ برتن چھوٹا اور وہ ان کے ایک بچے کے اوپر گرا، وہ جل گیا، انہوں نے خشمگیں ننگا ہوں سے غلام کی طرف دیکھا، تو غلام نے فوراً پڑھا: ﴿وَالْكَافِرِينَ الْغَيْظُ﴾ یہ سن کر انہوں نے ننگا ہیں جھکالیں۔ اس نے آگے پڑھا: ﴿وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ انہوں نے کہا: میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اس نے آگے پڑھا: ﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ انہوں نے فرمایا جا! میں نے تجھے آزاد کر دیا۔

یہ حضرات کیسے اونچے اوصاف کے حامل تھے! قرآن وحدیث کی تعلیمات کی اصل چیز جو ہم لوگوں کے سمجھنے اور اختیار کرنے کی ہے؛ وہ یہی ہے۔ حضرات صحابہ تابعین اور اسلاف کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ایسے مواقع پر جب کوئی نصیحت، یا مترآن وحدیث کے حوالہ سے کوئی بات پیش کی جاتی تو وہ اپنے نفس کے تقاضوں کو اسی وقت چھوڑ دیتے تھے اور فوراً اس پر عمل کرتے تھے، اپنی طبیعت ومزاج کے خلاف فوراً ان چیزوں کے اوپر عمل کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایسے بے شمار واقعات حضرات صحابہ

کرام کی زندگی میں ملیں گے کہ کسی بات پر ناراض ہو کر۔ چاہے وہ ناراضگی حق بجانب ہی ہو۔ انہوں نے کوئی اقدام کیا، لیکن جب اس پر متنبہ کیا گیا تو وہ فوراً باز آ گئے۔

کوئی بااعتدال، کوئی بدحال

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ پہلے بھی گزرا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو آپ کی صاحبزادی اور نبی کریم ﷺ کی لاڈلی زوجہ مطہرہ تھیں، ان پر جب منافقین نے تہمت لگائی، اس پر وپیگنڈے میں کچھ مخلص مؤمنین بھی پھنس کر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے، انہیں میں حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، جن کی والدہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ حضرت مسطحؓ غریب تھے، رشتہ دار تھے، مہاجر تھے، نیز غزوہ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے، اور حضرت ابو بکرؓ ان کا سارا خرچہ برداشت کرتے تھے۔

ان حضرات کی انصاف پسندی اور مزاج کا اعتدال دیکھئے! جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت والا معاملہ پیش آیا تو جن حضرات کا اس میں ابتلاء و آزمائش ہوئی تھی ان کے ساتھ انہوں نے کیا معاملہ کیا اور کب کیا؟ حصہ لینے والی بات تو پہلے ہو چکی تھی لیکن محض ان کے حصہ لینے پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کوئی اقدام نہیں کیا اور کوئی ایکشن نہیں لیا، جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے قرآن پاک میں حضرت صدیقہؓ کی براءت اور ان کا اس تہمت سے پاک ہونا نازل ہوا، اور بات صاف ہو گئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جو باتیں چلائی گئی تھیں وہ تہمت اور پروپیگنڈہ تھا، اب ان لوگوں کا مجرم ہونا بالکل واضح ہو گیا، تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان پر ایکشن لیا۔ اس لیے کہ کوئی آدمی اگر کسی کے متعلق کوئی بات کہتا ہے تو اس میں دونوں پہلو

ہو سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ اگر سچا ہو تو غلطی کی اصلاح ہونی چاہیے، لیکن جھوٹا ہونا ثابت ہو جانے کے بعد تو کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ اور ہم لوگوں کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ سچا ہوتا بھی ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ پہلے ہی کر لیتے ہیں یعنی اس نے جو بات کہی ہے وہ سچی ہے تب بھی ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اپنی اصلاح نہیں کرتے، بلکہ اسی کے خلاف ایکشن لیتے ہیں۔ یہاں غور کیجئے کہ محض اس معاملہ کے پیش آنے پر حضرت ابو بکر صدیق نے کچھ نہیں کیا، بلکہ ان پر خرچ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا، جب قرآن پاک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کی آیتیں نازل ہوئیں اور بات صاف ہو چکی کہ جو لوگ اس میں حصہ لینے والے تھے، سب بہت ان تراش تھے، ان کی طرف سے یہ غلط حرکت ہوئی ہے، تب حضرت ابو بکر صدیق نے قسم کھائی کہ میں ان پر خرچ نہیں کروں گا۔

اس موقع پر علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پر خرچ نہ کرنے کی جو قسم کھائی اس میں بظاہر دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی صاحبزادی تھیں، اور دوسری یہ کہ حضور اکرم ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں، اور ان کے نہ خرچ کرنے کی قسم کھانے کی دراصل علت یہی تھی کہ حضور اکرم ﷺ کی زوجہ مطہرہ کے ساتھ انہوں نے ایسا معاملہ کیا تھا۔ خیر! ان کا خرچہ بند کر دیا اور قسم کھالی کہ آئندہ ان پر خرچ نہیں کروں گا، اس پر قرآن پاک میں باری تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةَ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ تم میں جو فضیلت اور وسعت والے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کو باطنی کمالات سے نوازا رکھا ہے اور مالی وسعت بھی دے رکھی ہے) وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، غریبوں، اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے

والوں پر خرچ نہیں کریں گے۔ حضرت مسطح رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ تینوں باتیں تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رشتہ دار بھی تھے کہ خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، غریب اور محتاج بھی تھے، اللہ کے راستہ میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے تھے۔ ان کے تینوں اوصاف کو ذکر کیا گیا۔ گویا ان میں سے کوئی ایک بات بھی ہوتی تو کافی تھی، چہ جائیکہ یہ تینوں چیزیں ہیں ایسے لوگوں پر خرچ نہ کرنے کی قسم نہ کھائیں۔

دیکھو! قرآن پاک میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے باری تعالیٰ کی طرف سے "أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ" کا لقب استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ان کے مقام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بلکہ آگے فرمایا: ﴿وَلِيَعْفُوا وَلِيَصْفَحُوا﴾ معاف کریں اور درگزر کریں ﴿أَلَا تَحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟

سفارش بھی، تنبیہ بھی

اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی کیسا پیارا انداز اختیار فرمایا! حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تنبیہ بھی کی جا رہی ہے اور حضرت مسطح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارش بھی کی جا رہی ہے۔ حضرات صحابہ کا مقام بھی دیکھئے کہ ان کی طرف سے کوئی فروگزاشت ہو رہی ہے تو اللہ تعالیٰ بڑے پیارے انداز سے اصلاح فرما رہے ہیں۔ ادھر ان سے بھی قصور ہوا تھا، وہ اپنے قصور پر نادم بھی تھے، ان پر حد بھی جاری ہوئی تھی اور معافی بھی ہو گئی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سفارش کر دی۔ جب کسی سے نادانی میں جرم ہو گیا، وہ معافی مانگ رہا ہے اور اس کو اس کے جرم کی سزا جو شریعت کی مقرر کی ہوئی ہے وہ بھی دی جا چکی

ہے، تو معاملہ ختم ہو گیا، اب اور کیا رہ جاتا ہے۔ ہم لوگوں کا معاملہ تو ایسا ہے کہ گویا زندگی بھر کے لیے ایسا کھونٹا لگا دیا کہ اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالاں کہ اسلام کی تعلیم دیکھنے کے وہ دونوں طرف کیا سکھاتا ہے۔ ان سے قصور ہوا اور قصور بھی معمولی نہیں بھتا، بلکہ بہت بڑا قصور تھا۔ نبی کریم ﷺ پر اس تہمت والے واقعہ کی وجہ سے ایک طویل زمانہ تک بڑا اثر رہا، آپ ﷺ کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی تھی، سارے مسلمان اس کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا رہے، لیکن پھر بھی ان سے تو نادانستگی میں ہوا تھا جس کی سزا بھی مل گئی، اس پر نادم بھی ہوئے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً وحی اتری۔

اب معاملہ صاف کر لیجئے

گویا اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے اہل ایمان کی تربیت فرما رہے ہیں کہ ان کے اندر کیسے اوصاف ہونے چاہئیں؟ ایسی کوئی بات ہو جائے تو اہل ایمان کا مزاج کیا ہونا چاہیے؟ اس لیے کہ معاشرہ، سماج اور سوسائٹی میں کسی سے قصور اور کوتاہی ہو جاتی ہے اس کے بعد اگر وہ اپنے قصور و کوتاہی پر نادم بھی ہے اور شریعت کی طرف سے مقررہ سزا بھی دی جا چکی ہے، تو اب آئندہ کے لیے معاملہ صاف کر لیجئے۔ یہاں اللہ تعالیٰ خود سفارش فرما رہے ہیں: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بلا کر ان کے سامنے تلاوت فرمائی۔ آپ تلاوت فرما کر فارغ ہوئے تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: ”بسلیٰ اُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لِي“ کیوں نہیں! میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ اسی وقت جو وظیفہ اور خرچہ بند کر دیا تھا، وہ جاری کر دیا اور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی بند نہیں کروں گا اور اب تک جو باقی تھا وہ بھی دے دیا۔

ہمارا مزاج؟ خدا کی پناہ!

حضرات صحابہ کا مزاج قرآنی تعلیمات اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے معاملہ میں یہی تھا۔ بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ جملہ ہے: «كَانَ وَقَافًا عِنْدَ كِتَابِ اللَّهِ» اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن کی کوئی بات سامنے آجائے تو فوراً رُک جانے والے تھے۔ قرآن کے مقابلہ میں اپنے نفس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اور ہم لوگوں نے اپنا مزاج اتنا زیادہ بگاڑ رکھا ہے کہ خدا کی پناہ! کوئی آدمی ہمارے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تو کیا، بیسیوں آیتیں پیش کر دے، نبی کریم ﷺ کی سیکڑوں حدیثیں پڑھ دے، اور ہمارا دل کہہ رہا ہو کہ یہ سب صحیح کہہ ہے؛ پھر بھی ہم تاویل میں کریں گے کہ اس میں تو یوں ہے اور فلاں ہے۔ کہیں آپس میں صلح کے لیے کوئی بات کہنے کے بعد کہا جائے کہ اتنی ساری حدیثیں سنائی گئیں، اب تو معاف کر دیجئے، تب بھی کہتے ہیں: آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں، لیکن اس کو تو دیکھو! کیسا نالائق ہے، یہ تو معاف کرنے کے لائق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو معاف نہیں کیا جانا چاہیے، اگر ایسا ہوتا تو حدیث میں بتلا دیا جاتا، حالاں کہ ایسا کہیں نہیں آیا ہے۔ درحقیقت ہم لوگوں کا مزاج بگڑ گیا ہے۔

اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اللہ اور اس کے پاک رسول ﷺ کے حوالہ کر دیں، ان کے سامنے سرنڈر ہو جائیں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ ”سِلْمٌ“ یعنی اپنے آپ کو حوالہ کر دینا، ہمارا کوئی ارادہ و خواہش نہیں، ہمارا کوئی تقاضا نہیں، ہمارا جی مانے یا نہ مانے، ہمارے مزاج کے موافق ہو یا مخالف، ہم کو بظاہر اس سے کچھ فائدہ ہو یا نقصان؛ اُدھر سے جو فیصلہ ہو جائے اور جو کہا جائے، بس! ہم تو

اسی میں راضی ہیں۔ دراصل اسلام یہی چاہتا ہے کہ ہر چیز میں اپنے آپ کو پورے طور پر خدا اور رسول کے حوالے کر دیجئے۔ جیسا کٹھ تلی کا حال ہوتا ہے، اور جیسے کسی کے پاس ایک مشین ہوتی ہے، جس طرح وہ چاہتا ہے اس کو چلاتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی کرنا ہے؛ تب ہی بات ہے۔ شریعت ہمارا مزاج اسی طرح کا بنانا چاہتی ہے۔

..... اور کوڑا رکھ دیا

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ درگزر کرو اپنا شیوہ بناؤ۔ جو لوگ تمہارے ساتھ زیادتی کرنے والے ہیں ان کو معاف کرنے کا آپ کا مزاج ہونا چاہیے۔ ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ اور بھلی بات کا حکم دیجئے ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ اور جو آپ کے ساتھ جہالت کا سلوک، نامناسب برتاؤ کرنے والے ہیں، آپ ان سے صرف نظر اور چشم پوشی کیجئے، یعنی انتقام نہ لیجئے۔

بخاری شریف میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے لیے جو مجلس شوریٰ بنائی تھی (جن سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہم امور اور معاملات میں مشورہ لیتے تھے) وہ تمام کے تمام قراء، اہل علم اور قرآن کے علماء تھے۔ حرب بن قیسؓ بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ ان کے چچا عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی تھے، لیکن دیہات کے رہنے والے تھے، ان کے مزاج میں اکھڑ پن تھا۔ ایک مرتبہ وہ مدینہ منورہ آئے اور اپنے بھتیجے حرب بن قیسؓ کے یہاں قیام کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ میرے بھتیجے کا امیر المؤمنین کے یہاں خاص مقام ہے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے حرب بن قیسؓ سے کہا: امیر المؤمنین کے یہاں تمہارا خاص مقام اور عزت ہے، میرے لیے بھی ان کے یہاں خصوصی اوقات میں حاضری کی اجازت لے لیجئے، ویسے تو وہاں ایسا کچھ

نہیں تھا، جو آدمی جب ملنا چاہتا مل سکتا تھا، لیکن کچھ خصوصی اوقات ہوتے تھے جن میں ہر ایک کو آنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا، صرف اہل مشورہ وہی وہاں موجود ہوتے تھے، اس لیے انہوں نے خاص اوقات میں اپنے لیے حاضری کی اجازت طلب کرنے کی درخواست کی۔ اور چچا باپ کے درجہ میں ہوتا ہے، اس لیے چچا کی اس خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے حربن قیسؒ نے امیر المؤمنین سے اجازت طلب کی کہ میرے چچا میرے گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ میں جب یہاں آؤں تو وہ بھی ساتھ آئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دیدی (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں تو کوئی بھی غلط بات کرتا تو فوراً اس کو سزا دی جاتی تھی، اس میں دیر نہیں لگتی تھی۔ خیر!) جب وہ آئے تو مجلس میں بیٹھے ہی عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ عنہ نے ایک بے تکلی بات کر دی۔ کہا: «هِيَ يَا ابْنَ الْخَطَابِ! فَوَاللَّهِ مَا تُعْطِينَا التَّجْرَةَ، وَلَا تَحْتَمُّكُمْ بَيْنَنَا بِالْعَدْلِ» اے ابن الخطاب! آپ انصاف سے فیصلہ نہیں کرتے، اور برابر ہم کو بخشش اور عطیے بھی نہیں دیتے۔ (حالاں کہ ظاہر ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں تو سارا نظام مرتب تھا، ہر ایک کے وظائف مقرر تھے جو سب کو ملتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے زمانہ میں حکومت کے سارے نظامات باقاعدہ مرتب کئے گئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی رضی اللہ عنہ نے الفاروق میں اس کی پوری تفصیل ذکر کی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل و انصاف تو ایک مسلمہ حقیقت ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ فوراً کوڑے پر گیا۔ حربن قیس نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چچا کی خبر لے ڈالیں گے اور سارا مزہ کر کر ا ہو جائے گا۔ انہوں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً یہ آیت پڑھی:

امیر المؤمنین! باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ درگزر کرو اپنا شیوہ بنائیے،

بھلی بات کا حکم کیجئے اور نادانوں سے چشم پوشی، اعراض و صرفِ نظر کیجئے ”وَإِنَّ هَذَا مِنْ
الْجَاهِلِينَ“ اور یہ بھی ایسے ہی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزاج فوراً اعتدال پر آ گیا، اسی
وقت کوڑے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اسی موقع پر بخاری شریف میں یہ جملہ ہے: ”وَكَانَ
وَقَافًا عِنْدَ كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى“ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سامنے اپنے آپ کو روکنے
والے تھے یعنی جہاں کوئی اس کی بات پیش ہوئی فوراً اس سے رک گئے۔

(بخاری شریف: ۳۶۲۲، باب اخذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلین ۱)

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شریعت ہم سے یہی مزاج چاہتی ہے، جیسے
کبھی رشتہ داروں سے ناچاقی اور خلافِ مزاج بات پیش آ جاتی ہے، لیکن شریعت ہمیں
کہتی ہے کہ ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، تو بس ہمیں کرنا ہے، وہاں پھر تاویلات
بھول جائیے، جب ہر چیز کی تفصیل شریعت میں موجود ہے، تو پھر ہم اس میں تاویلیں
کرتے رہیں اور اس میں غلطی نکالتے رہیں کہ یوں ہے اور فلاں ہے؛ یہ تمام باتیں
ہمارے نفس کی دھوکہ بازی ہے۔ شیطان آدمی کو اللہ و رسول کے ارشادات، ہدایات
اور حکموں پر عمل کرنے سے روکتا ہے۔

اگر یہ طریقہ اپنائیں.....

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السُّيُئَةُ﴾ نیکی اور برائی، اچھا اور برا سلوک دونوں
برابر نہیں ہو سکتے ﴿إِذْفَعِ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (سامنے والے کی طرف سے کوئی ایسی بات
پیش آ جائے تو آپ اس کا) جواب ایسے طریقہ سے دیجئے جو اچھا ہو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام
جب اس آیت کو لے کر نازل ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اچھا سلوک کیا ہے؟
انہوں نے کہا: ”صِلْ مَنْ قَطَعَكَ“ جو رشتہ دار آپ سے قطع رحمی کرے، رشتہ داری
کے حقوق ادا نہ کرے، آپ اس کے حقوق ادا کیجئے۔ ”وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ“ اور جو

آپ پر زیادتی کرے آپ اس کو معاف کیجئے۔ ”وَأَحْسِنَ إِلَىٰ مَنْ أَسَاءَ إِلَيْكَ“ اور جو آپ کے ساتھ برائی کرے، آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے۔ بھلے طریقہ سے جو اب دینے کا مطلب یہی ہے۔ جب یہ طریقہ آپ اپنائیں گے تو وہ آپ کا چکا دوست بن جائے گا یعنی ہمیشہ کا ٹینشن ختم ہو جائے گا۔

لیک بعد از خرابی بسیار

در اصل ٹینشن تو ہم لوگ خود بڑھاتے رہتے ہیں، کسی نے ہمارے ساتھ برا سلوک کیا، اس کے جواب میں ہم بھی ویسا ہی سلوک کرتے ہیں، تو اب کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جب یہ سلسلہ آگے بڑھے گا تو ٹینشن بھی بڑھتا ہی جائے گا۔ آخر کسی وقت تو اس کو ختم کرنا ہے، یا اس کو ہمیشہ چلاتے ہی رہنا ہے؟ تھوڑے زمانہ کے بعد پھر کہتے ہیں کہ چلو! اب صلح کر لیں:

آں چہ کند دانا کند ناداں ❁ لیک بعد از خرابی بسیار

عقل مند آدمی جو کام کرتا ہے، نادان آدمی بھی وہ کام کرتا ہے، لیکن بہت نقصان ہو جانے کے بعد۔ عقل مند وہی کام پہلی فرصت میں کر لیتا ہے۔ اتنے سارے کیس لڑے، اتنے سارے پیسے خرچ کیے، اتنی ساری لڑائیاں کیں، کاروبار کا نقصان کیا، ساری دنیا میں جگ ہنسائی اور بدنامی ہوئی، اس کے بعد صلح کی سوچھی۔ یہی کام پہلے روز کر لیتے تو کتنا اچھا ہوتا! اتنے نقصانات جو اٹھائے، اتنے سارے پیسے خرچ کیے، اگر اس کا پاؤ حصہ بھی اس کو دے دیا ہوتا، تو وہ آپ کا غلام بن جاتا۔

وہ سکتہ میں آ گیا

ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا، آپ کو برا بھلا کہا اور

خوب گالیاں دیں، آپ سر جھکا کر سنتے رہے، جب وہ سب کہہ چکا تو حضرت ابن عباسؓ نے عکرمہ سے کہا: اے عکرمہ! ان سے پوچھ لیجیے کہ ان کی کوئی حاجت ہے جو ہم پوری کر سکتے ہیں؟ یہ سن کر وہ آدمی بالکل خاموش ہو گیا اور سکتہ میں آ گیا۔ اس کے بجائے کچھ اور سلوک کیا جاتا تو کیا یہ ممکن تھا؟۔

ہمت کا کام

اس لیے شریعت کا بتلایا ہوا طریقہ ہی آسان ہے ﴿ادْفَعِ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ اسی آیت میں آگے فرمایا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ دنیا میں یہ ہوگا کہ جو تمہارا دشمن ہے وہ پکا دوست بن جائے گا۔ اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لوگ دوست بنانے کے لیے معلوم نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔ آپ اگر اتنا ہی کر لیں، اور تھوڑا تحمل سے کام لیں، تھوڑی بردباری اپنائیں، تو بہت آسانی کے ساتھ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آدمی کی آزمائش کا موقع یہی ہوتا ہے، اس وقت آدمی اپنے نفس کے اوپر کنٹرول کرے ضبط رکھے اور غصہ پئے۔

آگے فرمایا ہے: ﴿وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا﴾ اس کی توفیق نہیں ہوتی مگر انہی لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہیں ﴿وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا﴾ اور اللہ تعالیٰ جس کو اس کی توفیق دے وہ بڑے نصیبی والا ہے۔ اس کی توفیق ہی سے یہ چیز ہو سکتی ہے؛ ورنہ اتنا آسان کام نہیں ہے، لیکن آدمی اگر کوشش کرے تو دھیرے دھیرے یہ چیز اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ جو آدمی صبر سے کام لے اور معاف کر دے؛ تو یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

دو پسندیدہ خوبیاں

۶۳۲:- وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ (أَشْجَّ عَبْدٍ

الْقَيْسِ إِنَّ فِيكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللَّهُ: الْجَلْمُ وَالْأَنَاةُ). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اُن صحیح عبد القیس

سے فرمایا: تمہارے اندر دو خوبیاں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں (اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ وزیر اعظم یا صدر مملکت اس خوبی کو بہت پسند کرتے ہیں، تو ہم اپنے اندر اس خوبی کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ جس خوبی کو پسند کرتے ہیں ہمیں اپنے اندر وہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے) ایک تو بردباری اور دوسری اطمینان و سکون کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا۔

افادات:- عبد القیس عرب کا ایک قبیلہ ہے جو بحرین کے علاقہ میں آباد

تھا، ان کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی بڑی شخصیت کے پاس جب لوگ جاتے ہیں تو دل میں بڑے جذبات اور بڑی تمنائیں ہوتی ہیں کہ جب جا کر ملیں گے تو پہلی فرصت میں ان سے نیاز حاصل کریں گے، یہاں بھی یہی ہوا کہ جب قافلہ والے سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو نبی کریم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، آپ کو دیکھتے ہی قافلے والے اونٹوں سے اترے اور ان کو باندھے بغیر ہی بھاگے، اور ملاقات کے واسطے سیدھے حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے، ان میں ایک آدمی مندر نامی تھے جن کا لقب اُن صحیح تھا۔ انہوں نے سب کے اونٹوں کو باندھا اور چوں کہ سفر سے آئے ہوئے تھے اس لیے کپڑے بھی میلے ہو چکے تھے، تو اپنا سامان کھولا اور اس میں سے دھلے ہوئے کپڑے نکالے اور بدلے، پھر نبی کریم ﷺ

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ سارا منظر حضور اکرم ﷺ دیکھ رہے تھے۔ دوسرے لوگ تو پہلے سے خدمت میں پہنچ چکے تھے اور گویا انہوں نے اپنے زعم میں ان سے سبقت حاصل کر لی تھی، لیکن جب یہ اس طرح تیاری کر کے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور بہت خوش ہوئے اور ان سے فرمایا: تمہارے اندر دو خوبیاں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں؛ ایک تو بردباری اور دوسری اطمینان و سکون کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا۔ عام طور پر ایسے موقع پر طبیعت عجلت اور جلدی بازی کو چاہتی ہے، لیکن انہوں نے عجلت نہیں کی تو اس پر نبی کریم ﷺ نے ان کی تعریف فرمائی اور ان کی اس عادت کو پسند فرمایا۔

غصہ مت کرو

تو حلم اور بردباری بہت عمدہ صفت ہے، اس لیے کہ سب کام غصہ میں خراب ہو جاتے ہیں۔ غصہ اتنی خطرناک چیز ہے کہ اس میں انتقام کے لیے آدمی کا خون کھولنے لگتا ہے، اور اس کا اثر پورے جسم پر نمایاں ہوتا ہے، یہاں تک کہ ظاہری اعضاء پر بھی اثر پڑتا ہے، جیسے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، رگیں پھول جاتی ہیں، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور زبان پر اثر یہ ہوتا ہے کہ اول فول بکنے لگتا ہے، گالیاں دیتا ہے، تہمت لگاتا ہے، اور پتہ نہیں کیا کیا کرتا ہے۔ ہاتھ اور اعضاء پر اثر یہ پڑتا ہے کہ سامنے والے پر حملہ آور ہوتا ہے اور پٹائی یا قتل کرنے یا اس کے کپڑے پھاڑ دینے یا اس کو نوچنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ ہاتھ میں نہیں آتا تو جو چیز ہاتھ میں آگئی اسی کو اٹھا کر پھینک دیتا ہے، اور توڑ ڈالتا ہے۔ گویا آدمی کی عقل ہی جاتی رہتی ہے، اور عقل اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی چیز دے رکھی ہے، وہ جب جاتی ہے تو یہ سب کارنامے انجام دیتا ہے۔ اسی آدمی کو بعد میں

جب بتایا جائے کہ آپ نے یہ سب کیا ہے، تو وہ خود پچھتا تا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی آدمی غصہ ہوا ہو، اور بعد میں پچھتا یا نہ ہو، ہر غصہ ہونے والے کو بعد میں پچھتا نا پڑتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سب سے خطرناک چیز غصہ ہے، اس پر کنٹرول کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے کہ غصہ مت کرو۔

قصور گاہک کا، سزا بیوی کو!

اور غصہ کی وجہ سے بعض ایسے نقصانات پہنچ جاتے ہیں کہ زندگی بھر آدمی پچھتا تا رہتا ہے۔ جیسے بہت سے لوگ طلاق دیتے ہیں۔ جھگڑا کسی کے ساتھ ہوا ہے اور اس کو بیوی پر اتارتے ہیں۔ طلاق دینے کے بعد آکر کہتے ہیں کہ مفتی صاحب! میرا طلاق دینے کا ارادہ نہیں تھا، بس! غصہ میں دے دی۔ جب میرے پاس ایسے طلاق والے آتے ہیں تو مجھے ان کے اوپر بہت تعجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب ان سے پوچھتے ہیں کہ ہوا کیا تھا؟ تو کہتے ہیں کہ بیوی کے بھائی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، بیوی کے ابا کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، بلکہ بعض مرتبہ تو جس سے لڑائی ہوئی وہ بیوی کا رشتہ دار بھی نہیں ہوتا۔ یا کسی گاہک پر غصہ آ گیا تھا، اسی غصہ میں میاں صاحب گھر پہنچے اور بیوی کو طلاق دے ڈالی۔ عجیب و غریب معاملہ ہے! تو میں عرض کر رہا تھا کہ غصہ آدمی کی عقل ختم کر دیتا ہے۔

جب وہ غصہ میں ہوتا ہے

شیطان سے کسی نے پوچھا کہ تم کو انسان کے اوپر سب سے زیادہ وقت ابو کون سے وقت ملتا ہے؟ اس نے کہا: جب وہ غصہ میں ہوتا ہے اس وقت مجھے اس پر پورا کنٹرول ہو جاتا ہے، اس وقت اس کی پوری لگام میرے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور میں جو چاہتا ہوں؛ کروا تا ہوں۔ اس لیے شیطان چاہتا ہی ہے، اس کی خواہش یہی ہوتی ہے

کہ آدمی غصہ میں آجائے۔

مناظرہ میں کامیابی کا گر

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: مناظرہ اور علمی بحثوں میں کامیاب ہونے کا سب سے بڑا گر یہی ہے کہ آپ کوئی ایسا کام کر دیجئے کہ جس سے سامنے والے کو غصہ آجائے۔ بس! ایک مرتبہ وہ غصہ میں آ گیا تو اس کا سارا علم، سارے دلائل، اور اس کا سارا حافظہ غائب ہو جائے گا، پھر آپ جس طرح چاہیں اس پر فتاویٰ حاصل کر لیجئے۔ مناظرہ میں کامیابی کا یہ بہت ہی آسان نسخہ ہے۔

خوبیاں وہی یا کسبی؟

پھر حضرت مندرائے شیخ عبدالقیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ دو چیزیں میں نے حاصل کی ہیں، یا اللہ تعالیٰ نے مجھے ان خصلتوں پر پیدا کیا ہے؟ (یعنی یہ خوبیاں قدرتی ہیں یا میں نے محنت، ریاضت اور مجاہدہ کر کے حاصل کی ہیں؟) کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو آدمی محنت، ریاضت اور مجاہدہ کر کے حاصل کرتا ہے اور کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ فطری طور پر آدمی کے اندر ودیعت فرماتے ہیں) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم کو اسی پر پیدا کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسی دو خصلتوں پر پیدا کیا، جن کو وہ پسند کرتا ہے

دونوں راہیں بتلا دیں

یہ بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے قلب میں ہر طرح کی صفات کی جڑیں اور بیج رکھے ہیں۔ آدمی جیسے ماحول میں پرورش پاتا ہے اور جو راہ خود اپنے لیے اختیار

کرتا ہے، اسی کے مطابق ترقی کرتا ہے ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ نے دونوں راہیں بتلا دی ہیں۔ کس چیز میں کیا فائدہ ہے اور کس چیز میں کیا نقصان ہے؛ وہ بھی بتلا دیا ہے۔ تو حلم کا مادہ آدمی میں ہوتا ہی ہے، لیکن آدمی ریاضت اور مجاہدہ کر کے اس کو ترقی دیتا ہے۔ ایسے ہی جتنی بھی خوبیاں ہیں ان کے بیج اللہ تعالیٰ نے تمام انسانی دلوں میں ڈال رکھے ہیں، بری صفات کے بیج بھی ہوتے ہیں، اب آپ کس کو پانی دیتے ہیں اس پر ساری بنیاد ہے۔ اچھے اوصاف کے مناسب پانی اہل اللہ، اہل تقویٰ اور اچھے اخلاق والوں کی صحبت اور ان سے استفادہ ہے۔ اور برے اوصاف کے مناسب پانی بری صحبت ہے۔ اگر بری صحبت میں رہ کر ان کو پانی پلائیں گے؛ تو وہی بڑھیں گے اور پھر ان کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔

باب الحلم والائتاءة والرفق

حلم، وقار اور نرمی

﴿ مجلس ۲ ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گذشتہ مجلس میں عنوان شروع ہوا تھا: بردباری اور اناءۃ؛ اطمینان و سکون سے کام کو انجام دینا، اور نرمی؛ ان تین چیزوں کی تفصیل بھی بتلا دی تھی۔ اسی سلسلہ میں روایات چل رہی ہے۔

نرمی کا جادو

۶۳۳:- وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ رَفِیْقٌ

يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ

تعالیٰ نرم ہیں، اور ہر چیز میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔

افسادات:- نرمی کی عادت ہر کام میں خوبی پیدا کر دیتی ہے، اور سختی کی وجہ سے اس کام کی خوبی گھٹتی، اور کبھی تو بالکل ختم ہی ہو جاتی ہے۔ آپ کبھی کسی کو تنبیہ کرنا چاہیں، تو تنبیہ کی بات بھی اگر نرمی کے ساتھ کریں گے تو اس کی وجہ سے سامنے والے پر جواثر ہوگا، سختی کے ساتھ کہنے میں وہ اثر نہیں ہوگا۔ اس لیے نرمی بھی ایسی چیز ہے جس کی شریعت میں تاکید آئی ہے اور اس کو ساری خوبیوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔

اگر طویل المیعاد فائدہ حاصل کرنا ہے!

۶۳۴:- وعنہا: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ رَفِیْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي

عَلَى الرِّفْقِ، مِمَّا لَا يُعْطَى عَلَى الْعُتْفِ، وَمِمَّا لَا يُعْطَى عَلَى مَا سِوَاهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ نرم ہیں، نرمی کو پسند کرتے ہیں۔ اور نرمی پر وہ چیز دیتے ہیں جو سختی پر نہیں دیا کرتے، اور

کسی بات پر وہ نعمت نہیں عطا فرماتے جو نرمی پر عطا فرماتے ہیں۔

افادات:- کسی بھی کام کو آپ انجام دینا چاہیں تو اس کے لیے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں، یا تو سختی والا پہلو اپنایا کر اس کام کو انجام دیں، یا نرمی اختیار کر کے انجام دیں۔ مثلاً کسی آدمی کو کسی برائی سے روکنا ہے، یا کسی بھلے کام کی تاکید کرنی ہے تو آپ سختی والا رویہ اختیار کریں یا نرم طریقہ اختیار کریں۔ نبی کریم ﷺ ہمیں یہ ہدایت فرما رہے ہیں کہ بھائی! نرمی کو اللہ تبارک و تعالیٰ پسند فرماتے ہیں، اس لیے مؤمن کو نرمی والا طریقہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔

پھر آگے یہ بھی بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ نرمی پر وہ عطا فرماتے ہیں جو سختی پر نہیں دیا کرتے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ نرمی کے نتیجے میں جو اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں، سختی کے نتیجے میں وہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ سختی کی وجہ سے کوئی فائدہ ہو بھی گیا تو وہ وقتی اور ہنگامی ہوتا ہے، طویل زمانہ کے اعتبار سے وہ مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس سے کوئی طویل المیعاد فائدہ حاصل ہوا ہو۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ مؤمن کو چاہیے کہ وہ نرمی والا طریقہ اختیار کرے۔ اس زمانہ میں عام طور پر تعلیم و تربیت کے ذمہ دار حضرات، عصری تعلیم گاہوں کے سربراہان نفسیاتی اور دوسرے انداز سے لوگوں کی اصلاح کے، اور برائی سے روکنے کے جو طریقے اختیار کرتے ہیں، ان میں بھی اسی بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ نرمی والا پہلو اختیار کیا جائے۔ ہمیں تو حضور اکرم ﷺ کی یہ تعلیم ہے کہ نرمی اختیار کرو۔ اور خود حضور اکرم ﷺ کا عمل کیا تھا وہ آگے آنے والا ہے۔

اس کام میں رونق آ جاتی ہے

۶۳۵:- وعنها أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَادَهُ

وَلَا يُنَوِّعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ. (رواہ مسلمہ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نرمی جس چیز میں بھی ہوگی، اس کو زینت اور خوبی عطا کرے گی۔ اور جس چیز میں سے نکال دی جائے گی، اس کو عیب دار بنا دے گی۔

افادات:- آپ جس کام میں بھی نرمی اپنائیں گے اس میں خوبی نمایاں ہوگی، نرمی اس کام کو مزید مزین کرے گی، اس کی زینت اور خوبصورتی کو بڑھائے گی۔ جس کام میں نرمی والا پہلو اختیار کیا جائے گا، اس میں رونق آجائے گی، زینت اور خوبی پیدا ہو جائے گی۔ اور اس میں سے اگر نرمی نکال دی جاتی ہے تو وہ کام عیب دار ہو جاتا ہے، اس میں ویسی خوبی، رونق اور زینت باقی نہیں رہتی جو نرمی سے حاصل ہو سکتی تھی۔

تم آسانی کرنے والا بنا کر بھیجے گئے ہو

۶۳۶:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال أعرابي في المسجد: فقام الناس إليه ليقلعوا فيه، فقال النبي ﷺ: دَعُوهُ وَأَرِيقُوا عَلَى بَوْلِهِ سَجْلًا مِنْ مَاءٍ، أَوْ (قال) دَنُوبًا مِنْ مَاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مَيِّتِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعْتَبِينَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیہات کا رہنے والا ایک نیا آدمی (آیا، مسلمان ہوا، اور) مسجد نبوی، ہی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے تاکہ اس کو تنبیہ کریں (یعنی اس کو روکیں) حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، پیشاب کر لینے دو، اور پانی سے بھرا ہوا ایک ڈول لا کر اس پر بہا دو۔ تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری اور مشکل پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

الْقَائِلُ وَالسَّائِلُ وَالْبَائِلُ

افادات:- دوسری روایت میں ہے کہ پہلے تو اس نے نماز پڑھی اور اس میں ایک دعا کی: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَرَحْمَةً دَائِمَةً وَلَا تَرْحَمْنِيْ مَعْنَاً اَحَدًا. اے اللہ! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم کیجئے اور کسی دوسرے پر رحم نہ کیجئے۔ نماز کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: لَقَدْ حَجَّرْتَ وَابْسَعَا اللّٰهُ تَعَالٰى كى رحمت تو بڑی کشادہ اور وسیع ہے، تم نے صرف اپنے اور میرے لیے رحمت کی دعا مانگ کر اس کو تنگ کر دیا۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم نہ کیجئے۔ تو ایک کام تو اس نے یہ کیا (صحیح البخاری، باب رَحْمَةِ السَّائِلِ وَالْبَائِلِ: ۲۱۰۰)

پھر اس نے حضور ﷺ سے سوال کیا: ”مَتَى السَّاعَةُ؟“ قیامت کب آئے گی؟ حضور اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا: ”مَا اَعْدَدْتَ لَهَا؟“ تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے جو قیامت کا سوال کرتا ہے؟ جیسے کوئی آدمی پوچھے کہ امتحان کب ہے؟ تو آپ اس سے کہیں گے کہ تم نے کیا تیاری کی ہے کہ امتحان کا سوال کر رہے ہو؟ اسی طرح قیامت کب آئے گی جو تم پوچھ رہے ہو؛ تو تم نے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے کہا: ”مَا اَعْدَدْتُ لَهَا كَثِيْرًا صَلَوٰةٍ وَصَوْمٍ وَصَدَقَةٍ“ اے اللہ کے رسول! میں نے اس کے لیے کوئی زیادہ نماز، روزوں کا اہتمام تو نہیں کیا ہے، بس! فرائض پر اکتفا کرتا ہوں، لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الْبِرُّ مَعَ مَنْ اَحَبَّ“ آدمی اسی کے ساتھ رہے گا جس سے وہ محبت رکھتا ہے (صحیح البخاری، باب عَلَامَةُ حُبِّ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا یہ جواب سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتنے خوش ہوئے کہ اس سے پہلے کسی چیز سے اتنے خوش نہیں ہوئے تھے۔ (سنن الترمذی: ۲۳۸۵) اس لیے کہ ان کو تو حضور اکرم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی اور یہ جواب تو گویا ان کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔

پھر اس دیہاتی نے تیسرا کام یہ کیا کہ جب اس کو پیشاب کا تقاضا ہوا تو مسجدِ نبوی ہی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ اس کے نزدیک باہر اور اندر کا کوئی فرق تو تھا نہیں۔ اس دیہاتی کے متعلق شراح ایک جملہ لکھتے ہیں: «الْقَائِلُ وَاللَّائِلُ وَالْبَائِلُ» وہ قائل یعنی دعا کرنے والا تھا۔ سائل یعنی سوال کرنے والا تھا۔ اور بائل یعنی پیشاب کرنے والا تھا۔

ویسے بھی اُس زمانہ میں مسجدوں میں فرش فروش یا پتھر اور ٹائلس وغیرہ لگے ہوئے نہیں ہوتے تھے، کچی ریت بچھی ہوئی ہوتی تھی اس لیے جو پیشاب گر رہی تھی وہ زمین میں جذب ہو رہی تھی۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ زمین پر پیشاب گرمی ہو اور سوکھ جائے تو اس سے بھی زمین پاک ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ مسجد کا معاملہ تھا، ہو سکتا ہے کہ سوکھنے میں دیر لگے اور دوسری نماز کا وقت قریب ہو، اگر اس سے پہلے سوکھی نہیں تو وہ جگہ ناپاک رہے گی، یا سوکھ تو گئی لیکن بدبو کا اثر رہ سکتا ہے اس لیے بھی فوری طور پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس پر پانی کا ایک ڈول بہادو۔ یہ تو اس کی پیشاب سے مسجد کے فرش پر جو اثر ہوا تھا اس کو دور کرنے کی تدبیر بتائی۔

روایت کا سبق

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک نصیحت فرمائی: تم لوگ آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری اور مشکل کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ اسی سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، پھر آپ اپنی اُمت کو یہ ذمہ داری سونپ رہے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے شریعت کے جتنے احکام نازل فرمائے ہیں ان کو آگے پہنچانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔

یہاں حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حلم و بردباری کا سبق دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حرکت کرتا ہوا دیکھ کر آدمی کو فوری طور پر غصہ آتا ہے، لیکن آپ ﷺ نے ان کو روک دیا کہ شاید غصہ کی حالت میں کوئی کچھ کر ڈالے۔ اور ایک تدبیر بھی بتلا دی جو خطرے سے خالی تھی کہ اس کو پیشاب کر لینے دیا جائے، اس کے بعد اس پر پانی بہا دیا جائے، اس میں کچھ نقصان نہیں تھا۔ اور اس کو روکنے میں دو میں سے ایک نقصان لازمی تھا۔ اگر وہ فوری طور پر رک جائے تو اس کو جسمانی نقصان ہوگا، اور اگر نہیں روکے گا اور اُٹھ کر بھاگے گا تو مزید فرس ناپاک ہوگا۔ گویا حضور اکرم ﷺ نے ان کو بتلا دیا کہ اگر تم اس پر غصہ کرو گے اور اس کو روکو گے تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے، بلکہ نقصان ہی ہوگا۔ زمین پر پیشاب کا کچھ حصہ گر ہی چکا ہے، وہ تو ختم ہونے والا نہیں، اس کی پاکی کے لیے تو تدبیر کرنی ہی ہے، اب اس کو وہیں پورا پیشاب کر لینے دو، بعد میں اس حصہ کو دھو دیا جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غصہ کی حالت میں کوئی اقدام اور تدبیر پورے طور پر نافع نہیں ہوتی، اس میں کچھ نہ کچھ قصور، کمی و کوتاہی رہ ہی جاتی ہے، جس کی طرف اس وقت غصہ کی وجہ سے آدمی کا دھیان نہیں جاتا، بعد میں اس کو بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کے بجائے فلاں تدبیر کی ہوتی تو اچھا تھا، اس میں یہ نقصان نہ ہوتا۔ اور آئندہ کے لیے یہ بھی بتلا دیا گیا کہ تمہارے مزاج میں آسانی ہونی چاہیے، سختی نہیں ہونی چاہیے۔ گویا امت کے لیے یہی ایک چیز اصولی ہے کہ آدمی آسانی والے طریقہ کو اپنائے۔

آسانی کو ترجیح دیجئے

۶۳۷: - وعن أنس رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: يَسِّرْ. وَأَوْلَا تَعَسِّرْ. وَ.

وَلْيَسِّرُوا وَلَا تَنْقُرُوا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں کے لیے آسانی کرو، دشواری نہ کرو۔ لوگوں کو بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

افادات:- یہ خطاب مختلف طریقوں سے آچکا ہے کہ دین میں جو آسان پہلو ہو، اس کو شریعت نے ترجیح دی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جہاں صراحتاً حرمت ہو وہاں بھی کوئی آدمی اس روایت کو پیش کر کے آسانی کا مطالبہ کرے، جیسے: کوئی کہنے لگے: مولوی صاحب! اب ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ سود سے بچنا مشکل ہو گیا ہے، اس لیے آپ اجازت دے دو۔ ارے بھائی! مولوی صاحب سود کی اجازت کہاں سے دیں گے جبکہ قرآن وحدیث میں صاف صاف اس کی حرمت آئی ہے؟ بلکہ آسانی کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ کام جس میں شرعی اعتبار سے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں، ان میں جو آسان پہلو ہو، وہ اختیار کرنا چاہیے، دشواری والا پہلو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ یا حکمران طبقہ کو حضور ﷺ خطاب کر رہے ہیں کہ اپنے عوام اور پبلک سے جو معاملہ پڑے، اور اس میں ان کے لیے دونوں پہلو ہوں، تو آسانی والا پہلو اختیار کرو۔ چنانچہ بعض حضرات جیسے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حضور اکرم ﷺ نے یمن کی طرف حاکم بنا کر بھیجا، تو ان کو خاص تاکید فرمائی تھی: «يَسِّرُوا وَلَا تَعْسِرُوا» اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ کو بھی خطاب کیا گیا ہے کہ تمہاری طرف سے عوام کی معاشرت سے متعلق جو احکام جاری کئے جائیں، جو آرڈیننس جاری ہوں، ان میں نرمی کا پہلو اختیار کرنا، سختی والا نہیں۔

متنفرمت کرو

«يَسِّرُوا وَلَا تَعْسِرُوا» لوگوں کو بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔ «لَا تَنْقُرُوا»

مقابل ”اَلدُّنْيَا“ ہونا چاہئے تھا، یعنی لوگوں کو مانوس کرو۔ مانوس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ساتھ ملاؤ، جیسے بچہ جب بدکتا ہے تو اس کو مانوس کیا جاتا ہے۔ تو لوگوں کو بدکاؤ مت، اور نفرت نہ دلاؤ۔ یعنی آپ ان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کیجئے جس کی وجہ سے لوگ آپ سے دور بھاگنے لگیں۔ آپ اگر دین کا کام کر رہے ہیں تو کوئی ایسا طریقہ نہ اپنائیے جس کی وجہ سے لوگ بجائے اس کے کہ آپ سے قریب ہوں، وہ طریقہ ان کو دور کرنے کا ذریعہ بنے، اور آپ کی ذات سے جو فیض و فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ نہ پہنچے۔

جامع ترین نبوی اصول

زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق یہ وہ بنیادی اصول ہیں جو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو دیئے۔ یعنی آسانی والا معاملہ ہونا چاہیے، سختی نہیں ہونی چاہیے۔ دھمکیاں دے کر کام لینے کے بجائے بشارت اور خوش خبری سنا کر کام لینا، لوگوں کو بدکاؤ کر کام لینے کے بجائے مانوس کر کے کام لینا چاہیے۔ چاہے بیوی کے ساتھ معاملہ ہو، چاہے اولاد کے ساتھ معاملہ ہو، اپنے ماتحتوں کے ساتھ معاملہ ہو، ملازمین کے ساتھ معاملہ ہو، یا کسی دوسرے کے ساتھ معاملہ ہو؛ ہر شعبے میں آپ یہ اصول اپنا سکتے ہیں۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی جامع تعلیمات میں سے ہے۔ آپ کے اشادات تو جوامع الکلم کے قبیل سے ہوا کرتے تھے، یعنی ایسی ہدایت جو زندگی کے ہر شعبے میں آدمی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ گویا یہ وہ ہدایت اور زندگی کا ایک بہت بڑا بنیادی اصول ہے جس سے آپ ہر جگہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بعض لوگ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کو زندگی کے ہر شعبے میں اختیار کرنے کے واسطے ایسا اونچا اصول بتلا دیا ہے کہ کوئی آدمی اگر اس ایک اصول

کو اپنالے، تو وہ اپنی زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔ بس آپ بھی کر کے دیکھ لیجئے!

جو نرمی سے محروم کر دیا گیا.....

۶۳۸ :- وعن جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

يَقُولُ: مَنْ يُجْرِمِ الرِّفْقَ يُجْرِمِ الْحَيْرَ كُلَّهُ. (رواہ مسلم.)

ترجمہ :- حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم

ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی نرمی سے محروم کر دیا گیا، وہ ہر بھلائی سے محروم کر دیا گیا۔

افادات :- حضور اکرم ﷺ نے نرمی کی اہمیت کو بتلانے کے لیے کتنی مبلغ

تعبیر اختیار فرمائی۔ گویا یہ ایک ایسی صفت ہے کہ اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صفت و خوبی نہیں ملی ہے اور اس کے مزاج میں یہ بات نہیں ہے، تو سمجھو کہ وہ بہت ساری خیر سے محروم رہ جاتا ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے؛ جس کے مزاج میں درستی، سختی اور اکھڑ پن ہوتا ہے تو غیر تو غیر؛ اپنے بھی اس سے دور بھاگتے ہیں۔ تمام ہی یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کا سامنا نہ ہو تو اچھا ہے۔ وہ اگر گھر میں آجائے تو گھر والے بھی ہر وقت دل سے دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں کہ یہ بلا جتنی جلدی ملے، اتنا ہی اچھا ہے۔ سب لوگ اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کب یہ گھر سے جائے۔ بلکہ اگر وہ گھر میں آئے تو دوسرے لوگ موقع نکال کر ادھر ادھر ہو جاتے ہیں کہ جناب تنہا ہی تشریف رکھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

نبی کریم ﷺ کی مختصر ترین نصیحت

۶۳۹ :- عن أبي هريرة رضي الله عنه أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: أَوْصِنِي. قَالَ:

لَا تَغْضَبْ. فَرَدَّدَ مَرَّارًا، قَالَ: لَا تَغْضَبْ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! مجھے نصیحت کیجئے (دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا: "أَوْصِنِي، وَأَوْجِزْ"، نصیحت کیجئے اور مختصر نصیحت کیجئے) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غصہ مت کرنا۔ اس نے بار بار یہی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا: غصہ مت کرنا۔

افادات:- گویا اس نے کم وقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کارآمد بات کی نصیحت کرنے کی درخواست کی، اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اگر اس طرح کی درخواست کرے، تو خلاف ادب نہیں ہے۔ اگر کوئی آپ سے ایسا کہے تو یہ مت سوچئے کہ عجیب آدمی ہے، نصیحت بھی چاہ رہا ہے، اور اوپر سے یہ بھی کہہ رہا ہے کہ مختصر کیجئے۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کسی آدمی کے پاس وقت کم ہوتا ہے، وہ آپ کے پاس فیض حاصل کرنے کے لیے آیا، ملاقات کر کے اس کو گاڑی پکڑنی ہے، یا کسی ضروری کام سے کہیں جانا ہے، اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ آپ سے کچھ فائدہ پہنچ جائے، اس لیے کہتا ہے کہ کوئی مختصر سی نصیحت کر دیجئے۔ اگر آپ لمبی چوڑی تقریر شروع کریں گے تو وہ سوچتا رہے گا کہ میں نے یہ بلا اپنے سر کہاں لے لی؟ اور یہی چیز کبھی لوگوں کو متنفر کرنے کا باعث بنتی ہے۔

ایک زریں نصیحت

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ آپ نے اعلان کیا کہ نماز کے بعد پانچ منٹ کے لیے بیٹھ جائیں، دین کی بات ہوگی۔ تو پانچ منٹ ہی وعظ کہئے؛ چھٹا منٹ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ نے جو وقت دیا ہے کہ پندرہ منٹ

بات ہوگی، تو پندرہ منٹ میں آپ بات نمٹا دیجیے۔ اس لیے کہ اگر آج آپ نے اس پر عمل نہیں کیا تو دوسرے موقع پر اگر آپ دو منٹ کا بھی اعلان کریں گے، تب بھی کوئی نہیں بیٹھے گا کہ فلاں صاحب نے پانچ منٹ کا کہا تھا اور پندرہ منٹ لگائے تھے، اور یہ طریقہ لوگوں کو دین کی بات سننے سے روکتا ہے۔ سیدھی سادی بات ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ویسے بھی یہ ایک وعدہ ہے، اور وعدہ کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور پھر وہ وعدہ جو مسجد میں، اللہ کے گھر میں، منبر کے پاس، اتنے سارے آدمیوں کے سامنے کیا گیا ہو؛ اور وہ پورا نہ کیا جائے، تو کتنی بری بات ہے! حالاں کہ جو ایسے ویسے لوگ ہوتے ہیں ان کو بھی منبر کے پاس لا کر سچی بات بلوانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور آپ تو دیندار آدمی ہو کر منبر کے پاس کیا ہو اور وعدہ پورا نہ کریں؛ تو پھر کیسے بات بنے گی؟۔

یہ بھی حکمت ہے

بمبئی جامع مسجد میں حضرت مولانا شوکت علی صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ میں جب بھی بمبئی جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اتنا بڑا شہر ہے اور اتنا مشغولی والا مجمع ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنے ایک ایک منٹ کو وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنا سب کاروبار چھوڑ کر جمعہ پڑھنے آتا ہے، اس کے باوجود جمعہ کی نماز کے بعد اس روز کا جو خطبہ ہوتا ہے، حضرت مولانا اس کی مختصر سی تشریح فرماتے ہیں۔ اور سب کو معلوم ہے کہ مولانا کا معمول یہ ہے کہ پانچ سات منٹ میں معاملہ نمٹا دیتے ہیں، تو کوئی بھی وہ بیان سننے بغیر نہیں جاتا، بلکہ جو لوگ اوپر نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نیچے آ کر بیٹھتے ہیں اور مولانا کی بات سن کر جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کون بیٹھتا؟ اس لیے صحیح بات تو یہی ہے

کہ یہ بھی حکمت کا ایک طریقہ ہے۔ اگر ہماری مساجد میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ جمعہ کی نماز کے بعد بیان ہوگا تو کتنے لوگ بیٹھیں گے؟ میں آپ کو یقین سے بتا دوں کہ ایک بھی نہیں بیٹھے گا۔

تقریرِ رسولِ حجت ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی نے یہ کہا کہ نصیحت کیجئے اور مختصر نصیحت کیجئے، تو اس کی یہ بات خلافِ ادب نہیں ہے۔ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اس پر کوئی تشبیہ نہیں فرمائی کہ تو عجیب آدمی ہے، ایک تو نصیحت کا مطالبہ کرتا ہے، اور ساتھ میں یہ بھی کہتا ہے کہ مختصر ہو۔ اگر اس کا یہ مطالبہ اور یہ درخواست غلط ہوتی تو نبی کریم ﷺ ضرور نکیر فرماتے کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ آپ ﷺ تو امت کی اصلاح کے لیے ہی بھیجے گئے تھے، اس لیے کسی غلط بات کو آپ باقی نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور حضورِ اکرم ﷺ کا کسی بات پر خاموشی اختیار کرنا اور تردید نہ کرنا، اس بارے میں تمام علماء بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ یہ اس چیز کے جائز اور درست ہونے کی علامت ہے۔ اہل علم موجود ہیں وہ جانتے ہیں کہ تقریرِ رسولِ حجت ہے۔ خیر! آپ ﷺ نے بھی اس کی بات مانتے ہوئے صرف ایک لفظ میں بہت مختصر نصیحت فرمائی: ”غصہ مت کرنا“۔ جس نے مختصر نصیحت کی درخواست کی تھی وہ بھی حیرت میں پڑ گیا کہ اتنی مختصر نصیحت ارشاد فرمائی، حالاں کہ میرے پاس تو ابھی وقت ہے، اس لیے اس نے پھر وہی درخواست کی، تو آپ ﷺ نے پھر یہی فرمایا: غصہ مت کرنا۔ دیکھو! آپ ﷺ نے کیسی عجیب نصیحت فرمائی۔ اس لیے کہ غصہ نہیں کریں گے تو اس کے لیے بردباری اور حلم لازم ہی ہے۔ جب کوئی بات غصہ پیدا کرنے والی سامنے آئے تو آپ کو غصہ نہیں کرنا ہے۔ تو پھر کیا کرنا ہے؟ بردباری اختیار کرنی ہے اور برداشت کرنا ہے۔ باب قائم کیا تھا کہ بردباری سے کام لو، وہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

گناہ کے دو محرکات

یہ درحقیقت بہت مختصر سی نصیحت ہے لیکن آدمی کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب لانے والی ہے۔ اس لیے کہ علماء فرماتے ہیں کہ انسان کی طبیعت کے اندر گناہ کے محرکات دو ہیں: ایک غصہ اور دوسرا شہوت۔ عام طور پر آدمی جب گناہ کرتا ہے تو یا تو شہوت اور خواہش نفس کی وجہ سے کرتا ہے، جیسے کسی چیز کی کھانے کی خواہش ہوئی اور وہ مل رہی ہے، لیکن پسپے نہیں ہیں تو آدمی چوری کرتا ہے۔ یا کوئی غلط خواہش پیدا ہوئی، اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو زنا، چوری اور اس قسم کے جتنے بھی گناہ ہیں جن کو نفسانی گناہوں سے تعبیر کیا گیا ہے، آدمی وہ سب گناہ خواہش کے نتیجے ہی میں کرتا ہے۔

شہوت و غصہ میں ایک فرق

تو خواہش و شہوت کی وجہ سے جو گناہ ہوتے ہیں ان میں عام طور پر اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ لیکن غصہ کے نتیجے میں عام طور پر بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اس لیے کہ غصہ کے نتیجے میں یہ ہوگا کہ جس پر غصہ آیا ہے، وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ آپ کا ماتحت ہے اور آپ سے کمزور ہے۔ اگر آپ کا ماتحت اور آپ سے کمزور ہے تو غصہ میں آپ اس کی پٹائی کریں گے، اس کا چہرہ نوچیں گے، گالیاں دیں گے، برا بھلا کہیں گے، اور پتہ نہیں کیا کیا کریں گے، ایسے موقع پر آدمی اپنے ماتحتوں کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے، وہ سب آپ کریں گے۔

ویسے آدمی کے مزاج میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے غصہ رکھا ہے، اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بری چیز بھی نہیں ہے، بلکہ غصہ ایک خاص مقصد کے لیے رکھا گیا ہے کہ کسی آدمی کی جان پر حملہ ہو، اس کی عزت و آبرو پر حملہ ہو، اس کے مال پر حملہ ہو،

اس کے دین پر حملہ ہو؛ تو اس کا دفاع کر سکے۔ اگر آدمی کی طبیعت میں غصہ نہیں ہوگا تو وہ کبھی دفاع نہیں کر سکے گا۔ آدمی کے اندر جو ”ڈیفینس“ (Defence) کا جذبہ ابھرتا ہے، وہ اسی غصہ کے نتیجے میں ابھرتا ہے۔ آپ ستون کو کتنا ہی مار لیجئے، کچھ نہیں کرے گا، وہ آپ سے کوئی بدلہ نہیں لے گا، اس لیے کہ ستون کے اندر غصہ ہے ہی نہیں۔ معلوم ہوا کہ غصہ بھی ضروری ہے، انسان کی طبیعت میں غصہ تو ہونا ہی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر رکھا ہے، لیکن اس غصہ کو جہاں استعمال کرنا چاہیے، وہیں استعمال کیا جائے دوسری جگہ پر نہیں۔ جیسا کہ میں نے پچھلی مجلس میں بھی کہا تھا کہ غصہ کے نتیجے میں آدمی کی عقل مغلوب اور ختم ہو جاتی ہے، جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو وہ عقل سے کام نہیں لیتا۔ اور عقل سے کام نہ لینے کی میں نے کچھ مثالیں بھی دی تھیں۔

غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر

اور ایک بات یاد رہے کہ شریعت نے غصہ تو اپنے اوپر آنے والے نقصان کو دور کرنے کے لیے رکھا ہے، اگر کسی کی حرکت سے آپ کو کوئی نقصان ہوا ہے تو اس نقصان کو دور کرنے کے لیے جتنی مقدار غصہ کی ضروری ہے، وہ کیجئے۔ مثلاً: آپ کی بنیادی ضرورت کی کوئی چیز تھی، اس میں اس نے نقصان پہنچا دیا، آپ کا کھانا چھین لیا، آپ کا مال چھین لیا، تو آپ اس سے واپس لیجئے۔ شریعت نے بدلہ اور انتقام کی جوابی کارروائی کی اتنی اجازت دی ہے جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی ہے ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوِّقْتُمْ بِهِ﴾ اگر تمہیں بدلہ ہی لینا ہے، تو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لو، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دی گئی ہے، ورنہ ظلم اور زیادتی ہوگی۔

تو اگر ہمارا کسی ایسی چیز کا نقصان ہوا جس کی وجہ سے ہماری جان، ہمارے

مال یا ہماری بنیادی ضرورتوں پر زبرد پڑتی ہے؛ تو غصہ کے ذریعہ سے اپنا دفاع کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر کسی بنیادی ضرورت پر زبرد نہیں پڑتی، بلکہ کسی نے کچھ ایسا کیا جس کی وجہ سے آپ کے جاہ پر اثر پڑا۔ مثلاً: اس نے گالی دی، تو اس سے آپ کا کیا نقصان ہوا؟ آپ جس منصب پر ہیں، کیا آپ اس منصب سے نیچے آگئے؟ یا آپ کا عہدہ چھین گیا؟ نہیں۔ آپ اگر وزیر اعظم ہیں اور کوئی آدمی سوگالیاں دے، تب بھی آپ کی وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر کوئی خطرہ نہیں آئے گا، وہ جوں کی توں باقی رہے گی۔ یا اس نے گالی دی تو آپ کا مال گھٹ گیا؟ آپ کی فیکٹری بند ہوگئی؟ آپ کی تجارت کے اندر جو منافع ہوتا تھا، وہ گھٹ گیا؟ اس کے گالی دینے سے آخر نقصان کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں ہوا۔ تو اگر کسی نے گالی دی، تو یوں سوچ لیجئے کہ اس کی وجہ سے جب میرا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا تو پھر جانے دو، اس نے گالی دی تو دی، اس سے کیوں الجھنا۔ ویسے شریعت نے اجازت دی ہے کہ اگر کوئی برا لفظ کہے تو آپ برا لفظ کہہ سکتے ہیں، لیکن حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور اخلاق بیان کئے گئے ہیں کہ دنیا کی کسی چیز کی وجہ سے آپ ﷺ کو غصہ نہیں آتا تھا۔ جیسے آپ کے بچے کے ہاتھ سے گلاس گر گیا اور ٹوٹ گیا، تو وہ ٹوٹنے والا تھا، ٹوٹ گیا، اب آپ اس پر غصہ کیوں کرتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا آپ کے غصہ کے بعد وہ گلاس ٹھیک ہو جائے گا؟ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اس کی تلافی ہونے والی نہیں ہے۔ اس لیے آدمی اگر یہ سوچ لے تو بہت سی چیزوں میں اپنے آپ کو غصہ سے بچا سکتا ہے۔

غصہ کے شاخسانے

تو بات یہ چل رہی تھی کہ گناہ کے محرکات دو ہیں، ایک شہوت اور دوسرا غصہ۔ اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں

نے بتلایا تھا کہ غصہ کے نتیجے میں سامنے والا اگر ماتحت ہے تو آپ اس پر زیادتی کریں گے، گالی دیں گے۔ زبان سے زیادتی ہوگی، ہاتھ سے زیادتی ہوگی، اور ہو سکتا ہے کہ اس کا وظیفہ بند کر دیں، یا پیسے دیتے تھے، وہ نہیں دیں گے، اس کو کپڑے دیے تھے، وہ واپس لے لیں گے، یہ سب آپ کریں گے؛ تو اس طرح آپ نے بندوں کو تکلیف پہنچائی۔

اور اگر وہ آپ سے اونچا آدمی ہے، قوت والا ہے کہ وہاں آپ دم نہیں مار سکتے تو ”خشم درویش بہ جان درویش“ والا معاملہ ہوگا، وہاں تو آپ کچھ کر نہیں سکتے اور طبیعت میں غصہ ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ غائبانہ اس کی غیبت کریں گے، اپنا غصہ اتارنے اور دل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس پر الزامات لگائیں گے۔ اس کے متعلق جھوٹی باتیں لوگوں کے اندر پھیلائیں گے کہ وہ ایسا ہے اور ویسا ہے۔ اس بیان بازی میں اگر واقعہ بیان کریں؛ تو غیبت ہے۔ اور اگر وہ عیوب اس میں نہیں ہیں تو بہتان ہے؛ اور دونوں کبیرہ گناہ ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو آپ اس کی وجہ سے اپنی طبیعت میں گھٹن محسوس کریں گے؛ اسی کو کینہ اور بغض کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب اس کو تکلیف پہنچے گی تو آپ خوش ہوں گے، لوگوں سے کہیں گے کہ اس کے ساتھ ایسا ہوا تو برابر ہی ہے، یہ اسی کا حقدار تھا۔

اس نے تو آپ کو ایک گالی دی تھی، لیکن ساری دنیا آ کر اس کو مار رہی ہے تو آپ خوش ہو رہے ہیں، حالاں کہ وہ بھی مسلمان ہے اور آپ بھی مسلمان ہیں، اور مسلمان بھائی ہونے کی حیثیت سے آپ کو اس کا بچاؤ کرنا چاہیے، اور اس کی امداد کرنی چاہیے، لیکن آپ نہیں کر رہے ہیں۔ تو غور کرو کہ اس غصہ نے ہم کو کتنی سخی سطح پر لا کر ڈال دیا کہ اسلامی اخوت و بھائی چارگی کی نسبت سے نبی کریم ﷺ نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں، ان کا بھی ہمیں خیال نہیں رہا! الْمُسْلِمُ أَخُ الْمُسْلِمِ؛ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ

وَلَا يَحْقِرُهُ. مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر زیادتی نہیں کرتا، اور اگر کوئی دوسرا زیادتی کرے، تو اس کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا، اور اس کو حقیر نہیں سمجھتا۔ لیکن یہاں یہ سب ہو رہا ہے۔

پھر مزید یہ ہوگا کہ جب اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت پہنچے گی؛ مثلاً: اس کے لیے ترقی کے اسباب پیدا ہوں گے تو اس غصہ کی وجہ سے آپ کو وہ بھی اچھے نہیں لگیں گے، آپ یہ تمنا کریں گے کہ اس کو یہ عہدہ کہاں مل گیا؟ جلدی سے چھن جانا چاہیے؛ اسی کا نام حسد ہے۔ تو دیکھو! ایک غصہ نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ اور پھر اس حسد اور بغض کے نتیجے میں آدمی کیا کیا کرتا ہے تو صرف ایک غصہ نے کتنے بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا کروا دیا!

اور شہوت و خواہش نفس کی وجہ سے ہونے والے اکثر گناہ تو وہ تھے جن کا تعلق حقوق اللہ سے تھا کہ حرام لقمہ کھالیا، کوئی حرام کام کر لیا، زنا کر لیا، لیکن غصہ کی وجہ سے عام طور پر جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اس کے نتیجے میں بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔

بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے

حضرت شیخ رحمہ اللہ نے آپ بیتی میں کبر کے بیان میں بڑے اہتمام سے اس چیز کو بیان کیا ہے کہ شیطانی گناہ آدمی کے لیے بڑے خطرناک ہیں، لیکن اگر کسی روز اپنی پچھلی زندگی کے متعلق رونے دھونے اور توبہ کی توفیق ہوئی اور آدمی نے سوچا کہ ہائے! میں نے کیا کیا کر ڈالا، اور پھر رات کی تنہائیوں اور اندھیروں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور دو آنسو بہا دیے؛ تو سارا معاملہ نمٹ گیا۔ لیکن اگر کسی کی پٹائی کی تھی، گالیاں دی تھی، چہرہ نوچا تھا، کپڑے پھاڑے تھے، اس کی کسی چیز کو نقصان پہنچایا

تھا، اس کی غیبت کی تھی اور اس پر تہمت لگائی تھی، اور پتہ نہیں کیا کیا کیا تھی؛ اب اگر احساس ہو تو چاہئے ہمیں دس رمضانوں تک دس شب قدر بھی مل جائے، اور کوئی اللہ کا بندہ بالیقین بتا دے کہ آج شب قدر ہے، اور آپ رات بھر جاگتے رہیں اور دعائیں کرتے رہیں اور توبہ کرتے رہیں؛ تب بھی وہ گناہ معاف ہونے والے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ جس کا حق ہے اسی سے معاف کر لو۔ اسی لیے حضور پاک ﷺ نے اس آدمی کی بار بار کی درخواست پر نصیحت فرمائی: غصہ مت کرنا۔ اگر اس ایک چیز ہی کو آدمی اپنالے؛ تو اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے۔

ہر کام اچھائی کے ساتھ انجام دینا چاہیے

۶۴۰:- وعن أبي يعلى شدد ابن اوس بن ابي يعلى عن رسول الله ﷺ قال:

إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَةَ، وَلْيُحَدِّدْ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُورِحْ ذَبِيحَتَهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو یعلیٰ شدد ابن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ

نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اچھا سلوک ہر چیز پر لازم کر دیا ہے، جب تم کسی کو قصاص میں قتل کرو یا جانور کو ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو، اور اپنی چھری کو تیز کر کے اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

افادات:- دیکھو! شریعت میں جن گناہوں کی وجہ سے قتل کی سزا مقرر

ہوئی ہے، جیسے قصاص کے طور پر کسی کو قتل کیا جائے؛ تو وہاں پر بھی تاکید کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ جان لینے کا جو معاملہ کیا جائے اس میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو تکلیف پہنچا پہنچا کر جان لی جائے، بلکہ ایک دفعہ میں معاملہ ختم کر دینا چاہیے، اس نے کسی کو قتل کیا تھا اس کے بدلہ میں اس کو قتل کیا جا رہا ہے، تو اس نے چاہے کسی بھی

طریقہ سے قتل کیا ہو، گھٹا گھٹا کر جان لی ہو، لیکن اس کو تو آپ ایک جھٹکے ہی میں ختم کر دو۔ اسی طرح اگر جانور ذبح کر رہے ہیں تو اچھی طرح ذبح کرو۔ اسی لیے یہ تعلیم ہے کہ چھری کو اچھی طرح تیز کر لو۔ دیکھو! اپنی ضرورت کی وجہ سے آدمی جانور ذبح کرتا ہے لیکن اس میں بھی اچھا سلوک اور بھلائی والا طریقہ اپنانے کا حکم دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی چھری کو تیز کر کے اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ، یعنی اس طرح ذبح کیجیے کہ وہ جلدی سے ذبح ہو جائے۔ گویا اس میں بھی اچھا طریقہ یہی تھا اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی۔ تو ہر کام کو اچھائی کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔

بندہ بن کر رہے

۶۴۱:- وعن عائشة بنت النبي قالت: مَا حَيَّرَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَحَدًا أَيْسَرَهُمَا، مَا لَمْ يَكُنْ إِثْمًا، فَإِنْ كَانَ إِثْمًا، كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ. وَمَا انْتَقَمَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ قَطُّ، إِلَّا أَنْ تَنْتَهَكَ حُرْمَةَ اللَّهِ، فَيَنْتَقِمَ اللَّهُ تَعَالَى.

ترجمہ:- حضرت عائشہ بنت النبی فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب کبھی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان و سہولت والی ہوتی تھی اسی کو اختیار فرماتے تھے، جب تک کہ اس میں نافرمانی نہ ہو۔ اگر کسی کام میں گناہ کا پہلو ہوتا تو اس سے آپ لوگوں میں سب سے زیادہ دور رہتے تھے۔ اور آپ نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام اور بدلہ نہیں لیا۔ ہاں! البتہ اگر اللہ پاک کا کوئی حکم توڑا جاتا تو آپ بدلہ لیتے تھے (اس میں آپ معاف نہیں کرتے تھے۔)

افادات:- آسانی والی بات کو اختیار کرنے میں اپنی عبدیت کا اظہار ہے، اسی لیے حدیث پاک میں آیا ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس طرح

یہ چاہتے ہیں کہ عزیمت والی چیز کو اختیار کیا جائے، وہیں اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتے ہیں کہ رخصت پر عمل کیا جائے۔ (شعب الایمان: ۳۶۰۶)

شریعت کے احکام میں دو پہلو ہوتے ہیں: عزیمت اور پختگی والا اعلیٰ پہلو، اور دوسرا سہولت والا پہلو۔ جیسے آپ رمضان کے مہینہ میں سفر میں ہیں، تو آپ کو روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے، پھر بھی آپ رکھیں تو یہ عزیمت ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان سہولتوں والے احکام کو اسی طرح اختیار کیا جائے جیسے عزیمت والے احکام کو اختیار کیا جاتا ہے۔ شریعت کی دی گئی سہولت کو اختیار نہ کرنے میں گویا اپنی بہادری دکھانا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ بندہ تو بندہ بن کر رہے یہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب بیمار ہوتے تو بہت چلا تے تھے۔ کوئی کہتا: حضرت! اتنا کیوں چلا تے ہیں؟ تو فرماتے: بھائی! اللہ تعالیٰ نے بیماری دی ہی اس لیے ہے کہ اس کو ہمارا چلا ناپسند ہے؛ لہذا چلاؤ۔ ہم اپنی بہادری نہیں دکھلاتے کہ میں بہت برداشت کر سکتا ہوں۔ یہ حضرت کے مزاج کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے پہلو کو غلط بتلانا چاہتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ پہلو عبودیت والا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ حضور اکرم ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ دو کاموں میں سے جو آسان ہوتا تھا اسی کو اختیار فرماتے تھے، البتہ وہ گناہ نہیں ہونا چاہیے۔

ہمارا مزاج برعکس ہو گیا

اور نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام اور بدلہ نہیں لیا۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑا جا رہا ہو تو آپ بدلہ لیتے تھے، اس میں آپ معاف نہیں کرتے

تھے۔ ایک مؤمن کی شان بھی یہی ہونی چاہیے۔ آج ہمارا مزاج اس کے برعکس ہو گیا ہے، شریعت کے احکام توڑے جا رہے ہیں، جیسے بیٹا نماز نہیں پڑھتا، گناہوں کے کام کرتا رہتا ہے، باپ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، لیکن کبھی اس کو غصہ نہیں آتا، اور اس کو روکنے کی کوشش نہیں کرتا، لیکن اگر یہی بیٹا دوکان پر حاضری نہ دے تجارت میں نقصان کر دے، کوئی ایسا فیصلہ کر لے جس سے فیکٹری پر آئینج آجائے، تو فوراً غصہ بھڑک اٹھتا ہے۔ بیوی نماز نہیں پڑھتی، بے پردہ رہتی ہے، دوسرے گناہوں میں مبتلا ہے، لیکن کبھی نرمی سے بھی نہیں روکتے، لیکن اگر کھانے میں نمک مرچ زیادہ ہو جائے، پلیٹ توڑ دے، یا کچھ اور نقصان پہنچا دے؛ تو میاں صاحب بڑے غصہ میں آجاتے ہیں۔ جہاں معاف کرنا تھا وہاں غصہ کرتے ہیں اور جہاں معاف نہیں کرنا تھا وہاں معاف کر رہے ہیں۔ ہر جگہ ہمارا یہی حال ہو چکا ہے۔

جب مذہب پر حملہ ہو

اس وقت ہمارے اس ملک میں اسلام کے تعلق سے غیروں کی طرف سے جو اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں، جیسے کہ اسکولوں میں ایسا نظام لایا جا رہا ہے کہ بچے اسلام سے محروم ہو جائیں۔ یا وندے ماترم کہو۔ یا سرسوتی دیوی کی وندنا کرو، جو قانون یوپی میں لازماً لایا گیا تھا، اسی طرح کی اور چیزیں جو ان کی طرف سے لائی جاتی ہیں تو ایسے موقعوں پر اجتماعی طور پر اپنے دین کی حفاظت کے لیے، اللہ کے خاطر اس کا دفاع کرنا سب پر فرض اور لازم ہو جاتا ہے، لیکن وہاں کوئی نہیں بولتا۔ اور جب قومی فسادات ہوتے ہیں تو چوں کہ اس میں اپنی جان پر آتی ہے، اپنا کاروبار لٹتا ہے، تو جواب دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ حالاں کہ دفاع یہاں پر بھی کرنا ہے۔ میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس وقت

ابتداء دینی امور سے ہوتی ہے، اس وقت ہم خاموش رہتے ہیں، اور پھر جب یہی معاملہ آگے بڑھتے بڑھتے ہماری جانوں، ہمارے کاروبار اور ہماری متعلقہ چیزوں تک آتا ہے تو ہم شور مچاتے ہیں۔ اگر یہی شور ہم نے پہلے دن مچایا ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نوبت آنے ہی نہ دی جاتی۔

اس لیے ہر جگہ اس کا اہتمام ضروری ہے کہ دین کا جہاں معاملہ ہو وہاں آدمی خاموش نہ رہے، وہاں غصے کا اظہار ہونا چاہیے، اور اپنی ذات کے لیے درگزر، عفو و صفح سے کام لینا چاہیے، یہی سیر چشمی اور اعلیٰ ظرفی کہلاتی ہے کہ اپنا معاملہ ہو تو آدمی معاف کر دے۔ لیکن اگر دین کا معاملہ ہو تو وہاں معاف کرنا سیر چشمی نہیں کہلاتی۔

جنتیوں کی چند صفات

۶۴۲:- وعن ابن مسعود بنی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَخْرُجُ عَلَى النَّارِ؟ أَوْ يَمُنُّ تَخَرُّمٌ عَلَيْهِ النَّارُ؟ تَخَرُّمٌ عَلَى كُلِّ قَرِيبٍ، هَلْبِنٌ، لَبِيبٌ، سَهْلٌ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود بنی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں وہ آدمی نہ بتلاؤں جو جہنم پر حرام ہے یا جہنم اس پر حرام ہے؟ پوچھا گیا: کون؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنم ہر اس آدمی پر حرام ہے جو لوگوں سے قریب ہو، طبیعت کا نرم ہو، اور سہولت پیدا کرنے والا ہو۔

افادات:- حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو بلائیں گے اور تمام اولیٰین و آخرین کے سامنے فرشتوں سے پوچھیں گے کہ اس کے اعمال نامہ میں کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ تو سب جانتے ہیں پھر بھی پوچھیں گے۔ فرشتے کہیں گے

کہ کوئی زیادہ نماز روزے تو ہیں نہیں، البتہ اس کے ساتھ جب کوئی زیادتی کرتا تھا تو یہ معاف کر دیتا تھا۔ اور اس کے جو مالی مطالبے لوگوں پر ہوتے تھے، جیسے کسی کو بطور قرض پیسے دے رکھے ہیں، اس سے وصولی کرنی ہے اور سامنے والا کہتا کہ بھائی! ابھی میرے پاس گنجائش نہیں ہے، تو وہ اپنے آدمیوں سے کہتا تھا کہ اس کے ساتھ نرمی کرو۔ باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب یہ بندہ اور مخلوق ہو کر ایسا کرتا تھا تو میں تو اور زیادہ اس بات کا حقدار ہوں اور سب کے سامنے اس کا اعزاز کیا جائے گا اور اس کے لیے جنت کا فیصلہ

ہوگا۔ (بخاری: باب مَا ذُكِرَ عَنْ نَبِيِّ إِسْرَائِيلَ، حدیث: ۳۳۵۱/مسلم: باب فَضْلِ إِنْظَارِ الْمُعْصِرِ.)

تو حقیقت یہ ہے کہ بردباری، غصہ کو روکنا اور نرمی کا معاملہ کرنا؛ یہ شریعت کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہے۔ اگر آدمی اپنی زندگی میں اس ایک اصول کو اپنالے اور حضور اکرم ﷺ کی اس ایک ہدایت کو اختیار کر لے تو ہر اعتبار سے کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

باب العفو

والاعراض عن الجاهلین

نادانوں کو معاف کرنا
اور

چشم پوشی سے کام لینا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

چشم پوشی سے کام لینا

پچھلے دو تین عنوانات جو گزرے ان میں صبر اور بردباری کا بیان تھا۔ اب ایک ذیلی اور ضمنی عنوان قائم کیا ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے ہیں، اور جو مناسب رویہ اختیار کرنا چاہیے، ویسا رویہ اور سلوک اختیار کرنے کے بجائے، ناروا اور غلط سلوک کرتے ہیں، ایسوں سے صرف نظر کرنا، چشم پوشی سے کام لینا، ان کو معاف کر دینا اور درگزر کرنا۔

صبر اور تحمل کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کو برداشت کر لیا، اب آگے کا درجہ یہ ہے کہ آپ اس کے اس غلط رویہ کا انتقام لے سکتے ہیں، آپ میں اس کی طاقت بھی ہے اور کوئی ایسی صورت بھی ہے جہاں شریعت نے آپ کو اس سے اتنا بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، جتنی زیادتی اس نے آپ کے ساتھ کی ہے، اس کے باوجود آپ چھوڑ دیں اور اس کو معاف کر دیں؛ تو یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ اس صفت کو اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اسی سے متعلق کچھ چیزیں یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

آیتیں تو تقریباً وہی ہیں جو پچھلے ابواب میں گزر چکیں، پہلی آیت ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ درگزر کو اپنا شیوہ اور عادت بنائیے، اور بھلی بات کا لوگوں کو حکم دیجیے، اور جو لوگ آپ کے ساتھ جہالت کا سلوک کریں ان سے چشم پوشی اور اعراض کیجیے۔

سورہ نور کی یہ آیت بھی پہلے گزر چکی ہے: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ درگزر سے کام لیں اور معاف کر دیں۔ کیا تم اس بات کو

پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ پہلے بھی گزرا کہ انہوں نے اپنی خالہ زاد بہن کے بیٹے حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نطقہ اور خرچہ بند کر دیا تھا، جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان والے قصہ میں نادانستہ حصہ لیا تھا، اور آئندہ نہ دینے کی قسم کھالی تھی، جس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ قصہ پہلے کئی مرتبہ تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔

﴿وَالكَافِرِينَ الْغَيْظُ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ یہ آیت بھی پہلے گزری ہے کہ جو لوگوں سے درگزر کرنے اور معاف کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے نیکو لوگوں کو پسند کرتا ہے اور ان سے محبت رکھتا ہے۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ جو آدمی صبر سے کام لے اور معاف کر دے، تو یہ بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عفو

۶۲۳:- وعن عائشة رضي الله عنها أنها قالت للنبي صلى الله عليه وسلم: هل أتى عليك يوم كان أشد من يوم أحد؟ قال: لقد لقيت من قومك، وكان أشد ما لقيت منهم يوم العقبة، إذ عرضت نفسي على ابن عبد ياليل بن عبد كلال، فلم يجبني إلى ما أردت، فانطلقت وأنا مهمومٌ على وجهي، فلم أستفق إلا وأنا بقرن الشعاب، فرفعت رأسي، وإذا أنا بسحابةٍ قد أظلّنتني، فنظرت فإذا فيها جبريلٌ عليه السلام، فناداني، فقال: إن الله تعالى قد سمع قول قومك لك، وما ردوا عليك، وقد بعث إليك ملك الجبال لتأمره بما شئت فيهم، فناداني ملك الجبال، فسلم عليّ، ثم قال: يا محمد إن الله قد سمع قول قومك لك، وأنا ملك

الجبال، وَقَدْ بَعَثَنِي رَبِّي إِلَيْكَ لِتَأْمُرَنِي بِأَمْرِكَ، فَمَا أَشَدَّتْ، إِنَّ شَدَّتْ أَطْبَقْتُ عَلَيْهِمُ الْأَخْشَابِينَ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ بَلْ أُرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((الْأَخْشَابَانَ)): الجبالان المَحيطان، مَمَكَّة. وَالْأَخْشَابُ: هُوَ الْجَبَل

الغليظ

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک مرتبہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: آپ پر اُحد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن گزرا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہاری قوم کی طرف سے مجھے بہت سی تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں، اور سب زیادہ سخت ایذا جو مجھے ان سے پہنچی وہ عقبہ والادن تھا۔ جس وقت میں نے ابن عبدیال لیل بن عبدکھلال کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا، اور اس کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی، تو اس نے وہ دعوت قبول نہیں کی۔ میں وہاں سے ایسی حالت میں واپس چلا کہ میں بڑا غمگین تھا، اس غم کی حالت سے میں نے ابھی کچھ سکون و قرار بھی نہیں پایا تھا کہ میں مقام قرن ثعالب میں پہنچا، جب میں نے اپنا سراو پر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک بادل سا آیا جس نے مجھ پر سایہ کر لیا، میں نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے مجھے پکار کر کہا: آپ نے قوم کی جو بات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی وہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے سنی اور انہوں نے جو جواب دیا وہ بھی سنا، اب آپ کے پاس پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا ہے تاکہ آپ ان کے سلسلہ میں اس فرشتے کو جو چاہیں حکم کریں، وہ حکم بجالائے گا۔ چنانچہ پہاڑوں کے فرشتے نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا اور عرض کیا: اے محمد (ﷺ)! آپ کی قوم نے آپ کو جو جواب دیا وہ اللہ تعالیٰ نے سنا۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے تاکہ آپ ان کے سلسلہ میں جو چاہیں حکم کریں، میں ایسا ہی کروں گا۔ فرمائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو آس پاس کے ان دونوں پہاڑوں کو میں ایک کر دوں (اور یہاں والے

درمیان میں پس جائیں۔) حضور اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: نہیں! بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا کریں گے، جو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہیں ہوں گے۔

افادات:- غزوہٴ اُحد؛ مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان ۳ھ میں ایک جنگ ہوئی تھی۔ مشرکین مکہ لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے آئے تھے اور نبی کریم ﷺ مسلمانوں کو لے کر ان کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے باہر۔ جہاں اُحد پہاڑ واقع ہے۔ تشریف لے گئے تھے، اور وہاں دونوں لشکروں کے درمیان مقابلہ ہوا، شروع میں تو مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا لیکن نبی کریم ﷺ نے کچھ لوگوں کو ایک مخصوص جگہ پر مقرر کیا تھا اور ان کا مورچہ بنایا تھا کہ اس جگہ کو نہ چھوڑنا، چاہے ہم کامیاب ہوں یا ناکام۔ لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کی کامیابی دیکھی، تو اپنی وہ جگہ۔ جہاں ان کو حفاظت کے لیے مقرر کیا تھا۔ چھوڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں آخر میں مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ ستر (۷۰) سے زیادہ صحابہ کرامؓ شہید ہوئے۔ خود نبی کریم ﷺ کو بھی بہت زیادہ چوٹ آئی، آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا، آپ کے دندان مبارک کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا، آپ کو اور بھی زخم آئے، یہ بڑا سخت دن تھا؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی کے متعلق پوچھا۔ اس سوال کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے وہ ارشاد فرمایا جو اوپر گزرا۔

دیکھئے! نبی کریم ﷺ کے ساتھ دعوتِ ایمان پیش کرنے کے جواب میں قوم کی طرف سے جو نازیبا سلوک کیا گیا تھا؛ اس سے نبی کریم ﷺ کی طبیعتِ مبارکہ پر بڑا اثر ہوا تھا، غم و حزن اور تکلیف کی کیفیت آپ پر چھا گئی تھی، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے پاس فرشتہ بھیجا گیا، اگر آپ چاہتے تو قوم کی طرف سے کیے گئے

اس نازیبا سلوک کا بدلہ لے سکتے تھے۔ فرشتے نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے یہ بات پیش کی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پھینک کر رکھ دوں لیکن نبی کریم ﷺ نے معافی اور درگزر سے کام لیا، اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر یہ ایمان نہیں لائے تو ان کی نسلوں سے اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے لوگ پیدا کریں گے جو ایمان لائیں گے، اور خالص اللہ ہی کی عبادت کریں گے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نبی کریم ﷺ کا یہ عمل پیش کر کے ہمیں یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ اتنا زیادہ ایذا رسانی اور بد اخلاقی کا سلوک کیا گیا، اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے غنودرگزر اور چشم پوشی سے کام لیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ بھیجا گیا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو وہاں سے بھی منظوری مل چکی تھی، لیکن حضورِ اکرم ﷺ نے معاف کر دیا۔ یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔

حضورِ اکرم ﷺ نے کسی کو نہیں مارا

۶۴۴:- وَعَنْهَا نَبِيُّ اللَّهِ قَالَ: مَا ضَرَبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ شَيْئاً قَطُّ بِيَدِهِ، وَلَا امْرَأَةً وَلَا خَادِمًا، إِلَّا أَنْ يُجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَمَا نِيلَ مِنْهُ شَيْءٌ قَطُّ فَيَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهِ، إِلَّا أَنْ يُنْتَهَكَ شَيْءٌ مِنْ حَرَامِ اللَّهِ تَعَالَى، فَيَنْتَقِمَ اللَّهُ تَعَالَى. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، نہ کسی عورت کو، نہ خادم، نوکر اور غلام کو؛ البتہ اللہ کے راستہ میں اگر آپ جہاد میں شریک ہوتے؛ اس وقت دشمنوں کے مقابلہ میں کوئی بات ہوتی۔ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی گئی، آپ کو کسی نے تکلیف پہنچائی، تو آپ نے اس سے کبھی انتقام نہیں لیا، البتہ اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کا اگر کوئی آدمی ارتکاب کرتا، اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو

توڑتا؛ تو اس پر نبی کریم ﷺ ناراض ہو کر اس سے انتقام لیتے تھے۔

افادات:- حد و تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے، مثلاً کسی نے زنا کا ارتکاب کیا اور حضور اکرم ﷺ کے سامنے وہ معاملہ پیش ہوا، اور زنا ثابت ہو گیا؛ تو حضور معاف نہیں کرتے تھے، کیوں کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب حاکم وقت کے سامنے مجرم کا کوئی ایسا جرم آجائے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا مقرر کی گئی ہے، تو حاکم اس کو معاف نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، اس کو معاف کرنے کا حاکم کو اختیار نہیں ہے

یہی مساوات ہے

حدیث پاک میں آتا ہے کہ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت فاطمہ مخزومی تھی، بنو مخزوم قریش کا بڑا اونچا قبیلہ سمجھا جاتا تھا، ابو جہل بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر اس نے چوری کی، تو قبیلہ والے سہم گئے کہ چوری کا ثبوت ہو گیا ہے؛ اب ہاتھ کاٹا جائے گا اور پورے قبیلے کی بدنامی ہوگی۔ اس لیے لوگ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ حضور اکرم ﷺ سے بات کی جائے کہ درگزر سے کام لیجیے؛ لیکن حضور اکرم ﷺ سے جا کر کون کہے؟ لوگوں نے کہا: حضرت اسامہ بن زید کو تیار کرو، کیوں کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے، اور حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہی کے بیٹے تھے۔ یہ بھی حضور اکرم ﷺ کے بڑے لاڈلے تھے، اس لیے لوگوں نے کہا کہ اگر وہ حضور اکرم ﷺ سے جا کر کہیں گے تو ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کچھ چھوڑ چھاڑ دیں۔ چنانچہ سب بڑے لوگوں نے ان سے کہا اور یہ ان سب کے کہنے پر نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور عرض کیا، تو حضور ﷺ سخت ناراض ہوئے، اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "اَتَشْفَعُ فِي حَدِّ مِّنْ حَدِّ اللَّهِ؟" اللہ تعالیٰ کی مقرر کی

ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کے معاملہ میں تم سفارش لے کر آئے ہو؟ اگلی تو میں اسی پر تو ہلاک ہوئی ہیں کہ ان میں سے جب کوئی نچلے درجہ کا آدمی کوئی قصور کرتا تو جو سزا مقرر ہوتی وہ اس کو دی جاتی، اور اونچے خاندان کا آدمی اگر وہی قصور کرتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر بڑی ناراضگی کا اظہار فرمایا، پھر فرمایا: میری بیٹی فاطمہ (عازھا اللہ منہا) بھی اگر ایسے جرم کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔ (بخاری

شریف: باب كَرَاهِيَةِ الشَّفَاعَةِ فِي الْحَيِّ إِذَا رُفِعَ إِلَى السُّلْطَانِ رَقْم: ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰)

دیکھئے! اسلام میں تو مساوات ہے۔ اور مساوات کا مطلب یہی ہے کہ قانون کے نافذ کرنے معاملہ میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کیا جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کسی بڑے آدمی نے کی ہو، یا چھوٹے آدمی نے کی ہو؛ اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہے، اس کے جاری کرنے کے معاملہ میں کسی کی کوئی رورعایت نہ برتی جائے؛ یہی مساوات ہے۔

قیامت تک کے لیے یہی اصول ہے

میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اگر شریعت کا کوئی حکم توڑا جاتا اور اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہوتی، اس سزا کو جاری کرنے کے معاملہ میں نبی کریم ﷺ کوئی رورعایت نہیں فرماتے تھے، اور نہ رورعایت کی جاسکتی تھی، قیامت تک کے لیے تمام حکام کو یہی حکم ہے کہ ایسے معاملہ میں کوئی رورعایت نہ کریں۔ ہاں! اگر اپنا ذاتی معاملہ ہوتا، آپ کی ذات بابرکات کے ساتھ کوئی آدمی اگر ناروا معاملہ کرتا تو حضور اکرم ﷺ اس سے کوئی انتقام اور بدلہ نہیں لیتے تھے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ اگر ہماری ذات کے ساتھ کسی نے کوئی ناروا سلوک کیا ہے تو ہم درگزر سے کام لیں۔

لیکن آج ہمارا معاشرہ بدل چکا ہے، دین کے معاملہ میں جہاں شریعت نے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی وہاں چھوٹ چھاٹ دیدیتے ہیں، کیوں کہ اس میں ہمارا تو کچھ نہیں بگڑتا، چاہے شریعت ٹوٹی رہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اور جہاں اپنی ذات کا معاملہ آتا ہے، وہاں ہم چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حالاں کہ اصل تو یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں آدمی درگزر سے کام لے اور معاف کر دے۔ اور جہاں شریعت کا کوئی حکم ٹوٹ رہا ہو، وہاں ذرا بھی رورعایت سے کام نہ لے، اس لیے کہ اصل چیز حکم الہی ہے۔

ایک دیہاتی کا طرز اور آپ ﷺ کا عمل

۶۴۵:- وعن أنس بن مالك قال كنت أمشي مع رسول الله ﷺ وعليه بُرْدٌ نَجْرَانِيٌّ غَلِيظُ الحَاشِيَةِ، فأدركه أعرابيٌّ فجذَّه بِرِداءِهِ جَبْدَةً شَدِيدَةً، فَنَظَرْتُ إِلَى صَفْحَةِ عَاتِقِ النَّبِيِّ ﷺ وَقَدْ أَثَرَتْ بِهَا حَاشِيَةُ الرِّداءِ مِنْ شِدَّةِ جَبْدَتِهِ، ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! مُرِّمِي مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي عِنْدَكَ، فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ، فَضَحَكَ ثُمَّ أَمَرَ لَهُ بِعَطَاءٍ.

ترجمہ:- حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا، حضور اکرم ﷺ کے جسم مبارک پر نجران کی بنی ہوئی موٹے کنارے والی ایک چادر تھی، ایک دیہاتی آیا اور آپ کو اس چادر سے پکڑ کر زور سے اس طرح کھینچا کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کی گردن مبارک پر دیکھا کہ چادر کو زور سے کھینچنے کی وجہ سے نشان پڑ گیا (دراصل وہ دیہاتی کچھ بات کرنا چاہتا تھا تو اس نے اس طریقہ سے معاملہ کیا) پھر کہنے لگا: اللہ تعالیٰ کا جو مال آپ کی تحویل اور تصرف میں ہے اس میں سے میرے لیے کچھ دینے کا حکم دیجیے (حالاں کہ یہ بات

یہی بھی عرض کر سکتا تھا لیکن اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا) حضور اکرم ﷺ اس کو دیکھ کر مسکرائے اور اس کو دینے کا حکم فرمایا۔

افادات:- اس روایت کو لا کر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ آدمی صبر و تحمل اور بردباری سے کام لے، برداشت کرے، معاف بھی کرے اور مزید احسان بھی کرے؛ گویا یہ چاروں کام کرے۔ پہلا درجہ صبر کا ہے، پھر تحمل کا درجہ ہے، اس کے بعد معافی کا درجہ ہے، اور معافی کے بعد احسان کا درجہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا بتلایا ہوا اصل طریقہ یہی ہے۔ یہاں دیکھئے! آپ ﷺ نے اس کے اس معاملہ پر ذرہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ نہ صرف یہ؛ بلکہ مسکرا کر اس کے ساتھ پیش آئے اور اس نے جو درخواست کی تھی وہ بھی پوری فرمائی۔

بردباری کا عجیب امتحان

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمیوں کے درمیان بحث ہوئی، ایک کہنے لگا: حضرت امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ۔ جو بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ زیادہ بردبار اور حلیم ہیں۔ دوسرے نے کہا: حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ بردبار اور حلیم ہیں۔ جو حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو زیادہ بردبار کہتا تھا اس نے کہا کہ میں امتحان لیتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کتنے بردبار ہیں۔

چوں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ اس کا بھی قصہ یہ ہوا کہ (آپ کی عادت تو رات کے آخری حصہ ہی میں اٹھنے کی تھی) ایک مرتبہ تشریف لے جا رہے تھے تو ایک بڑھیا نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کسی سے کہا: یہ نوجوان عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتا ہے، امام

صاحب نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہنے لگے: لوگ میرے متعلق ایسا گمان رکھتے ہیں اور میں تو ایسا ہوں نہیں۔ چنانچہ اسی دن سے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھنا شروع کر دی، اور پھر چالیس سال تک آپ کا یہ معمول رہا۔

اسی معمول کی وجہ سے آپ رات بھر سوتے نہیں تھے۔ اور چوں کہ تجارت بھی تھی، علمی مشغلہ بھی تھا تو فجر کی نماز کے بعد سے ظہر تک مسائل بتلانے میں اور دوسرے کاموں میں لگے رہتے تھے اور ظہر کے بعد کھانا کھا کر عصر تک قیلولہ کرتے تھے۔ بس لے دے کر قیلولہ کا اتنا وقت ہی آپ کے آرام کا تھا۔

خیر! ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امام صاحب ظہر کے بعد لیٹنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ اس آدمی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام صاحب نیچے اترے اور کہا: فرمائیے؛ کیا کام ہے؟ اس نے کہا: میں ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ حالاں کہ سب کو معلوم تھا کہ آپ مسائل بتلانے کے لیے صبح کے وقت بیٹھتے ہیں، اس وقت وہ آیا نہیں، اور آرام کے وقت پہنچا۔ خیر! فرمایا: کہو کیا مسئلہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں بھول گیا کہ کیا پوچھنا چاہتا تھا۔ امام صاحب نے اس سے کہا: اچھا جب یاد آجائے تو پوچھ لینا، آپ نے دروازہ بند کر لیا، اوپر جا کر ابھی لیٹنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام صاحب اتر کر آئے تو وہی آدمی سامنے تھا۔ اس نے کہا: آپ اوپر تشریف لے گئے تو مجھے وہ مسئلہ یاد آ گیا، لیکن آپ اتر کر ابھی آدمی سیرھی پر ہی پہنچے ہوں گے کہ پھر میں بھول گیا، تو امام صاحب نے کہا: بہت اچھا! جب یاد آجائے تو پوچھ لینا اور اس کو رخصت کیا، دروازہ بند کیا اور اوپر گئے اور لیٹے بھی نہیں تھے کہ تیسری مرتبہ پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ پھر اترے تو وہی آدمی تھا، کہنے لگا: مجھے مسئلہ یاد آ گیا ہے، آپ نے ذرہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور فرمایا: اچھا بھائی! پوچھو کیا مسئلہ ہے؟ تو

اس نے سوال کیا کہ انسانی پاخانہ کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟ میٹھا یا کڑوا؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: جب وہ تازہ ہوتا ہے تو اس کا مزہ میٹھا ہوتا ہے، اور سوکھنے کے بعد کڑوا ہو جاتا ہے۔ اس پر اس نے پوچھا: کیا آپ نے چکھا ہے؟ امام صاحبؒ نے کوئی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کہا: ہر چیز کا مزہ معلوم کرنا چکھنے ہی پر موقوف نہیں ہے، بہت سی چیزیں آدمی عقل سے بھی معلوم کر سکتا ہے، دیکھو! جب وہ تازہ ہوتا ہے تو اس پر کھیاں بیٹھتی ہیں اور سوکھنے بعد کھیاں نہیں بیٹھتیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ تازہ ہونے کی حالت میں اس کا مزہ میٹھا ہوگا۔ خیر! جب امام صاحبؒ اس کو یہ جواب دے چکے تو اس نے کہا: حضرت! مجھے معاف کر دیجیے گا، دراصل میری اپنے ایک دوست کے ساتھ بحث ہو گئی تھی، میں آپ کے صبر و تحمل، عفو و درگزر کو آزما کر دیکھنا چاہتا تھا، میں اس سے ہار گیا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اتنا اونچا حوصلہ کون لاسکتا ہے! اسی لیے بزرگوں کے حالات اور قصے پڑھتے رہنا چاہئیں تاکہ ہماری بدمزاجی تھوڑی بہت ٹھیک ہوتی رہے، اگر ان کے حالات پڑھتے رہیں گے تو چاہے مکمل طور پر نہ سہی، کچھ نہ کچھ اعتدال تو آ ہی جائے گا۔

تکلیف دینے پر دعا دینے کا ایک نمونہ

۶۲۶:- وعن ابن مسعود رضي الله عنه قال كَانِي أَنْظِرُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَحْيَى

نَبِيًّا مِنْ الْأَنْبِيَاءِ، صَلَوَاتُ اللَّهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِمْ، ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَأَدْمَوْهُ، وَهُوَ يَمْسَحُ
الدَّمَّ عَنْ وَجْهِهِ، وَيَقُولُ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي، فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں گویا میں نبی کریم ﷺ

کو اپنی نظروں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک نبی کا حال بیان کر رہے ہیں جن کی قوم نے ان کو اتنا مار پیٹا کہ ان کے جسم سے خون بہنے لگا، اور وہ اپنے چہرہ سے خون صاف کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ

سے دعا کر رہے ہیں: اے اللہ! میری قوم کو معاف کر دے، اس لیے کہ وہ مجھے نہیں جانتے (کہ میں تیرا رسول ہوں، اگر وہ مجھے جانتے تو میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرتے۔)

افادات: - کبھی ایسا ہوتا ہے آدمی کوئی قصہ جو بہت مدت پہلے پیش آیا ہو اس کو ایسے انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا میری نگاہوں کے سامنے ابھی بھی وہ منظر بالکل تازہ ہے۔ یہاں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی انداز سے یہ حدیث بیان فرمائی۔ اس روایت میں بھی معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حال بیان کیا گیا ہے۔

حقیقی پہلوان

۶۴: - وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ. (متفق عليه)

ترجمہ: - حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔

افادات: - غصہ آئے تو اس کو برداشت کرنا اور غصہ کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا؛ یہی اصل بہادری ہے۔

(نوٹ: - یہ روایت حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد اول، صبر کے بیان صفحہ ۳۳۲)

پر گزر چکی ہے، وہاں غصہ کے موضوع پر تفصیلی کلام موجود ہے۔ مرتب۔)

باب إحتمال الأذى

تکلیف برداشت کرنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اوپر والے ہی مضمون سے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے: کوئی آدمی آپ کو تکلیف پہنچائے تو آپ اس تکلیف کو برداشت کر لیجیے۔ یہاں پر بھی امام نوویؒ دو آیتیں اور ایک روایت لائے ہیں، آیتوں کا ترجمہ اور تشریح تفصیل سے پہلے گزر چکی ہے۔

گرم را کھ ڈال رہا ہے

۶۴۸:- وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رجلاً قال: يا رسول الله! إن لي قرابةً أصلهم وَيَقْطَعُونِي، وَأَحْسِنُ إِلَيْهِمْ وَيُسَيِّئُونَ إِلَيَّ، وَأَحْلُمُ عَنْهُمْ وَيَجْهَلُونَ عَلَيَّ. فَقَالَ: لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ، فَكَاكِمًا تَسْفُهُمُ الْمَلَأَ، وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى ظَهِيْرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلَى ذَلِكَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے حقوق ادا کرتا ہوں؛ وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتے۔ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں، بھلائی واحسان کا معاملہ کرتا ہوں؛ وہ میرے ساتھ برائی کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ میرے اوپر زیادتی کرتے ہیں اور میں برداشت کرتا ہوں (گویا وہ میرے ساتھ جہالت اور نادانی والا سلوک کرتے ہیں اور میں برداشت کرتا ہوں) اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو جو بات کہہ رہا ہے اگر واقعاً ایسا ہی ہے؛ تو گویا تو گرم را کھ ان کے منہ میں ڈال رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے ساتھ ان کے خلاف برابر ایک مددگار رہے گا، جب تک تو اسی حالت میں ہے۔

افادات:- ویسے بھی را کھ کا منہ میں جانا آدمی کے لیے بڑی تکلیف دہ بات ہوتی ہے، اور ساتھ ہی چولہے کی گرم را کھ اگر منہ میں ڈالی جائے تو کیا حال ہوگا۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اس طرح معاملہ کر کے تو ان کو شکست دے رہا ہے۔ اور جب تک تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتا رہے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ تیری مدد کے لیے تیرے ساتھ رہے گا۔

فرشتہ گیا، شیطان آیا

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک آدمی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برا بھلا کہہ رہا تھا، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالکل خاموش تھے۔ نبی کریم ﷺ دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ پھر جب یہ سلسلہ جاری رہا اور دیر ہو گئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو جواب دینے لگے، نبی کریم ﷺ نے رخ پھر لیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے آپ نے چہرہ پھیر لیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تک تم خاموش تھے، اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا تھا جو تمہاری طرف سے اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ لیکن جب تم نے جواب دینا شروع کیا تو وہ فرشتہ وہاں سے ہٹ گیا اور شیطان آ گیا، اس لیے میں نے منہ پھر لیا۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ کی مدد آدمی کے ساتھ ہوتی ہے۔ (سنن ابوداؤد، باب فی الإبتصار۔ حدیث رقم: ۳۸۹۸)

بہادری یا بزدلی

آج کل تو ہمارے سماج اور معاشرہ میں اس چیز کو بزدلی کی علامت سمجھا جاتا ہے، گو یا بدلہ لینا ہی بہادری ہے۔ لیکن جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گزرا کہ اصل بہادری غصہ کو پی جانا، صبر کرنا اور معاف کر دینا ہے۔ غصہ کے وقت اپنے آپ پر کنٹرول رکھنے کا نام بہادری ہے۔ دنیا والوں کی اصطلاح چاہے کچھ بھی ہو لیکن شریعت اور نبی کریم ﷺ کی بتلائی ہوئی اصطلاح میں بہادری اسی کا نام ہے کہ آدمی غصہ کو پی جائے، دنیا والے چاہے اس کو بزدلی سے تعبیر کرتے رہیں۔ آج کل تو کوئی آدمی اگر ایسا کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس میں کچھ جان ہے یا نہیں؟ ارے بھائی! اس میں جان ہے تب ہی تو برداشت کر رہا ہے اور درحقیقت یہی قوت کی بات ہے، ذرا برداشت کر کے تو دیکھو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق و سعادت عطا فرمائے۔

الغضب إذا انتَهكت حرَمات الشرع
والانتصار لدين الله تعالى
شعار دین کی بے حرمتی کے وقت
غصہ کرنا
اور اللہ کے دین کے لیے بدلہ لینا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیْ لَوْلَا اَنَّ اللّٰهَ عَلَّمَنَا سُبُوْحًا وَمَا لَنَا اَنْ نَعْبُدَ اِلٰهًا غَيْرَ اللّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا اِنَّ اللّٰهَ لَکَرِیْمٌ عَلِیْمٌ
 اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا
 اَمَّا بَعْدُ :-

قال الله تعالى: -وَمَنْ يُعْظَمْ حُرْمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لّٰهُ عِنْدَ رَبِّهِ.

قال الله تعالى: -اِنْ تَنَصَّرُوْا لِلّٰهِ يُنْصِرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ.

غصہ کب کر سکتے ہیں؟

اب تک تو غصہ کی قباحت کو بیان کیا تھا کہ آدمی اپنے غصہ کے اوپر کنٹرول کرے اور اس کو پینے اور دبانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس باب کو لاکر ایک موقع ایسا بھی بتلاتے ہیں جہاں شریعت کی طرف سے غصہ کو استعمال میں لانے کا حکم دیا گیا ہے شریعت کی طرف سے جو حدود مقرر ہیں اگر کوئی آدمی ان سے تجاوز کرنے لگے، شریعت کی رعایت نہ کرے، ان حدود کو توڑنے لگے۔ یا شریعت نے جن کاموں کی تعمیل کا حکم دیا ہے کوئی آدمی ان کی تعمیل نہ کرے؛ تو ایسے مواقع پر آدمی کو اپنے غصہ کا اظہار کرنا چاہیے۔

”والا ننتصار لدين الله تعالى“ اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے انتقام لینا۔ یعنی

دین کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہو تو آدمی کو چاہیے کہ اپنے غصہ اور ناراضگی کو استعمال کرتے ہوئے جو آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ زیادتی کا معاملہ کر رہا ہے اس سے بدلہ اور انتقام لے۔ اپنی ذات کے لیے انتقام اور بدلہ لینے کو پسند نہیں کیا گیا ہے، لیکن

اس مقصد کے لیے بدلہ لینے کا حکم ہے۔

شعائر اللہ کی عظمت رضاءِ الہی کا ذریعہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرْمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ حَبِيبٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ﴾ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا ہے، جو آدمی ان کا احترام کرے، ان کی عظمت اور ادب کو ملحوظ رکھے، تو یہ بات اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی اچھی ہے، درجات کی بلندی اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔

”حُرْمَات“ میں دین کی ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ بعض چیزیں تو وہ ہیں جو دین کا شعار اور علامت بتلائی گئی ہیں، جیسے بیت اللہ، کتاب اللہ، نبی اللہ؛ ان کے ساتھ اگر کوئی آدمی زیادتی کا معاملہ کرے، اور ان کے ادب و احترام کے خلاف کوئی حرکت کرے، ایسے موقع پر کوئی دوسرا آدمی ان کے ادب و احترام کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے غصہ کو استعمال کرے؛ تو شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿إِنْ نَنْصُرْهُ وَاللَّهُ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے (یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے اٹھو گے) تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمائے گا۔

لوگوں کو دین سے متنفر نہ کرے

۶۴۹- وعن أبي مسعود عقبة بن عمرو البدری رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءَ

رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: إِنِّي لَأَتَأْخُرُ عَنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ أَجْلِ فُلَانٍ هَيْبَا يُطِيلُ بِنَا! فَمَارَ أَيُّتُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم غَضِبَ فِي مَوْعِظَةٍ قَطُّ أَشَدَّ مِنَّا غَضَبَ يَوْمَئِذٍ؛ فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ مِنْكُمْ مُنْقَرِبِينَ، فَأَيُّكُمْ أَمَرَ النَّاسَ فَلْيُوجِزْ؛ فَإِنَّ

مِنْ وَرَائِهِ الْكَبِيرَ وَالصَّغِيرَ وَذَا الْحَاجَةِ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو بدری انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ فلاں آدمی کی وجہ سے میں فجر کی نماز میں غیر حاضر رہتا ہوں، اس لیے کہ وہ بہت لمبی قراءت کرتا ہے (یہ بات سن کر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو نصیحت فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں کہ) کسی نصیحت و وعظ میں نبی کریم ﷺ کو اتنا زیادہ غضبناک اور غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا جتنا اس روز دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو لوگوں کے دلوں میں دین کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں، اس لیے تم میں سے کوئی آدمی جب امامت کرے تو مختصر نماز پڑھائے، اور ایسا اس لیے کرے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے بوڑھے بھی ہوتے ہیں، بچے بھی ہوتے ہیں اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔

نماز کی مسنون قراءت

افادات:- ایک بات ذہن نشین رہے کہ ایسی لمبی قراءت ممنوع ہے جو شریعت کی مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہو۔ کون سی نماز میں کتنی مقدار قراءت کرنی چاہیے کتنی آیتیں ہونی چاہئیں، کون سی سورتیں پڑھنی چاہئیں؛ یہ سب احادیث سے ثابت ہے، اور فقہاء نے ان کو واضح کر کے کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ قرآن کی سورتوں کا ایک حصہ ہے جس کا نام ”مفصلات“ ہے۔ ”سورہ حجرات“ سے لے کر ”سورہ ناس“ تک جتنی سورتیں ہیں ان تمام کو ”مفصلات“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان میں جتنی سورتیں لمبی ہیں ان کو ”طوال مفصل“ کہتے ہیں، اور وہ ”سورہ حجرات“ سے ”سورہ بروج“ تک ہیں۔ اور جو سورتیں درمیانی درجہ کی ہیں ان کو ”اوساط مفصل“ کہا جاتا ہے، وہ ”سورہ

بروج“ سے ”سورہ لم یکن الذین کفروا“ تک ہیں۔ اور جو سورتیں چھوٹی ہیں ان کو ”قصارِ مفصل“ کہا جاتا ہے، وہ ”سورہ لم یکن الذین کفروا“ سے ”سورہ والناس“ تک ہیں۔ اور کون سی نماز میں کون سی سورہ پڑھی جائے؟ تو فقہاء نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ فجر اور ظہر میں ”طوالِ مفصل“ میں سے پڑھنا سنت ہے۔ عصر و عشاء میں ”اوساطِ مفصل“ میں سے پڑھی جائے۔ اور مغرب میں ”قصارِ مفصل“ میں سے پڑھی جائے۔ اب کوئی آدمی طبیعت کی سستی و کاہلی اور دین کے ساتھ بے رغبتی کی وجہ سے مسنون قراءت کو بھی اپنے لیے لمبا سمجھتا ہو تو یہ اس کی کوتاہی سمجھی جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے حدود بتلائے ہیں۔

احادیث کا غلط استعمال نہ کریں

بعض لوگ ایسی روایتیں سن کر ان کو غلط جگہ چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی امام حدود کی رعایت کرتے ہوئے قراءت کرتا ہے تو اس کے پاس جا کر یہ حدیث سنائیں گے کہ دیکھو! حدیث میں یہ آیا ہے، اور مطلب اپنی طرف سے نکالیں گے۔ اس لیے میں نے وضاحت کر دی۔

”إِنَّ مِنْكُمْ مَنَّفَةً رِّينَ“ شریعت نے دین کے تمام امور کے لیے حدود مقرر کئے ہیں اور ہر کام کے متعلق پوری تفصیل بتائی ہے۔ کونسی نماز کون سے وقت میں کس طریقہ سے پڑھی جائے اس کی تفصیل بتلا دی ہے۔ کونسا کام کس درجہ کا ہے اور کون سے کام کی فضیلت کتنی ہے۔ اور موقع و محل کے اعتبار سے کس کام کی فضیلت بڑھ جاتی ہے۔ کسی کام کی فضیلت آج کم ہے لیکن دوسرے موقع پر اسی کام کی فضیلت زیادہ ہو جائے گی۔ جو آدمی پوری شریعت سے واقف ہوتا ہے، قرآن و حدیث کی ساری تعلیمات اس کے

سامنے ہوتی ہیں، قرآن وحدیث سے جو چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جن کو فقہاء نے کتابوں میں وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے، وہ ساری باتیں اس کے پیش نظر ہیں، وہ سارے حدود کو اچھے طریقہ سے سمجھتا ہے کہ کس موقع پر کس چیز کی رعایت ہونی چاہیے۔

جب مستحب چیز بدعت بنتی ہے

اب کچھ لوگ شریعت کی مقرر کردہ حدود کی رعایت نہیں کرتے، جس چیز کو شریعت نے جو مقام دیا ہے، اس چیز کو اس سے آگے بڑھا، یا گھٹا دیتے ہیں۔ بعض لوگ اعتقادی طور پر ایسا کرتے ہیں، تو کچھ لوگ عملی طور پر ایسا کرتے ہیں۔ ایک چیز اپنی جگہ پر صحیح اور پسندیدہ ہوتی ہے لیکن لوگ اس کو اس کے درجہ سے بڑھا دیتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ ایک چیز مستحب ہے، لیکن لوگ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے لگے کہ اس کو واجب کا درجہ دیدیا، اس کو اتنی اہمیت دیدی گئی کہ اگر کوئی آدمی وہ کام نہیں کرتا تو طعن و تشنیع کی جاتی ہے، اس پر اعتراضات و تنقید کی جاتی ہے، تو اس صورت میں مستحب ہونے کے باوجود اس کام سے روک دیا جائے گا، اب اس کو بدعت و حرام قرار دیا جائے گا؛ جب تک کہ اس کے متعلق ذہنیت ٹھیک نہ ہو جائے۔ گویا اعتقادی طور پر بھی شریعت نے ہر چیز کا مقام بتا دیا۔ لہذا عقیدہ کے اعتبار سے بھی اس کو اسی درجہ پر رکھیے، نہ بڑھائیے اور نہ گھٹائیے۔ جس چیز کا جو گریڈ (Grade) ہے، اس کو اس سے اوپر یا نیچے کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

عملی بے اعتدالی بھی صحیح نہیں

اور عمل کے لیے بھی شریعت نے حدود اور درجات بتائے ہیں، کوئی آدمی عملی طور پر آگے پیچھے کرنے لگے، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مثلاً شریعت نے کہا

کہ روزہ صبح صادق سے شروع ہو کر غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ اس لیے حکم یہ ہے کہ جب غروب آفتاب کا یقین ہو جائے، اور کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے، تو آپ روزہ افطار کرنے میں تاخیر نہ کیجئے، ورنہ گنہ گار ہوں گے۔ کیونکہ اب تاخیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے وقت سے زائد بھوکا رہنے کو آپ اچھا سمجھ رہے ہیں، حالانکہ شریعت نے تو عبادت اتنے ہی وقت کے لیے رکھی ہے، آپ اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں؛ اس کی اجازت نہیں ہے۔

ادھر سحری کے لیے حکم یہ ہے کہ اس میں جتنی تاخیر کرو اتنا ہی اچھا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ دو روزے ایک ساتھ رکھوں تو اس کی اجازت نہیں۔ مثلاً آج صبح روزہ رکھا، شام کو روزہ نہیں کھولا، رات میں بھی نہیں کھایا، نہ سحری کی؛ اور دوسرے دن کاروزہ بھی ساتھ میں ملا لیا، اس طرح دو دن کے روزے لگا تار رکھ لیے، بیچ میں کھانا پانی کچھ نہیں کیا؛ جس کو شریعت کی اصطلاح میں صوم وصال کہتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ اس طرح روزے رکھتے تھے، جب صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی اس طرح روزے رکھنا شروع کر دیا۔ حضور ﷺ کو پتہ چلا تو فرمایا کہ دیکھو! مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی قوت دی جاتی ہے جس سے میں اس کو برداشت کر سکتا ہوں، تم اس طرح روزے مت رکھو۔ آپ نے ان کو حرام ہونے کی وجہ سے نہیں روکا تھا، بلکہ ان کی حالت پر شفقت کرتے ہوئے منع کیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ رمضان کے آخر میں یہ صورت پیش آئی تھی۔ دو دن ہوئے تھے اور چاند نظر آ گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر آج آنتیس کا چاند نہ ہوتا تو میں ایک روزہ ملا لیتا، پھر دیکھتا کہ کتنے لوگ میرا ساتھ دیتے ہیں۔

(بخاری: باب النَّكِيْلِ لِمَنْ أَكْفَرَ الْوِصَالَ)

قانون کو ہاتھ میں نہ لیں

تو شریعت نے ہر جگہ، ہر چیز میں اور ہر کام میں اتنی وضاحت کر دی ہے کہ ہر کام کا ایک مقام و درجہ متعین کر دیا، اور عمل کی شکلیں بتلا دیں۔ بدعت کو حرام اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس شکل کو آدمی اپنی طرف سے متعین کرتا ہے۔ حالاں کہ وہ کام نیکی کے مشابہ ہے، لیکن شریعت نے وہ طریقہ نہیں بتلایا ہے۔ گویا بدعتی شریعت اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے، اسی لیے اس کی اجازت نہیں ہے، اور اس کو حرام اور بڑا سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کہے کہ یہ کرنا ہے تو وہ عبادت ہے۔ اور جہاں منع کرے کہ نہیں کرنا ہے تو وہ گناہ ہے۔ نماز جیسی نماز کے معاملہ میں دیکھئے، شریعت نے کہا کہ سورج جب طلوع ہو رہا ہو اس وقت مت پڑھو، اگر پڑھو گے تو گنہ گار ہو گے۔ روزہ ہی کو لیجئے اگر کوئی عید کے روز رکھے تو حرام کا ارتکاب کیا۔ اسی کو شریعت کے حدود کہا جاتا ہے

اجتماعی کاموں کا ایک سنہرا اصول

اس نصیحت میں حضور اکرم ﷺ نے گویا یہی بتلایا کہ شریعت نے جو طریقہ بتلایا آپ جوش میں آکر اس سے آگے بڑھنے جائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کام آپ تو جوش میں کر لیں گے، لیکن ہر آدمی آپ کے جوش کا ساتھ دے یہ ضروری نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے لوگ آپ سے کٹ جائیں گے، اسی کو تعبیر کیا "إِنَّ مِنْكُمْ مُنْفَرِينَ"۔ تم میں سے بعض لوگ ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ لوگ دین سے کٹ جاتے ہیں، ان کے دلوں میں دین کے اس کام کی طرف سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے تم مسیوں سے کوئی آدمی جب امامت کرے، تو مختصر نماز پڑھائے (اور مختصر کی تفصیل میں بتلا چکا

ہوں) ایسا اس لیے کرے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے بوڑھے بھی ہیں، بچے بھی ہیں اور ضرورت مند بھی ہیں۔ اب اگر کوئی یوں کہے کہ سب مقتدیوں نے مل کر اجازت دی ہے کہ آپ لمبی نماز پڑھائیے تو؟ جواب یہ ہے کہ تب بھی منع کریں گے، اس لیے کہ آپ کے نماز شروع کرنے کے بعد کوئی ضرورت مند آ گیا تو اس کو تو یہ بات معلوم نہیں ہے، اس لیے وہ پریشان ہوگا۔

اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ نماز کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے مثلاً: اس مسجد کے بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ عشاء کی نماز ۹-۰۰ بجے شروع ہوگی۔ اگر آپ کو اس وقت سے آگے پیچھے کرنا ہے، تو بورڈ پر یہ وقت مت لکھئے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک آدمی ایسا ہے جس کو ۳۰-۹ بجے کی بس میں سوار ہونا ہے، اس نے بورڈ پر دیکھا کہ یہاں ۹-۰۰ بجے کی نماز ہے، دس منٹ میں جماعت ہو جائے گی، اس لیے میں جماعت سے نماز پڑھ کر آرام سے بس پکڑ لوں گا، یہ سوچ کر وہ مسجد میں آیا، لیکن مسجد میں کوئی پروگرام ہو رہا تھا، اس لیے نماز بجائے ۹-۰۰ کے ۹-۱۵ بجے شروع ہوئی، اب اس کی توساری گنتی فیل ہوگئی، اس کا جی نماز میں کیسے لگے گا؟ اس لیے جتنے بھی اجتماعی کام ہوتے ہیں، ان میں ان ساری چیزوں کی رعایت کی جانی چاہئے؛ کیوں کہ اس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز کے دوران اگر کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تھے، تو نماز کو مختصر کر دیتے تھے کہ اس کی ماں کا جی بچے میں اٹکا ہوا رہے گا (بخاری شریف: باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي) اُس زمانہ میں عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی تھیں۔

بہر حال! یہاں شریعت کی مقرر کردہ حدود سے جو تجاوز ہو رہا تھا، ان حدود کو

برقرار رکھنے کے لیے حضور اکرم ﷺ ناراض ہوئے۔ اگرچہ لمبی نماز دیکھنے کے اعتبار سے کام کی اچھی شکل معلوم ہو رہی تھی، لیکن حضور اکرم ﷺ ٹوک رہے ہیں کہ یہی چیز آگے جا کر لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب بنے گی، اس لیے اسی وقت تنبیہ فرمائی کہ دین کے مقرر کئے ہوئے حدود کو توڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا غصہ

۶۵۰:- وعن عائشة رضي الله عنها قالت: قدِمَ رسولُ الله ﷺ من سفرٍ، وقد سَتَرْتُ سَهْوَةً لِي بِقَرَامٍ فِيهِ تَمَائِيلٌ، فَلَمَّا رَأَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَتَكَةً وَتَكْوَنَ وَجْهَهُ، وَقَالَ: يَا عَائِشَةُ! أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا عَبْدًا لَدَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الَّذِينَ يُضَاهَوْنَ بَخْلِقِ اللَّهِ.

((السَّهْوَةُ)): كَالضَّفَّةِ تَكُونُ بَيْنَ يَدَيِ الْبَيْتِ. وَ((الْقَرَامُ)) بَكْسَرٍ-

القاف ستر رقیق، و((هتکہ)): أفسد الصورة التي فيه.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک سفر سے واپس

تشریف لائے، میں نے ایک باریک پردے کے ذریعہ جس پر کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طاقچہ کو ڈھانپ رکھا تھا (ان کو تصویر کی حرمت کا علم نہیں تھا) حضور اکرم ﷺ نے اس پردے کو دیکھا تو آپ کا چہرہ انور بدل گیا، آپ نے وہ پردہ پھاڑ دیا اور فرمایا: اے عائشہ! قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب والے وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کرنے کی صفت کی مماثلت و مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

افادات:- اللہ تعالیٰ نے تو ایسی صورت بنائی کہ اس میں جان بھی ڈال

دی، لیکن یہ صرف صورت بناتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی صفت خلق کی مشابہت اختیار کرنا

چاہتے ہیں، برابری کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ پوری پوری برابری نہیں کر سکتے۔ اسی لیے قیامت میں ان سے کہا جائے گا کہ تم نے جو تصویر بنائی تھی، اس میں حبان ڈالو۔ اللہ تعالیٰ تو ایسی تصویر بناتے ہیں کہ اس میں جان بھی ڈالتے ہیں، اب تم بھی جان ڈالو، اور وہ جان ڈال نہیں سکیں گے (آخر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے)

باب کا جو عنوان قائم کیا تھا اس میں یہ بھی تھا: "والاننتصار لدين الله تعالى". اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے انتقام اور بدلہ لینا۔ تو دیکھو! ایک غلط چیز ہوئی، اس کو روکنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے عملی اقدام بھی کیا اور آئندہ کے واسطے غصے کے ساتھ تنبیہ بھی کر دی۔

حدود اللہ میں رواداری نہیں

۶۵۱:- وعنها أن قريشاً أتهمهم شأن المرأة المخزومية التي سرقت، فقالوا من يكلم فيها رسول الله ﷺ؟ فقالوا: من يجترء عليه إلا أسامة بن زيد حب رسول الله ﷺ؟ فكلمه أسامة. فقال رسول الله ﷺ: أتشفع في حد من حدود الله تعالى؟ ثم قام فاختطب، ثم قال: إثمنا أهلك من قبلكم أتهمم كانوا إذا سرق فيهم الشريفة تركوه، وإذا سرق فيهم الضعيف أقاموا عليه الحد. وإيم الله! لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کو قبیلہ مخزوم کی عورت کے معاملہ نے بہت فکر میں ڈال دیا جس نے چوری کی تھی۔ لوگوں نے آپس میں کہا کہ اس بارے میں اللہ کے رسول سے کون بات کرے؟ لوگوں نے طے کیا کہ اسامہ بن زید۔ جو حضور ﷺ کے محبوب ہیں۔ ہی بات کر سکتے ہیں۔ خیر! حضرت اسامہ نے اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے بات کی، تو نبی کریم ﷺ نے ناراضگی سے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کو معاف

کرانے کے معاملہ میں تم میرے پاس سفارش لے کر آئے ہو؟ پھر آپ ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: تم سے پہلی امتیں اس لیے ہلاک اور برباد ہوئیں کہ ان میں کا کوئی شریف (یعنی بڑے گھرانے کا) آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے (چشم پوشی سے کام لیتے تھے اور درگزر کر دیتے تھے) اور کوئی کمزور (چھوٹے گھرانے کا) آدمی چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے (پھر حضور ﷺ نے فرمایا) اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد رضی اللہ عنہا (اعاذھا اللہ منھا) نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔

افادات:- یہ واقعہ ۸ھ فتح مکہ کے موقع پر پیش آیا تھا۔ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت جس کا نام فاطمہ مخزومیہ رضی اللہ عنہا تھا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی چیزیں عاریتاً لے کر مگر جاتی تھیں، اور کبھی کبھار کوئی چیز چُرا بھی لیا کرتی تھیں۔ اب چوری میں پکڑی گئیں، اور وہ ثابت ہو گئی (اور چوری والے جرم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا مقرر کی گئی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے) سب کو یقین ہو گیا کہ ان کا ہاتھ کاٹا جائے گا (اس لیے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزا۔ حد۔ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا مقرر کی جاتی ہے، اس کو عربی زبان میں ”حَدُّ“ کہتے ہیں۔) تو سب کو فکر لاحق ہوا کہ یہ عورت قریش کے بڑے خاندان مخزوم کی ہے، اور یہ خاندان بڑا باعزت سمجھا جاتا تھا، اگر اس کا ہاتھ کٹے گا تو پورے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ لوگ آپس میں مشورہ کے لیے بیٹھے اور یہ بات زیر بحث آئی کہ حضور ﷺ کے پاس جا کر کوئی آدمی سفارش کرے کہ اس عورت کو سزا نہ دی جائے، چھوڑ دیا جائے اور اس کا ہاتھ کٹنے سے بچ جائے، لیکن حضور ﷺ سے جا کر کہے کون؟ سب لوگ اس بات پر متفق ہوئے کہ یہ جرأت حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ہی کر سکتے ہیں جو نبی کریم ﷺ کے لاڈلے ہیں۔ ان کا لقب ہی حبُّ رسول اللہ تھا۔ ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

تھے جو غلاموں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں، اور حضور اکرم ﷺ نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا، اور لوگ ان کو زید بن محمد کے نام سے پکارتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ کوئی آدمی کسی کو منہ بولا بیٹا بنالے تو اسی کی طرف اس کی نسبت کرتے اور اسی کا بیٹا کہتے تھے، لیکن بعد میں قرآن پاک میں اس پر ممانعت آگئی پھر زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔

تو نے خرید کر مجھے انمول کر دیا

بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ یہ ایک مرتبہ کسی قافلے میں جا رہے تھے، اس قافلہ پر کسی قبیلے نے شب خون مارا (اس زمانہ میں عموماً لوگ قافلہ کی شکل میں چلتے تھے اس میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے تھے۔ حملہ کی صورت میں عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر غلام باندی بنا لیتے، پھر ان کو بیچ دیتے تھے) یہ پکڑے گئے اور ان کو مکہ مکرمہ لا کر بیچا گیا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں آئے۔ انہوں حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کیا۔ جب ان کے والد کو معلوم ہوا کہ قافلہ لوٹا گیا، میرا بیٹا پکڑا گیا اور اب پتہ نہیں وہ کہاں ہے، وہ بیٹے کی محبت میں بڑے پریشان تھے، ہر آنے جانے والے سے پوچھتے تھے کہ میرے بیٹے کو کہیں دیکھو تو بتانا۔

یہ مکہ مکرمہ ہی میں تھے اور بیت اللہ کی زیارت کے لیے ان کے علاقہ کے کچھ لوگ آئے، کسی نے ان کو دیکھ لیا، ان کے والد کو جا کر اطلاع دی کہ تمہارے بیٹے کو ہم نے وہاں دیکھا ہے۔ ان کے والد اور بیچا دونوں مکہ مکرمہ اپنے بیٹے کو لینے کے واسطے آئے، تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کے پاس ہے۔ یہ دونوں خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ آپ کی سخاوت بڑی مشہور ہے، آپ جو قیمت چاہیں، ہم ادا

کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ ہمارے بیٹے کو ہمارے حوالہ کیجئے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسی سے پوچھ لو، اگر وہ آنے کو تیار ہو تو ویسے ہی لے جاؤ، اور اگر وہ انکار کرے تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ خیر! ان کو بلایا اور پوچھا کہ ان دونوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! یہ میرے ابا، اور یہ چچا ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں، میری طرف سے اختیار ہے، اگر ان کے ساتھ جانا چاہو تو جاؤ، اور میرے پاس رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں تو آپ کے پاس ہی رہوں گا۔ ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے والد اور چچا کو بڑا تعجب ہوا، ان سے کہا: غلامی کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو؟ دونوں نے بہت اصرار کیا، منایا اور سمجھایا، لیکن وہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے یہ اعلان فرمایا: تم گواہ رہو کہ میں ان کو اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ اس طرح یہ حضور ﷺ کے محبوب بنے۔ انہی کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید ہیں، یہ بھی حضور کے بڑے لاڈ لے تھے اور انہی کا لقب حب رسول اللہ تھا۔

روایتوں میں آتا ہے حضور اکرم ﷺ اپنی ایک ران پر حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بٹھاتے تھے، دوسری ران پر حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بٹھاتے تھے اور دعا فرماتے تھے کہ: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے، اس سے بھی محبت فرما۔ (سیر اعلام النبلاء)

خیر! لوگوں نے کہا کہ حضور ﷺ سے سفارش تو یہی کر سکتے ہیں، ایسے موقعوں پر ایسے ہی لوگوں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ لوگوں نے ان سے کہا اور بڑے لوگوں کے کہنے کی وجہ سے وہ بھی آمادہ ہو گئے، حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ اب وہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ کتنی اہم چیز ہے، نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی سزا کے

معاملہ میں سفارش چل نہیں سکتی، اس لیے انہوں نے گفت گو کی، ان کی بات سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: "أَشْفَعُ فِي حَدِّ مَنْ حُدَّ لِلَّهِ تَعَالَى؟" اے اسامہ! تم اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کو معاف کرانے کے معاملہ میں میرے پاس سفارش لے کر آئے ہو؟ پھر آپ ﷺ نے ایک تقریر فرمائی کہ تم سے پہلی امتیں اسی لیے ہلاک اور برباد ہوئیں کہ ان میں کا کوئی شریف یعنی بڑے گھرانے کا آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے چشم پوشی سے کام لیتے تھے، درگزر کر دیتے تھے۔ اور کوئی کمزور اور چھوٹے گھرانے کا آدمی چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد رضی اللہ عنہا (اعاذھا اللہ منھا) چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹتا۔

یہاں پر حضور اکرم ﷺ نے جو غصہ کا اظہار فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی ایک حد کو قائم رکھنے کے لیے فرمایا۔ اور ایسی چیزوں میں نہ کوئی سفارش مقبول کی جاتی ہے، اور نہ رواداری برتی جاتی ہے۔

قبلہ کی طرف تھوکنے پر حضور ﷺ کی ناراضگی

۶۵۲:- وعن أنس رضي الله عنه: أن النبي ﷺ رأى نُحَامَةً فِي الْقِبْلَةِ، فَشَقَّ ذَلِكَ عَلَيْهِ حَتَّى رُوِيَ فِي وَجْهِهِ، فَقَامَ فَحَكَّهُ بِبِيَدِهِ، فَقَالَ: إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ فِي صَلَاتِهِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ، وَإِنَّ رَبَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، فَلَا يُبْزُقَنَّ أَحَدُكُمْ قِبَلَ الْقِبْلَةِ، وَلَكِنْ عَنِ يَسَارِهِ، أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ، ثُمَّ أَخَذَ طَرَفَ رِذَائِهِ فَبَصَقَ فِيهِ، ثُمَّ رَدَّ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ، فَقَالَ: أَوْ يُفْعَلْ هَكَذَا. (متفق عليه)

وَالأمرُ بِالْبُصَاقِ عَنِ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ هُوَ فِيمَا إِذَا كَانَ فِي غَيْرِ

المسجدِ، فَأَمَّا فِي الْمَسْجِدِ فَلَا يُبْصِقُ إِلَّا فِي تَوْبِهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قبلہ کی دیوار کے اندر بلغم کا اثر دیکھا، یہ چیز نبی کریم ﷺ کو بڑی شاق اور گراں گزری، یہاں تک کہ اس کا اثر آپ کے چہرہ انور میں محسوس کیا جانے لگا۔ پھر نبی کریم ﷺ اٹھے اور اپنے دست مبارک سے کھرچ کر اس کو صاف کیا اور فرمایا: آدمی جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے، اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ گویا اس کے بالکل سامنے ہوتا ہے (قبلة، فعلیۃ کے وزن پر ہے۔ عربی زبان میں چہرے کے سامنے کی حالت کو قبلہ کہتے ہیں۔ آدمی کا چہرہ کسی مخصوص جہت کی طرف ہونا) اس لیے نماز کی حالت میں سامنے کی طرف نہ تھو کے (جیسے کوئی بڑا آدمی سامنے ہو اس کی طرف تھو کنا کتنی بڑی گستاخی کی بات سمجھی جاتی ہے) اور اگر اس حالت میں تھوکنے کی ضرورت پیش آئی تو بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے تھو کے، پھر آپ نے اپنی چادر کا کنارہ پکڑ کر اس میں تھوکا، ملا اور فرمایا: یا ایسا کرے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوکنے کی جو بات کہی گئی ہے وہ مسجد کے باہر کسی میدان اور صحن وغیرہ کا حکم ہے، لیکن اگر مسجد میں ہو اور تھوکنے کی ضرورت پیش آجائے تو پھر ایک ہی شکل رہ جاتی ہے کہ اپنے کپڑے میں تھوک لے۔

افادات:- اس روایت سے معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں تھوکنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے شریعت نے ایک حد مقرر کی ہے اور اس کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔ جس آدمی نے اس کے خلاف کیا اور قبلہ کی طرف تھوکا تو اس پر نبی کریم ﷺ نے اپنی سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جہاں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو، وہاں آدمی کو اپنی ناراضگی ظاہر کرنی چاہیے، تاکہ آئندہ ایسی نوبت نہ آئے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھا رہا تھا، دورانِ نماز اس نے قبلہ کی جانب تھوکا۔ بعد میں نبی کریم ﷺ نے لوگوں سے کہا: آئندہ یہ آدمی تمہیں نماز نہ پڑھائے۔ چنانچہ دوسرے وقت وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا تو لوگوں نے روک دیا کہ ہم تمہاری اقتداء نہیں کریں گے۔ پوچھا: کیوں؟ سب نے کہا کہ نبی کریم ﷺ منع فرمایا ہے۔ تو وہ آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! میں نے منع کیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم نے نماز کی حالت میں قبلہ کی طرف تھوک کر اللہ اور اس کے رسول کو اذیت و تکلیف پہنچائی ہے (ابوداؤد شریف، باب فی کراہیۃ البراق فی المسجد، حدیث نمبر: ۴۸۱) اس لیے تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں امامت کی اجازت دی جائے۔

معلوم ہوا کہ شریعت کے خلاف کوئی بات ہوئی ہو تو اس موقع پر آدمی کو اپنی ناراضگی اور ناگواری کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ آئندہ یہ سلسلہ جاری نہ رہے اور شریعت کے حدود پامال نہ ہوں۔